بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

جنوری 2019

سالِ نو مبارک

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

حسن شاعری

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) — 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ — 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا — 7000 روپے
subecriptions@khawateendigest.com

مستقل سلسلے

جنوری 2019
جلد 33 شمارہ 5
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔
رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - [redacted]
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار

پہلی شمع

نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

وقت اپنے ساتھ سب کچھ بہائے لیے جاتا ہے۔ دکھ، سکھ، خوشی غم، رنج و الم، سانحے، حادثے، پر لگتے لمحے کے ساتھ ماضی کا حصہ بنتے جاتے ہیں۔ زندگی اس کے سوا اور ہے بھی کیا؟ اور سچ پوچھیں تو زندگی نام بھی اسی کا ہے۔ کوئی بادشاہ ہو یا فقیر۔ امیر ہو یا غریب۔ کوئی کتنا ہی ذہین و فطین ہو، حسن و جمال سے مالا مال ہو، اقتدار و اختیار کے بلند ترین منصب پر ہو، اسے زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر ان ہی کیفیات سے گزرنا پڑتا ہے۔ عروج و زوال زندگی کا حصہ ہیں لازم و ملزوم ہے۔

ایک بار پھر نیا سال ہمارے سامنے ہے۔ شاعر نے تو کہا تھا نئے سال بتا تجھ میں نیا پن کیا ہے لیکن نئے سال میں نیا پن ہو یا نہ ہو، یہ ہمارے ذہنوں پر دستک ضرور دیتا ہے۔ گزرتے وقت کا استعارہ، ہاتھ سے نکلتے وقت کا احساس دلاتا ہے۔ ہماری سوچ، فکر اور ذہنی کیفیت گزرتے وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ بہت سی باتیں جو ہمارے لیے بہت اہم ہوتی ہیں۔ وقت ان پر گرد ڈال کر آگے نکل جاتا ہے۔ ہمارے لیے وہ باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ہماری سوچ بدل جاتی ہے۔ زاویہ نظر میں تبدیلی آجاتی ہے۔ آئیے غور کریں کہ ہماری زندگی سے ایک اور سال رخصت ہو رہا ہے تو وہ ہمیں کیا دے کر جا رہا ہے۔ کیا ہماری سوچ میں پختگی آئی ہے۔ کیا وقت کے ساتھ ہم نے معاف کرنا سیکھ لیا ہے۔ کیا ہم اپنی ذات سے بلند ہو کر دوسروں کے لیے سوچنے لگے ہیں۔ کیا ہم نے اپنی غلطیوں سے سبق سیکھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یقین کریں گزرا سال ہمیں بہت کچھ دے گیا ہے۔

جب سے ہمارے ہاں اسلحے کی فراوانی ہوئی ہے یہ روایت بن گئی ہے کہ نئے سال کا استقبال فائرنگ کر کے کیا جاتا ہے۔ ہر سال جانے کتنے لوگ زخمی ہوتے ہیں یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ خوشی کے اظہار کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں، وہ خوشی کس کام کی جو کسی کے لیے زندگی بھر کے دکھ کا کارن بن جائے۔ ممکن ہو تو اپنے بچوں، بھائیوں کو اس جان لیوا حرکت سے ضرور روکیں۔

آپ سب کو نیا سال مبارک ہو، ہماری دعا ہے نیا سال آپ کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- آس پاس۔ نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- گمان سے یقین تک۔ معروف ریحان گیلانی کا مکمل ناول،
- محبت کی حدوں کو۔ کرن نوال کا مکمل ناول،
- نشا حسن علی اور عنبرین ولی کے ناولٹ،
- انشین نعیم، ثنا بشریٰ، زرقا سکندر اور سعدیہ عدف کے افسانے،
- نادیہ نجیب اور ڈاکٹر نجیب الرحمان شاہ کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- تجھ سے ناتا جوڑا ہے،
- گزرے سال کی بات۔ سال نو پر قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد

باری تعالیٰ

ہیں مصروف حمد و ثنا میں شجر و حجر
کریں ذکر تیرا برگ و ثمر

بہار چمن، بوٹے گل اور شمس کی روشنی
شاہد ہے تیرے ہونے کا نور قمر

یکتائی صفت ہے اک تیری ذات کی
نہ تو تولد ہوا، نہ کوئی ہے تیرا پسر

نہاں نہ رہ سکے میرے کچھ بھی عصیاں تجھ سے
میرے ہر عمل پہ ہے اے خدایا تیری نظر

نظام کائنات کیسے چلے تو ہی جانے
تہہ فرش سے بالائے عرش تک کی ہے تجھ کو خبر

کیونکر ہو سکے نور سے تیری صفت بیاں
تو خالق کون و مکاں، میں اک ناچیز بشر

زینب نور

سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سلام اس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

سلام اس پر کہ اسرار محبت جس نے سمجھائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

سلام اس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اس پر کہ جو زخمی ہوا بازار طائف میں

سلام اس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا
سلام اس پر کہ جو خود بدر کے میدان میں آیا

سلام اس پر فضا جس نے زمانے کی بدل ڈالی
سلام اس پر کہ جس نے کفر کی قوت کچل ڈالی

سلام اس پر کہ جس کا نام لے کر اس کے شیدائی
الٹ دیتے ہیں تخت قیصریت، تاج دارائی

سلام اس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالدؓ و حیدرؓ کے افسانے

درود اس پر کہ جس کا نام تسکین دل و جاں ہے
درود اس پر کہ جس کے خلق کی تفسیر قرآں ہے

ماہر القادری

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

مصیبت پر صبر کا بیان

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''میں نے کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سب سے سخت مصیبت کس پر آتی ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نبیوں پر، پھر جوان کے بعد سب سے افضل ہیں، پھر جوان کے بعد افضل ہیں۔ بندے پر اس کے دین کے مطابق آزمائش آتی ہے۔ اگر وہ اپنے دین (اور ایمان) میں مضبوط ہو تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔ اگر اس کا ایمان نرم ہو تو اس کے ایمان کے مطابق آزمائش آتی ہے۔ بندے پر آزمائش (اور مصیبت) آتی رہتی ہے حتیٰ کہ اسے ایسا کر کے چھوڑتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر رہا ہوتا ہے اور اس پر کوئی گناہ (باقی) نہیں ہوتا۔'' (نسائی)

فوائد و مسائل:

1- نیک صاحب ایمان پر دنیوی مشکلات کا آنا اس کے لیے درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

2- دنیا کی مصیبتیں مومن کے لیے نعمت ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔

3- مصیبت پر صبر ایمان کے کامل ہونے کی علامت ہے۔

4- انبیاء کرام علیہ السلام کے حالات کو پیش نظر رکھنے سے صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

بیماری

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار تھا۔ میں نے آپ کے جسم مبارک پر ہاتھ رکھا تو لحاف کے اوپر رکھے ہوئے میرے ہاتھ کو حرارت محسوس ہوئی۔ میں نے کہا۔

''اللہ کے رسول! آپ کو کتنا سخت بخار ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ہم (انبیاء) اسی طرح ہوتے ہیں کہ ہمیں مصیبت (یا آزمائش) بھی دگنی آتی ہے اور ثواب بھی دگنا ملتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اللہ کے رسول! سب سے زیادہ سخت آزمائش کن لوگوں کو آتی ہے؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''نبیوں کو۔''

میں نے پوچھا۔ ''ان کے بعد؟''

فرمایا: ''نیک لوگوں کو۔ انہیں فقر کے ذریعے سے آزمایا جاتا تھا حتیٰ کہ (بعض اوقات) ایک آدمی کو صرف ایک چادر میسر ہوتی تھی جسے وہ جسم پر لپیٹ لیتا تھا۔ اور وہ مصیبت پر اس طرح خوش ہوتے تھے جس طرح تم راحت پر خوش ہوتے ہو۔''

فوائد و مسائل:

1- بیماری کی شدت بھی آزمائش ہے۔ اس پر صبر کا ثواب بھی شدت کے مطابق زیادہ ہوتا ہے۔

2- فقر بھی آزمائش ہے۔ اس پر صبر اور شکر سے درجے بلند ہوتے ہیں۔

3- مشکل پر خوشی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ثواب ملتا ہے۔ مشکل ختم ہو جائے گی لیکن اس کا ثواب جنت میں ہمیشہ کی نعمتوں کا باعث ہوگا۔

ہدایت کی طرف بلانا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

''گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ کسی نبی کی حالت بیان فرما رہے ہیں۔''

''اسے اس کی قوم نے مارا، وہ اپنے چہرے سے خون صاف کرتے تھے اور کہتے تھے: میرے رب! میری قوم کو معاف کر دے، وہ جانتے نہیں۔''

فوائد و مسائل:

1- ہدایت کی طرف بلانے والوں کو مشکلات پیش آتی ہیں حتیٰ کہ انبیاء علیہ السلام بھی بہت سی تکلیفیں برداشت کرتے رہے ہیں۔

2- ممکن ہے اس حدیث میں ''کسی نبی'' سے مراد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور طائف کے واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہو۔ واللہ اعلم۔

یقین

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں جب انہوں نے فرمایا: ترجمہ: ''میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟'' (سورۃ البقرہ۔26)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''کیا تو ایمان نہیں لایا؟''

ابراہیم نے کہا: ''کیوں نہیں؟ لیکن (سوال اس لیے کیا ہے) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔'' اور اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے! وہ مضبوط سہارے کی پناہ لے رہے تھے۔ اور اگر میں قید میں اتنا عرصہ رہتا جتنا عرصہ حضرت یوسف علیہ السلام رہے تو میں بلانے والے کی بات مان لیتا۔''

فوائد و مسائل:

1- انبیائے کرام علیہ السلام کا ایمان سب سے کامل ہوتا ہے۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ انہیں ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرا دیتا ہے جو دوسروں کے لیے ''غیب'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مردوں کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کرنا چاہا تو یہ شک کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ ''علم الیقین'' سے ''عین الیقین'' کے درجے تک ترقی کریں۔

2- ''ہم زیادہ شک کرنے کا حق رکھتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مومن اس میں شک نہیں کرتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بدرجہ اولیٰ شک سے برتر ہیں۔ اس میں ابراہیم علیہ السلام کی عظمت کا اظہار ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد کی زندگی کا مشاہدہ کرا دیا۔

3- حضرت لوط علیہ السلام نے قوم سے کہا تھا کہ اگر میرا کوئی مضبوط دنیوی سہارا ہوتا تو تم مجھ سے حیا سوز مطالبہ نہ کرتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ پر اعتماد نہیں تھا بلکہ یہ قوم کی اخلاقی پستی کا اظہار ہے کہ اگر میرا مضبوط دنیوی سہارا موجود ہوتا تو تم ان افراد کے ڈر سے اس بدتمیزی کی جرأت نہ کرتے لیکن تم اللہ سے نہیں ڈرتے۔ میرا اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہے جو تمہیں انسانوں کی نسبت کہیں زیادہ سزا دے سکتا ہے۔

4- حضرت یوسف علیہ السلام کو اس لیے جیل جانا پڑا تھا کہ وہ ایک جرم کے ارتکاب سے انکار کر رہے تھے جس کا ان سے مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ جب حکمرانوں پر ان کا خلوص، سچائی اور ان کے کردار کی عظمت واضح ہوگئی اور انہیں ضرورت محسوس ہوئی کہ آپ جناب کی صلاحیتوں سے استفادہ کریں تو قاصد رہائی کا حکم نامہ لے کر جیل میں آیا۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت کردار کا ایک اور پہلو سامنے آیا کہ انہوں نے اس وقت تک جیل سے باہر آنے سے انکار کر دیا جب تک ان کی بے گناہی باقاعدہ ثابت نہ ہو جائے۔ اور مجرم (عزیز مصر کی بیوی) کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔

5-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کیفیت میرے ساتھ پیش آتی تو میں اس وقت جیل سے باہر آ جاتا اور اللہ کی رحمت سے امید رکھتا کہ وہ کسی اور انداز سے میری برات کا اظہار فرما دے گا۔ اس ارشاد کا مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کی استقامت اور ان کے صبر کی تعریف ہے۔

6-خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام تمام انبیائے کرام سے بلند و برتر ہے لیکن دوسرے انبیاء علیہ السلام کے کردار کے روشن پہلو بھی لائق تحسین ہیں۔ ان کی اہمیت و عظمت بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے۔

7-دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف بھی عظمت کردار کا ایک پہلو ہے۔ علمائے کرام کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی خوبیوں کو دل سے تسلیم کریں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے دوسروں کی عزت کریں اور ان سے محبت رکھیں۔ جس طرح ان کی غلطیوں پر تنقید کرتے ہیں، ان کے اچھے کاموں کی تعریف اور ان سے تعاون بھی کریں، خواہ متعلقہ فرد کا تعلق ان کی پارٹی، تنظیم، جماعت اور مسلک سے نہ ہو۔

اختیار

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنگ احد میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دانت شہید ہوا، چہرہ مبارک زخمی ہوا اور خون آپ کے چہرہ مبارک سے بہنے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم چہرہ مبارک سے خون پونچھتے تھے اور فرماتے تھے۔

''یہ قوم کیسے نجات پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون آلود کر دیا، جب کہ وہ ان کو اللہ کی طرف بلا رہا تھا؟''

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

''اے پیغمبر! آپ کے اختیار میں کچھ نہیں۔''

(اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول فرمائے اور چاہے تو انہیں عذاب دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔'') (آل عمران بت۔128)

فوائد و مسائل:

1-جہاد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت مومنوں کے لیے اسوہ حسنہ ہے۔

2-رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا افسوس کے طور پر تھا کہ انہوں نے اتنا بڑا جرم کیا ہے، کیا معلوم اس کی پاداش میں ان پر عذاب ہی آ جائے۔

3-اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ ان میں سے بعض کو ایمان نصیب ہو گا، بعض اپنے جرم کی سزا میں جہنم رسید ہوں گے۔

4-نبی مخلوق کے دلوں پر اختیار نہیں رکھتے نہ عذاب لانا یا روکنا ان کے اختیار میں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک دن جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت غمگین بیٹھے ہوئے تھے۔ مکہ کے بعض لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خشت زنی کر کے لہولہان کر دیا تھا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا۔

''کیا بات ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''ان لوگوں نے میرے ساتھ یہ یہ ظلم کیا ہے۔''

جبریل علیہ السلام نے فرمایا۔ ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو ایک نشانی دکھاؤں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''ہاں، دکھائیے۔''

انہوں نے وادی کی دوسری طرف ایک درخت کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اس درخت کو بلائیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درخت کو بلایا تو وہ چل کر آیا اور آپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

جبریل علیہ السلام نے کہا۔ ''اسے کہیے واپس چلا جائے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کہا تو وہ واپس ہو گیا حتیٰ کہ اپنی جگہ پر چلا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے کافی ہے۔'' (احمد)

فوائد و مسائل:

1-اب اقتدی کی روایت ہے۔ ممکن ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کسی بڑی عمر کے صحابی سے سنا ہو یا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنایا ہو۔

2-درخت کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے حرکت کرنا معجزہ ہے۔ یہ معجزہ دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے لیکن کچھ خاص حکمتوں کی وجہ سے یہ تکلیفیں برداشت کرنا ضروری ہے۔

3-اس کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی بھی تھا کہ اللہ کی ہر مخلوق آپ کے ساتھ اور آپ پر ایمان رکھنے والی ہے۔

آزمائش

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے وہ سب لوگ شمار کر دو جنہوں نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے۔''

ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کو ہمارے بارے میں خوف ہے جب کہ ہماری تعداد چھ اور سات سو کے درمیان ہے؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تمہیں نہیں معلوم، شاید تم پر آزمائش آ جائے۔''

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: پھر ہم پر آزمائش آ گئی حتیٰ کہ ہم چھپ چھپ کر نمازیں پڑھنے لگے۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1-مردم شماری کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ افرادی قوت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

2-صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ پر اس قدر توکل تھا کہ چھ سات سو کی تعداد ہوتے ہوئے خود کو ناقابل شکست سمجھتے تھے۔

2-زیادہ تعداد کے باوجود آزمائش آ سکتی ہے، اس لیے اللہ سے مدد مانگتے رہنا چاہیے اور آزمائش میں ثابت قدم رہنا چاہیے۔

زیادہ ثواب

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''زیادہ ثواب بڑی آزمائش کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو ان پر آزمائش ڈالتا ہے۔ جو راضی رہے، اسے رضا ملے گی، اور جو ناراض ہو، اسے ناراضی حاصل ہو گی۔''

فوائد و مسائل:

1-آزمائش میں بندے کا فائدہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ کے فیصلے پر راضی رہتے ہوئے شریعت کے دائرے میں رہ کر جدوجہد کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی مصیبت پر بندہ ناراضی کا اظہار کرے گا تو مصیبت تو اپنے مقررہ وقت ہی پر ختم ہو گی لیکن بندہ ثواب سے محروم ہو کر اللہ کو ناراض کرے گا۔

2-مصیبت بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، بشرطیکہ احکام کی نافرمانی نہ کی جائے۔

لوگوں سے تکلیف

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو مومن لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور ان سے ملنے والی تکلیف پر صبر کرتا ہے، وہ اس مومن سے زیادہ ثواب حاصل کر لیتا ہے جو لوگوں سے ملتا جلتا نہیں اور ان کی طرف سے آنے والی تکلیف پر صبر نہیں کرتا۔''

فوائد و مسائل:

1-لوگوں سے میل جول میں اچھے برے ہر قسم کے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے۔ برے آدمی کی برائی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے لیکن خود نیکی پر قائم رہنا چاہیے۔

2-معاشرے میں برائی زیادہ ہو جائے تب بھی سب سے الگ تھلگ ہو کر راہبوں کی طرح جنگلوں یا غاروں میں چلے جانا جائز نہیں بلکہ معاشرے میں رہ کر اصلاح کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

3-جب ایمان کو خطرہ ہو تب خلوت نشینی جائز ہے۔

تین خوبیاں

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تین خوبیاں جس میں ہوں، اسے ایمان کا لطف حاصل ہوتا ہے ــــ ایک روایت میں ہے: اسے ایمان کی مٹھاس حاصل ہو جاتی ہے۔

(پہلی خوبی) اور جب اسے اللہ نے کفر سے نجات دے دی ہو تو اسے دوبارہ کفر اختیار کرنے سے آگ میں ڈالا جانا زیادہ پسند ہو۔''

(دوسری) کسی شخص سے محبت اور دوستی رکھے تو محض اللہ کے لیے رکھے۔

(تیسری) اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت باقی سب کی محبت سے بڑھ کر ہو۔

فوائد و مسائل:

1- اللہ کے لیے محبت کا مطلب یہ ہے دوست سے محبت کی بنیاد، خاندان، قبیلہ، زبان، وطن یا دنیوی مفاد نہ ہو بلکہ کسی سے اس لیے محبت ہو کہ وہ اللہ کے احکام کی تعمیل کرنے والا نیک آدمی ہے۔

2- اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت زیادہ ہونے کی علامت یہ ہے کہ جب بیوی بچوں، ماں باپ، دوست احباب یا دنیوی مفادات کا تقاضا کسی شرعی حکم کے خلاف ورزی کا ہو تو ان سب کو نظر انداز کر کے ان کی ناراضی کی پروانہ کرتے ہوئے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مان لیا جائے۔

3- مومن کفر سے اور کافروں کے رسم و رواج سے نفرت کرتا ہے اور مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں سے محبت اور ان کی مدد نہیں کرتا کیونکہ کافروں کی طرف میلان میں خطرہ ہے کہ ایمان کمزور ہو کر آخر وہ مرحلہ آجائے جب ایمان بالکل ختم ہو جائے۔ اعاذنا اللہ منہ۔

اچھے لوگ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم اس طرح چن لیے جاؤ گے جس طرح نکمی اور ردی کھجوروں میں سے (عمدہ) کھجوریں چن (کر الگ) کی جاتی ہیں۔ اچھے لوگ (دنیا سے) چلے جائیں گے اور برے لوگ رہ جائیں گے، پس اگر تم سے ہو سکے تو مر جانا۔''

فائدہ:

نیک لوگ ہر دور میں رہیں گے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد کم ہوتی چلی جائے گی حتیٰ کہ جب قیامت آئے گی اس وقت کوئی نیک آدمی نہیں ہوگا۔

علامات قیامت کا بیان

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں۔''

اور آپ نے اپنی دونوں انگلیوں کو جمع فرمایا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اس لیے آپ کے بعد صرف قیامت ہی باقی ہے۔

2- یہ حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے منافی نہیں کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مبعوث ہوئے تھے۔ آسمان سے ان کا نزول اگرچہ بعد میں ہوگا لیکن اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی نبوت کے بجائے نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبلغ و داعی ہوں گے اور شریعت محمدیہ ہی کو نافذ و غالب فرمائیں گے۔

3- مسلمان کو چاہیے کہ روز بروز بڑھتے ہوئے فتنوں کے دور میں اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے اور جاہلیت کے عقائد و رسوم کو رائج کرنے والوں کے خلاف ہر ممکن کوشش کرے۔

قیامت

حضرت حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالائی کمرے سے جھانک کر ہمیں دیکھا جب کہ ہم قیامت کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا:

''قیامت نہیں آئے گی جب تک دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں: دجال، دھواں اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔''

☆

دستک دستک دستکہ

شاہین رشید

فائزہ حسن

''کیا حال ہے فائزہ؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''کہاں غائب ہو ــــ ڈراموں میں نظر نہیں آ رہیں؟''

''آپ کو غائب اس لیے نظر آ رہی ہوں کہ میں آج کل یو کے (U.K) میں ہوں۔ بلکہ اب تو میرا مستقل قیام ہی یو کے میں ہے۔''

''اچھا تو کیا انڈسٹری کو خیرباد کہہ دیا؟''

''ارے نہیں ــــ فلم ٹی وی دونوں چل رہے ہیں ــــ ''لوو ویڈنگ'' فلم تو آپ نے دیکھی ہی ہو گی اور ڈراموں کا یہ سلسلہ ہے کہ جب کوئی بلاتا ہے تو پاکستان آ جاتی ہوں۔''

''ٹی اے ڈی اے کے ساتھ؟''

''جی بالکل۔''

''پاکستان کے لیے دل اداس نہیں ہوتا کیا؟''

''کیوں نہیں ہوتا ــــ اپنا ملک ہے۔ بہت ٹائم گزارا ہے۔ ہماری پہچان ہمارا پاکستان ہے ــــ تو جب بہت دل اداس ہوتا ہے تو ایک چکر لگا لیتی ہوں پاکستان کا۔''

''پاکستان میں رہنے والی زیادہ تر خواتین اس بات سے بہت خوش ہوتی ہیں کہ یہاں ہر کام کے لیے ''ماسی'' مل جاتی ہے۔ وہاں تو ایسا نہیں ہے ــــ تو تم سارے کام خود کرتی ہو؟''

''اب تو وہاں بھی آسانی سے ''ماسی'' ٹائپ کی خواتین مل جاتی ہیں ــــ مگر پھر بھی میں تو اپنا کام خود ہی کرتی ہوں۔''

''کوکنگ بھی ــــ؟''

''اور نہیں تو کیا ــــ کوکنگ تو مجھے اس وقت سے آتی ہے جب میں میٹرک کی طالبہ تھی ــــ مجھے یاد ہے کہ میٹرک میں مجھے میری خالہ نے ایک کتاب دی تھی ''ذائقہ کا دسترخوان'' اس میں تراکیب دیکھ کر مجھے مزید شوق ہوا کوکنگ کا ــــ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ جنہیں کھانے کا شوق ہوتا ہے پھر انہیں پکانے کا بھی شوق ہوتا ہے تو ان تراکیب کو دیکھ کر میں نے کچھ مسالہ جات مختلف کمپنیوں کے منگوائے تھے ــــ اور ''اچار گوشت'' اور مرغ چنے بنائے تھے جو کہ بہت ہی اچھے بنے تھے۔''

''آپ کی امی تو بہت خوش ہوتی ہوں گی؟''

''بالکل ــــ امی بہت خوش ہوئیں ــــ ہماری امی کھانا بہت اچھا بناتی تھیں مگر وہی کھانے زیادہ اچھے بناتی تھیں جو کہ روزمرہ کے ہوتے ہیں ــــ روایتی خاندانی کھانے یا تراکیب دیکھ کر کھانا پکانے کا انہیں کوئی ایسا شوق نہیں تھا جیسا کہ مجھے تھا۔ جیسے کہ اگر ہم نے بریانی یا شامی کباب کی فرمائش کر دی تو امی نے کہا کہ یا تو بازار سے کھا لو یا پھر خود بنا لو ــــ بس تو پھر میں نے اپنے شوق سے خود ہی کھانا پکانا سیکھا بھی اور بنایا بھی۔''

''سسرال والے تو بڑے خوش ہوئے ہوں گے کہ اتنی سگھڑ بہو مل گئی؟''

''شادی سے پہلے ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ میں اور میری بہن ہم اپنے گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں ــــ ہم جب ذرا بڑی ہوئی تھیں تو ہمارے گھر میں کوئی نوکر نہیں تھا اور ہم اپنے گھر کا ہر کام خود کرتی تھیں۔ شاید ہماری امی ہمیں اگلے گھر کے لیے ٹرینڈ کر رہی تھیں ــــ لیکن جب میری شادی ہوئی تو

سسرال میں میرا واسطہ نوکروں سے پڑا...... مگر مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی تھی، نوکروں سے بات کرتے میں اور ان سے کام لیتے میں...... اور میں بالکل بھی خوش نہیں تھی...... مگر کیا کرتی مجبوری تھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب آپ بہت خوش ہوں گی؟"

"جی...... بہت خوش ہوں اور اپنے اس ماحول میں واپس آ گئی ہوں جہاں اپنا ہر کام خود کرنا ہوتا ہے۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے اپنا سارا کام خود کرنا۔"

"ہماری خواتین جب ملک سے باہر جاتی ہیں تو اور تو کسی کو مس کریں نہ کریں...... اپنی ماسیوں کو ضرور مس کرتی ہیں؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں...... اور میں بہت حیران ہوتی ہوں...... مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے ملک سے باہر رہتے ہوئے اور میں نے ایک دن بھی یاد نہیں کیا کہ ہائے میرے پاس نوکر نہیں ہیں۔ میں بہت خوش ہوں...... کیونکہ مجھے آزادی ہے...... پرائیویسی ہے میرا جب دل چاہتا ہے، میں کچھ نہ کچھ بنا لیتی ہوں۔ کھا لیتی ہوں۔ میں کسی کو جواب دہ نہیں ہوں...... اور ایسا نہیں ہے کہ باہر بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ باہر چیزیں مینج کرنا زیادہ آسان ہے...... میں نے پاکستان سے باہر زیادہ لوگوں کی دعوتیں کیں، کھانے پکائے مگر مجال ہے کہ مجھے کوئی مسئلہ ہوا ہو۔"

"چلو لائف کو انجوائے کرو...... ان شاء اللہ پھر بات کریں گے۔"

☆☆☆

عینی جعفری

"اس خوب صورت فنکارہ کو آپ آج کل ڈرامہ سیریل "تجدید وفا" میں دیکھ رہے ہیں بہت اچھا پرفارم کر رہی ہیں اور ان کی فلم "بالو ماہی" کافی مقبول ہوئی۔"

"کیا حال ہیں عینی صاحبہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"تجدید وفا" میں دیکھ رہی ہوں...... بہت پیاری لگ رہی ہو......"

"بہت شکریہ...... آپ کی محبت ہے۔"

"بالو ماہی" میں بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھیں...... کہیں پڑھا تھا کہ بالو ماہی کا کردار تمہاری زندگی کے قریب ہے...... ایسا ہے؟"

"جی...... جی۔ وہ کردار میری زندگی کے قریب تھا میں نے بھی اس فیلڈ میں آنے کے لیے بہت جدوجہد کی، گھر والے اجازت نہیں دیتے تھے، مگر میں اپنی نڈر طبیعت کی وجہ سے وہ ہی سب کچھ کرتی ہوں جو مجھے صحیح لگتا ہے...... اگر میرے ددھیال والے حیات ہوتے تو شاید میں کبھی بھی اس فیلڈ میں نہ آ سکتی کیونکہ انہیں پسند نہیں تھی یہ فیلڈ۔"

"خدشات ہوں گے؟"

"بالکل...... لیکن میں نے...... یہ ثابت کیا ہے کہ ہم اچھے ہیں تو فیلڈ اچھی ہے آپ عزت دے کے اور عزت لے کر بہت اچھا کام کر سکتے ہیں۔"

زیادہ تر لوگ اس فیلڈ کو برا سمجھتے ہیں...... ایسا ہے نا......"

"ہاں جی...... ایسا ہے...... لوگ ہمارے منہ پر ہماری تعریف کرتے ہیں۔ حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں...... مگر ہمارے پیچھے یعنی وہاں سے اٹھ جانے کے بعد ہماری برائیاں کرتے ہیں، میں نے اس دنیا میں زیادہ تر دو غلے لوگ ہی دیکھے ہیں...... بہر حال اچھے اور برے لوگ ہر شعبے میں ہوتے ہیں۔"

"آپ لندن میں رہتی ہیں...... کیا وہاں ہمارے ڈرامے پسند کیے جاتے ہیں؟"

"ہمارے ڈرامے پوری دنیا میں پسند کیے جاتے ہیں...... مجھے یاد ہے کہ "بالو ماہی" کی پروموشن کے لیے ہمیں سینٹرل لندن جانے کا موقع ملا تو جیسے ہی ہم وہاں پہنچے لوگوں نے ہمیں گھیر لیا...... کیونکہ انہوں نے ہمارے ڈرامے دیکھے ہوئے تھے۔ لوگ دوسرے شہروں سے بھی آئے تھے اور اتنے زیادہ لوگ ہو گئے تھے کہ ہمیں سیکورٹی کو بلانا پڑ گیا تھا۔"

"چلیے اجازت دیں پھر بات ہوگی آپ سے۔"

بندھن

فاطمہ نجیب ہمراہ ڈاکٹر نجیب الرحمان شاہ

شاہین رشید

خوب صورت خیالات کی خوب صورت شاعرہ فاطمہ نجیب کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ ڈراموں کے جو ٹائٹل سونگ سنتے ہیں وہ زیادہ تر فاطمہ نجیب کے ہی لکھے ہوئے ہوتے ہیں لوگ ڈراموں میں تو "محو" ہوتے ہی ہیں ساتھ ان کی شاعری میں بھی کھو جاتے ہیں...... آج کل آن ایئر ڈراموں میں "استانی جی، میں خیال ہوں کسی اور کا، حیرت، میرے خدایا" ٹی وی سے "سودائی" اور "ہارا دل" کے ٹائٹل سونگ فاطمہ نجیب کے ہی ہیں۔

"کیا حال ہیں؟ آج آپ ہمارے "بندھن" کی مہمان ہیں...... تو جناب ویلکم؟"

"جی...... اللہ کا شکر ہے...... اور بہت شکریہ مہمان نوازی کا۔"

"پہلے آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتایئے؟"

"میرا تعلق میانوالی کے قریب واقع شہر عیسیٰ خیل سے ہے۔ وہاں رہنے کا موقع نہیں ملا مجھے۔ لیکن میری پہچان میرے باپ دادا کا گاؤں عیسیٰ خیل ہی ہے زندگی زیادہ تر راولپنڈی میں گزری...... میرے میاں میرے فرسٹ کزن ہیں تو ان کا گاؤں بھی عیسیٰ خیل ہی ہے، وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں...... انہوں نے آرمی میڈیکل کالج راولپنڈی سے تعلیم حاصل کی...... پاکستان کے کافی شہروں میں پوسٹنگ گزارنے کے بعد اب ریٹائرمنٹ کے بعد ایچ آئی ٹی ٹیکسلا اسپتال میں ڈپٹی کمانڈنٹ ہیں۔ الحمدللہ"

"آپ دونوں کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا، بچے ماشاءاللہ سے کتنے ہیں؟"

"جی...... ہماری شادی کو تقریباً 33 سال ہو چکے ہیں اور ہمارے تین بچے ہیں، بڑی بیٹی "مریم" ہے پھر بیٹا ہے محمد حبیب اور پھر بیٹی ہے زینب نجیب...... مریم ہماری پہلی اولاد جس کی پیدائش سرگودھا میں ہوئی۔ ہم سب بے حد خوش تھے اور بھرپور خوشی کی تھی۔"

"سسرال میں کتنے فیملی ممبر ہیں اور کیا آپ بڑی بہو بن کے آئیں؟"

"میری تین نندیں اور ایک جیٹھ ہیں...... تو میں چھوٹی بہو بن کے آئی، بڑی بھابھی یعنی جیٹھانی "رفعت لطیف" بہت پیاری اور نفیس خاتون ہیں، زندگی کے نشیب و فراز میں وہ ہمیشہ رہنمائی رہیں اور قدم قدم پہ ساتھ رہیں، میں ان کی بہت شکر گزار بھی ہوں۔ وہ مجھے بہت عزیز ہیں...... میری ایک نند امریکہ میں، ایک کینیڈا میں اور ایک ملتان میں مقیم ہے اور ایک ملتان میں رہتی ہیں......

نجیب کے والدین بہت محنتی تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے اپنے آبائی شہر سے ہجرت کی...... نجیب کی والدہ یعنی میری پھوپھو خود بھی ٹیچر تھیں...... تو ان کی تربیت ایسی رہی کہ ماشاءاللہ ان کے سب بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اپنے بچوں پر بہت محنت کی۔"

"ایک ہی خاندان ہے...... ملنا جلنا تو رہتا ہی ہوگا۔ شادی کے بعد جوائنٹ فیملی میں رہیں یا علیحدہ؟"

"جی...... ایک ہی خاندان تھا...... تو ظاہر ہے کہ ملنا جلنا رہتا تھا۔ تو جانے کب، کہاں کیسے...... یہ ملاقات ہو گئی...... میں ان سے...... جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہو گئی کب ان کے دل میں اتر گئی۔ کچھ نہیں معلوم...... نئی گھر میں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا...... مگر نجیب چونکہ "آرمی" میں تھے تو جہاں جہاں پوسٹنگ رہی۔ میں ان کے ساتھ رہی، ان کے والدین ہمارے پاس آجایا کرتے تھے اور عید تہواروں میں ہم ان کے پاس چلے جایا کرتے تھے۔"

"گزرے وقت کی شادیوں میں اور آج کل کی شادیوں میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟"

"گزرے وقت کی شادیوں میں اور آج کل کی شادیوں میں بہت واضح فرق آچکا ہے...... پہلے گھروں میں رونقیں ہوا کرتی تھیں...... کافی دن پہلے رشتے داروں کے آنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا...... محبتیں تھیں، لحاظ تھا، برکتیں تھیں۔ رکھ رکھاؤ تھا، اب ہر کام عجلت میں ہو رہا ہے، لگتا ہے کہ سب لوگ بہت جلدی کی میں ہیں...... آسائشیں بہت ہو گئی ہیں، لیکن محبتیں کم ہو گئی ہیں۔"

"نکاح الگ الگ جگہوں پر ہوا تھا یا ایک ہی جگہ پہ؟ اور رسم و رواج ہوئے تھے؟"

"جی نکاح الگ الگ ہوئے تھے اور رسم و رواج بھی اس دور کے مطابق سادہ سے ہی تھے...... پھر گھر کی ہی بات تھی...... اس لیے سارے معاملات سادگی سے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچے۔"

"نکاح اور رخصتی کے وقت کیا کیفیت تھی؟"

"نکاح اور رخصتی کے وقت وہی کیفیت تھی جو اپنے والدین سے جدا ہوتے ہوئے ہر لڑکی کی ہوتی ہے۔ اپنے والد کی صورت نگاہوں میں پل پل رہی اور ابھی تک ہے ویسے تو ہر باپ کو بیٹی سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن میرے والد کو مجھ سے اپنی ساری اولاد سے زیادہ محبت تھی...... اور...... شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں بچپن میں بہت بیمار رہتی تھی اور میری امی میری عیادت کے لیے آئے ہوئے مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہوتی تھیں۔ میں اپنے ابی کے پاس ہی ہوتی تھی اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے چلے گئے۔ اگر میں اس ٹاپک پہ بات کرنے لگوں تو پوری ایک کتاب بن جائے۔ اس لیے بات یہیں پہ ختم کرتی ہوں ورنہ اپنے ساتھ ساتھ آپ کو بھی رلا دوں گی۔"

"زندگی میں نشیب و فراز آئے؟"

"نشیب و فراز زندگی کا حصہ ہیں...... لوگ اور



ان کے رویے بھی کیسے تو بھی کیسے، مگر میری امی کہا کرتی تھیں کہ "با ادب با مراد" تو بس ان کی یہ بات پلے باندھ لی، کبھی کسی بڑے کو پلٹ کر جواب نہیں دیا، ہمیشہ خاموشی اختیار کی...... بہت دل گھبرایا تو اللہ پاک کے بعد کاغذ قلم کا سہارا لیا اور لکھ کر دل کو بہلا لیا...... مگر کبھی تہذیب و تمیز کا دامن نہیں چھوڑا...... اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا اور بے شک وہ بہترین جزا دینے والا ہے۔"

"صبر کا مادہ نہ ہونے کی وجہ سے کیا طلاق کا رجحان جنم لے رہا ہے۔ ورنہ گھر میں تو اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے؟"

"جی...... بالکل...... اب برداشت اور صبر کا مادہ بہت کم ہو گیا ہے۔ کوئی بھی کسی کی بات کو برداشت نہیں کرتا...... رشتوں کا تقدس اور احترام بھی کم ہو گیا ہے۔ "کرب اور درد" کو سہے بغیر تو منزلیں نہیں ملا کرتیں...... صبر و تحمل سے ناپسندیدہ صورت حال کو سہنا اور رشتوں کو ساتھ لے کر آگے بڑھتے جانا ہی زندگی ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... گزرے زمانے میں دلہن کا بیوٹی پارلر میں تیار ہونے کا تصور بھی نہیں تھا...... آپ کو کس نے تیار کیا تھا؟"

"میں گھر پر ہی تیار ہوئی تھی۔ مجھے میری کالج کی فرینڈ "گڈی" نے تیار کیا تھا...... سنا ہے بہت معصوم سی دلہن تھی میں...... شادی کا جوڑا "آف وائٹ" تھا۔ زیورات بہت فراخ دلی سے پہنائے گئے تھے مجھے جن میں "تاج" بھی تھا...... اس تاج پہ میری بیسٹ فرینڈز عفت انور اور کومل فیصل کی نظر ہے مگر میں تاج و تخت کیسے دے سکتی ہوں، مسکراہٹ۔"

"گھر کے کاموں میں ہاتھ ڈالا تو کیا پکایا تھا؟"

"میٹھا بنایا تھا جیسے کہ روایت ہے اور میٹھے میں گاجر کا حلوہ بنانے کی کوشش کی تھی...... نجیب سب کو مزے لے لے کر میری داستان حلوہ سناتے ہیں۔ مجھے چونکہ حلوہ بنانا نہیں آتا تھا تو گڑبڑ ہو گئی تھی۔ بہرحال وہ حلوہ نجیب کو بہت مہنگا پڑا۔ اسی طرح کے

بہت سے دلچسپ واقعات ہیں۔ جن میں نجیب نے مجھے دل آزاری سے بچانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا، جو بھی ان کی جیب پہ بھاری پڑا تو بھی ان کے دل پہ۔"

"شوہر نے سگھڑ بنایا یا سگھڑ تھیں پہلے سے؟"

"میرے شوہر نامدار کو سگھڑ اور سلیقہ مند خواتین اچھی لگتی ہیں۔ وہ خود بے حد صفائی پسند ہیں...... مگر میں خود کوشش کے باوجود سگھڑ نہیں بن پائی...... جیسے کہ سارا دن لگا کر الماریوں کی صفائی اور سیٹنگ کرنے کے بعد کچھ ڈھونڈنے کی تگ و دو میں پھر حشر نشر کر رہی ہوتی ہوں۔ میں زیادہ سلیقہ مند نہیں ہوں، جس پہ مجھے ندامت ہے۔ مگر بس نہیں ہوں تو نہیں ہوں۔"

"میاں صاحب مزاج کے کیسے ہیں...... وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوئے؟"

"مزاج تو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ تو ان کا مزاج بھی وقت کے ساتھ بدلا ہے۔ پہلے انہیں بہت جلدی غصہ آ جاتا تھا اب دھیرے دھیرے مزاج بھی دھیما ہو گیا ہے۔"

"ہنی مون کے لیے کہاں گئیں اور لڑکیاں شادی ہوتے ہی اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگا لیتی ہیں...... تو کیا یہ ضروری ہوتا ہے؟"

"ہم ہنی مون کے لیے ایبٹ آباد گئے تھے اور شادی کے بعد اپنے نام کے ساتھ شوہر کا نام لگانا ضروری تو نہیں ہوتا...... سب کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں...... جہاں تک میری بات ہے تو اگر میرے ابی جان کا نام میرے نام کے ساتھ ہوتا تو اسے کبھی خود سے الگ نہ کرتی...... مگر میرا پورا نام میرے دادا ابو نے عزیز فاطمہ رکھا تھا...... تو کالج میں فرینڈز فاطمہ کہہ کر بلاتی تھیں...... کالج میں بھی فاطمہ ہاشمی کے نام سے لکھتی رہی۔ پھر فاطمہ نجیب کر دیا گیا۔"

"بچے اور میاں کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ کیا آپ بھی شوقین ہیں؟"

"گھر میں میرے علاوہ سب ہی کھانے پینے کے شوقین ہیں۔ نجیب اور مریم کی گفتگو تو کھانے سے

شروع ہو کر کھانے پہ ہی ختم ہوتی ہے۔ بیٹا محمد حبیب "مٹن شنواری" پہ فدا ہے تو زینب کی نمکین گوشت پہ رال ٹپکنے لگتی ہے...... لوگ جینے کے لیے کھاتے ہیں اور ہم کھانے کے لیے جیتے ہیں...... گھر میں سب سے پسندیدہ تکہ اور اسپیگیٹی کھانا، کھانا اور کھانا بنانا ہے...... گفتگو کا سب سے اہم موضوع یہ ہوتا ہے کہ اب کیا کھائیں۔

نجیب بہت مہمان نواز ہیں...... کھانا پکانا بھی پسند ہے اور جب فارغ ہوتے ہیں تو باربی کیو اور مٹن کڑاہی خود بناتے ہیں، میری چھوٹی بیٹی زینب نجیب کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ وہ جھٹ پٹ کام کرتی ہے۔ لذیذ ترین "اسٹیک" اکثر میری فرمائش پہ بناتی ہے...... ہماری فیملی کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ سب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اور کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی کھانے کی وجہ سے ہے کیونکہ ایک ہی شوق ہے تمہارے...... بہرحال وجہ جو بھی ہو، ہم سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

"نجیب صاحب شادی سے پہلے کزن کے طور پہ ملتے تھے، مزاج کا اندازہ تو نہیں ہوگا، شادی کے بعد آپ نے انہیں کیسا انسان پایا؟"

"جی...... سچ تو یہ ہے کہ نجیب بہت اچھے انسان ہیں۔ سب رشتوں کو بہت اہمیت اور عزت دیتے ہیں۔ مجھے بھی اپنی شریک حیات ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ بہت مان سمان دیا۔ ہر ضرورت کہنے سے پہلے پوری کی...... ان کے اندر احساس ذمہ داری بہت زیادہ ہے...... جن رشتوں کو یہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں، ان کے لیے ہر وقت دل و جان سے حاضر ہیں...... اپنی فیملی کے علاوہ بھی کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے پوری کوشش کرتے ہیں جس جس کے لیے جو جو کر سکیں کرتے ہیں۔"

"نجیب صاحب آپ کا اب تو ذیٹ رہنا پسند کرتے ہیں یا اب کافی سال بیت جانے کے بعد لاپرواہ ہو گئے ہیں...... اور گھومنے پھرنے یعنی سیاحت کا کسے شوق ہے؟"

"جی...... نجیب تو میرا اتیار رہنا، خوش باش رہنا پسند ہے۔ میں ذرا بورنگ قسم کی خاتون ہوں...... اگر یہ کہا جائے کہ ان ہی کی ہمت ہے میرے ساتھ گزار دی اور گزار رہے ہیں۔ یہ ٹریولنگ کے، سیر و سیاحت کے، کھانے پینے کے بہت شوقین ہیں۔ جبکہ میں کتابیں پڑھنے اور زیادہ تر گھر میں رہنے کو ترجیح دیتی ہوں...... ہم لوگ بہت سے ممالک میں جا چکے ہیں اور جب جاتی ہوں، دل ہی دل میں اپنے گھر کے لیے بہت اداس رہتی ہوں۔ "فرانس" میں قیام کے دوران میں بظاہر سب کے ساتھ گھومتے پھرتے خوش ہوتی تھی...... مگر اکیلے میں باقاعدہ آنسوؤں کے ساتھ رو رو کر اللہ پاک سے دعا کیا کرتی تھی کہ جلد از جلد پاکستان اپنے گھر پہنچا دے...... بس اپنے گھر جیسی جگہ کوئی نہیں۔ اللہ پاک ہر کسی کو گھر کا سکون و عافیت نصیب کرے۔ آمین۔"

"شادی کی سالگرہ وغیرہ مناتے ہیں آپ دونوں؟"

"جی شادی کی سالگرہ اور دیگر سالگرہ بہت اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں ہم لوگ، بچے تحفے بھی دیتے ہیں۔ کھانا باہر کھایا جاتا ہے۔ خوب انجوائے کرتے ہیں ہم۔"

"سسرال والے آپ کی شاعری کو پسند کرتے ہیں؟"

"جی...... الحمدللہ شاعری کو ہمیشہ پذیرائی نصیب ہوئی۔ سسرال والوں نے بھی بہت سراہا۔ خاص طور پر میری چھوٹی نند سلمیٰ رحمان میری بہت قدر دان تھی۔ اس کو میں بہت شعر سنایا کرتی تھی...... جبکہ میرے میکے میں زیادہ تر میرے بھائی سلیم داد دیا کرتا ہے اور یہاں گھر میں بیٹی زینب نجیب کو میری شاعری بہت پسند ہے۔"

"اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فاطمہ نجیب صاحب سے اجازت چاہی۔ اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ٹائم دیا۔"

وہ نہ ملا جس نے ملنا تھا
یہ سال بھی بیت آخر

خواہش اور زندگی کا رشتہ عجیب ہے۔ فانی زندگی اور خواہشوں کا لامتناہی سلسلہ گزرتے وقت کے ساتھ انسان کی عمر کی ڈوری کھسکتی جاتی ہے۔ اس کا اختتام قریب جاتا ہے لیکن خواہشات کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ کچھ خواہش پوری ہو جاتی ہیں۔ کچھ ادھوری ہی رہ جاتی ہیں۔ انسانی فطرت کا حیران کن پہلو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ لاحاصل کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ سب کچھ پا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عرصہ حیات فانی ہے۔ اس کی جستجو اور تلاش کا سفر ختم نہیں ہوتا۔

نئے سال کے آغاز پر ہم نے قارئین سے ان کے گزرے سال کا احوال جاننا چاہا ہے اس حوالے سے سوال یہ ہے۔

1۔ گیا سال آپ کو کیا دے گیا؟ کیسا گزرا۔ گئے سال کی کوئی تحریر کوئی بات جو یادگار رہی۔

آئیے دیکھتے ہیں۔ ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

گزرے سال کی بات ہے

ادارہ

عندلیب زہرہ...... راولپنڈی

دل کی بات کہہ دینی چاہیے، چاہے کلام کے ذریعے، چاہے قلم کی مدد سے۔

سامنے والے کے لیے ہمارے دل میں جو قدر ہے، عزت ہے، اچھے جذبات ہیں، انہیں ان تک پہنچنا ہیں۔ جب ہم مثبت جذبات کے اظہار میں دیر نہیں کرتے تو اچھے جذبات کے اظہار میں تکلف کیسا۔ ہاں اظہار میں وقار، خلوص اور سادگی ہونی چاہیے۔ بناوٹ اور ریاکاری نہ ہو۔

شعاع اس لحاظ سے بہت اچھا پلیٹ فارم دیتا ہے اپنے قارئین کو مختلف سروےوں کے ذریعے، ہم قارئین بھی اپنے پیارے رشتوں کے لیے جذبات کا اظہار کرتے ہیں بزبان قلم، کبھی عیدوں کا احوال بیان کرتے ہیں...... کبھی سالگرہ...... کا تذکرہ کرتے ہیں تو کبھی بوڑھے دسمبر کی سرد شاموں میں بیٹھ کر پورے سال کا احوال، موسموں کے رنگ، رشتوں کے سنگ بیتی یادیں...... بچھڑے رشتے...... کامیابی...... ناکامی...... یادگار لمحے رقم کرتے ہیں تو یہ کریڈٹ شعاع کو جاتا ہے۔

گیا سال آپ کو کیا دے گیا؟

مجھے سارے مہینوں میں بوڑھا دسمبر پسند ہے۔ بردبار...... سرد...... طویل اور خاموش۔ بچپن میں بارہ مہینوں کی کہانی پڑھی تھی...... سو میرے تخیل میں دسمبر ہمیشہ بوڑھا مہربان، بارعب ہستی کا تصور پیش کرتا ہے۔ جو بڑے تدبر سے پورے سال کا گوشوارہ طلب کرتا ہے۔

یہ سال مجھے امید...... مثبت سوچ اور اچھے مستقبل کی جھلک دے کر جا رہا ہے۔ اس سال مجھے عزت و توصیف بہت ملی۔ (شکر الحمدللہ)...... میرے افسانے، سروے، شعاع و خواتین کا حصہ بنے۔ میں نے سیرت طیبہ کا تحریری مقابلہ کہانی جو آفاق لیڈرز کلب کی طرف سے منعقد ہوا تھا۔ جیت لیا...... میں جب شیلڈ کو دیکھتی ہوں مجھے فخر اور خوشی کا احساس ہوتا ہے اور بارہا شکرانے کے نفل پڑھے ہیں۔

"آنے والا اجالا" جو شعاع اپریل میں شائع ہوا تھا اسے بہت پذیرائی ملی...... الف کتاب میں لکھنے کا موقع ملا۔ تو اس لحاظ سے یہ سال کافی...... کافی...... مثبت رہا۔

اور جاتے جاتے میری جھولی میں اچھی سوچ اور خود اعتمادی کا تحفہ دے کر جا رہا ہے۔

گئے سال کی کوئی تحریر؟







اس مرتبہ شعاع نے اپنی تحریروں سے بہت متاثر کیا۔

شہزادو...... ڈرامائی موڑ کی وجہ سے متاثر کرتا رہا...... چونکہ میں شعاع کا حصہ بحیثیت لکھاری بننے پر خوش ہوں اور جھوٹ کیوں بولوں فخر محسوس کرتی ہوں تو مجھے اپنی تحریر ''آنے والا اجالا'' اور ''دو قدم پر جنت'' اچھی لگی...... بہت اچھی لگی۔

سمیرا عمیر کی تحریریں بہت متاثر کرتی ہیں جیسے کسی بوڑھے شخص کی سوانح عمری یا خود نوشت کے چند صفحے ہمارے آگے رکھ دیتی ہیں۔ اپنے قلم کی سادگی و پرکاری کے ساتھ، ''مولسری کے پھول'' مجھے اچھی لگی جیسے دل کو چھو گئی ہو۔

افشین نعیم نے یاردل وار سے ہمارے دل جیت لیے ہیں۔ مجھے سائرہ رضا کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ ایمل رضا نے پریم بوٹی کے ساتھ ہمارے دل میں اپنا پریم مزید بڑھایا۔

کوئی بات جو یادگار رہی۔

مجھے لگتا ہے کہ لکھنے کے حوالے سے میری کارکردگی بہتر ہوئی ہے۔ میں نے اپنی شخصیت کی گرومنگ پر توجہ دی۔ اور پہلی بار سوچا کہ انسان کو دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ ہم دوسروں کا خیال رکھتے رکھتے بعض اوقات اپنا خیال رکھنا بھول جاتے ہیں۔

اس سال جو بات اچھی رہی وہ یہ کہ مجھے کھوئی ہوئی سمیرا حمید واپس مل گئیں۔ بوند بوند تماشا۔ ام ایمن...... صحت بہ پسندیدہ افسانے ہیں۔ وینا فضل کریم کی کہانی سے ان کی واپسی ہوئی۔ مہر اور میراں، ام الیقین...... اس سال ان کی تمام تحریریں (مضامین) میں نے توجہ سے پڑھے اور ان سے سیکھا۔

عطیہ خالد کا نام نہ لینا...... ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

یہ سال مثبت اور اچھا رہا۔

بوڑھے دسمبر کے پاس میرا گوشوارہ تعمیری اور مثبت سوچ لیے ہے سو پرامید ہوں کہ آنے والی جنوری اپنے دامن میں میرے لیے بلکہ ہم سب کے لیے مسکراہٹیں ہی لائے گی۔ ان شاءاللہ۔

کوثر خالد سوہا...... جڑانوالہ

بہت ساری خوشیاں، بہت سے اسباق بہت سی عبرت اور ہجر و وصال کی لذت کے علاوہ غم جہاں کی بیماریاں و کسمپرسی کی تصاویر۔

پیارے ساتھیو! میں نے بچپن سے لے کر آج تک کبھی بھی خوشی کی کوئی تقریب نہیں منائی۔ حتیٰ کہ اپنی شادی کی خوشی بھی نہیں نہ کبھی سالگرہ وغیرہ کا تصور پالا۔

البتہ اپنے ایمان کی ترقی، اپنے خوابوں کی بشارت، اچھی تعلیم و تربیت کی افادیت اور اچھے دوستوں کی صحبت میری خوشی کے موجب ہیں۔

بہر حال اس سال میری بیٹی کی منگنی ہوئی اور دسمبر






کے آخر میں شادی ان شاءاللہ قرار پا چکی ہے۔ اللہ خیر کرے اور اسے کامیاب و سرخرو کرے اس امتحان میں۔

دوسرا...... جو بیوہ فرزانہ کی بچی میں پڑھا رہی ہوں۔ وہ اول درجے میں پاس ہوئی۔ مگر اس کی ماں، بہن ابھی کامیابی سے دور ہیں۔ کوشش جاری ہے۔

تیسرا...... میری کتاب ''دعاؤں کی بارش'' کمپوزر کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ جبکہ ''محمد جان حیات اور منظوم قرآنی تفسیر'' بھی تیاری میں ہیں۔

چوتھا...... رشتہ داروں سے مراسم بھی عام دنیا والوں سے بہت اچھے ہو رہے ہیں۔ اور محلے داروں کے ساتھ بھی کبھی تکرار نہیں ہوا۔ الحمدللہ۔

پانچویں خوشی جو سب سے بڑی خوشی ہے اور یہی خوشی ہے وہ یہ کہ ''شعاع'' میں میری پہلی نعت نے نام کے ہمراہ جگہ پائی ہے۔ جبکہ ''حمد'' پہلے شائع ہو کر خوشی دے چکی ہے۔ میں خوشی سے چھلانگیں بھی لگاؤں تو عجب ہے۔ شکریہ اللہ جی۔ شکریہ مدیرہ شعاع......

☆ سال کیسا گزرا؟

ہمیشہ کی طرح بہت اچھا۔ چونکہ میرے دل کا موسم خوشی و غمی دونوں میں متوازن رہتا ہے۔ میں اللہ کی رضا میں راضی رہتی ہوں۔ دوسروں سے امیدیں نہیں لگاتی۔ نہ ہی شکووں شکایتوں سے زبان لبریز رکھتی ہوں۔

البتہ دوسروں کو بھی ایسا ہی بنانے کے لیے بہت تقاریر کرتی ہوں۔ میرے آگے بحث کرنے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔ جو ہم سے اچھا ہے۔ اس سے بحث تو کجا، اس کے آگے اپنی ہی برائیاں کرتے رہتے ہیں۔ میری پیار ساس مجھ سے ڈانٹ کھا کر بھی خوش رہتی ہے۔ حالانکہ میں ڈانٹنا چاہتی نہیں۔ ''ساس'' نظم پر ایک رسالے سے انعام بھی ملا ہے۔

☆ کوئی تحریر؟

پچھلے ماہ کا شعر دل میں گھر کر گیا اتنا زیادہ کہ تضمین لکھ ڈالی۔ آپ بھی سنیے اور بتایئے کیسی لکھی اگر اصل نظم کوئی دکھائے تو مزا آ جائے۔

''بہت خاموش لوگوں سے...... بہت الجھا نہیں کرتے''
انہیں خاموش رہنے پہ...... کبھی چھیڑا نہیں کرتے
اگر وہ چاہتے نہ ہوں...... انہیں دیکھا نہیں کرتے
ستو خاموش لوگوں کو...... کبھی پرکھا نہیں کرتے
زمانے بھر کی خوشیوں سے...... یہ لوگ بہلا نہیں کرتے
خاموشی اک عبادت ہے...... اسے ٹوکا نہیں کرتے
سودا عابد لوگوں سے...... بیر رکھا نہیں کرتے

☆ کوئی بات جو یادگار رہی؟

اس ماہ دسمبر میں جو سمیرا حمید نے ''بات'' کی ہے ہم سے۔ ''چلو کچھ عہد کرتے ہیں۔''

اس پر سب ہی کو غور کرنا چاہیے۔ اگر ہم اپنے نفس سے جنگ کر لیں تو پھر کسی دوسری جنگ کا خطرہ نہیں رہتا۔ محاسبہ سے صرف اپنا ہی بھلا ہوتا ہے۔ مزا تو تب ہے کہ دشمن لاجواب کیا جائے۔ دشمن اپنی غلطی مانے۔ ورنہ بحث



میں کیا رکھا ہے۔ اگر ہم اسلام کے زرّیں اصولوں کو اپنا لیں تو دنیا ضرور جنت بن جائے۔

کہ اگر جنت میں جانے کی تمنا ہے تجھے
تو جنت میں جانے سے پہلے جنت لے آناں

ثمینہ اکرم ...... لیاری کراچی

نیا سال سروے میں (سوالوں کا مجموعہ) "ایک سوال" پڑھ کر اچھا لگا، جوابات لکھنے کے لیے بھی دل تو را ہی آمادہ ہوگیا۔ سال کیا دے گیا......؟ اور کیسا گزرا......؟

گیا سال یعنی 2018 کچھ خوشی اور کچھ دکھ دے کر گزرا آتے جاتے سال تو خوشی اور غم کا امتزاج ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنا احتساب گزرے سال کے حوالے سے کرتے ہیں تو ہم سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں ہو چکی ہوتی ہیں۔ ان پر ہم نادم ہو کر نئے سال میں انہیں نہ کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ گیا سال ذاتی اور انفرادی طور پر تو بہت اچھا گزرا، البتہ کچھ پریشانیاں اور دکھ بھی ملے۔ جیسے کہ میرے بھانجے راشد کا بائیک سے روڈ ایکسیڈنٹ۔ کچھ عرصہ سن 2018 میں بیمار بھی رہی۔ مگر پھر اللہ نے اپنا کرم کر دیا۔ ستمبر 2018 میں میری لاڈلی بیٹی جو کہ اکلوتی بھی ہے، خنوی اکرم کا رشتہ طے پا گیا۔ ایک بڑی خوشی ملی۔ اسی ماہ میں میرا چھوٹا بیٹا اسود اکرم حافظ قرآن بن گیا اور میرا دامن تو خوشیوں سے بھر گیا۔

مگر اگست 2018 میں میری جوان بھانجی شازیہ صرف ایک دن کی بیماری میں غلط انجکشن لگنے کی وجہ سے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ شازیہ ہماری ڈائجسٹ کی قاری اور عاشق تھی۔ ڈائجسٹ میں میرا خط ہوتا تو اسے اپنی دوستوں کو ضرور پڑھواتی۔ تو میں کہہ سکتی ہوں کہ گیا سال کچھ خوشی اور کچھ غم دے کر رخصت ہوا۔ اور کیسا گزرا؟ شکر الحمد للہ بہت اچھا گزرا۔

آتے ہوئے کچھ اور تھا جاتے ہوئے کچھ اور
یہ برس بھی گزرا ہے تیرے پیار کی مانند

☆ گئے سال کی کوئی تحریر؟ کوئی یادگار بات؟

شکر الحمد للہ کہ شعاع ڈائجسٹ کو ہر دور میں بہترین لکھاری بہنوں کا ساتھ ملا۔

میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے کہ کہانی تو یاد رہ جاتی ہے مگر کبھی کرداروں کے نام بھول جاتی ہوں تو کبھی ناول عنوان...... مگر بعض کہانیاں ذہن کے حافظ میں اپنے عنوان کے ساتھ روشن رہتی ہیں۔ میری پسندیدہ تحریروں میں ایک کہانی بیلا اور روشنی کی محبت کی پاک داستان "بن پاکھی" جو فرح بخاری نے تحریر کی ہے۔ یقین جانیں کہ یہ کہانی بس میرے دل میں گھر کر گئی۔ اس کی زبان دیہان، ہندی اور اردو کا ملاپ۔ سندر بن کے جنگلوں کی سیر۔ سفید اور نیلے پانیوں کا تذکرہ اور پھر بیلا کی راج سے پاک محبت...... سب کچھ اور بہت کچھ...... کہانی کو ان سب چیزوں نے مل کر چار چاند لگا دیے۔

"موجنگ" (سحر ساجد) ایک اور خوب صورت اور منفرد تحریر جسے میں نے بار بار پڑھا۔ سارنگل اور شنجائی کی محبت کی منفرد اور تاریخی کہانی، لگتا تھا جیسے سحر ساجد نے قارئین کو اسی تاریخی زمانے میں پہنچا دیا ہو۔

"ایمان" سحر ساجد ـــــ

نمرہ احمد کی تحریر راہ نور شوق اور راہ نور ـــــ بہترین تحاریر تھیں۔ افشین نعیم کے افسانے "یار دلدار" "سب کے سب" "شہر جمال کے مکین" فرزانہ کھرل کا ناول "پھول منتظر" مجھے بہت بہت زیادہ پسند آیا۔

صائمہ اکرم کا "شہزادہ" بہت اچھا جا رہا ہے۔ سائرہ رضا جب بھی لکھتی ہیں، اچھا ہی لکھتی ہیں۔

بنت راجپوت ...... ڈی آئی خان

گیا سال کچھ کھٹا میٹھا اور گزر گیا۔ خوب صورت تحریر صباحت علی کا مکمل ناول "دیکھو تمنائے روشنی"۔

بجھتی کی یہ بات جو اس نے ڈاکٹر ہادی کو کہی "آپ جیسے قابل ڈاکٹر کو بہت سی شیشیاں مل جائیں گی، لیکن ان پھولوں پر رہ جانے والی ہر شبنم کے آگے میں خود غرض بن کر دیوار چن دوں گی۔ مجھے اپنی نسل کے آگے دیوار نہیں چننی۔" والسلام۔

دانیہ تحسین ...... مظفر آباد ملتان

گزرا سال بہت کچھ دے گیا۔ نئے تجربے۔ نئی سوچ اور بہت کچھ۔ چند پچھتاوے بھی جھولی میں ڈال گیا۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ گلاس آدھا خالی ہے تو کیا ہوا؟ آدھا بھرا ہوا بھی تو ہے۔ گزرا بہر حال بہت اچھا۔ یہ خوش قسمتی رہی کہ کوئی بڑا دکھ نہیں ملا۔

یادگار تحریر فرح بخاری کی "بن پاکھی" رہی۔ بنگال کے پس منظر میں صرف ساجدہ حبیب کو ہی ... ہے۔ اس کے علاوہ چند تحاریر بھی یادگار ہو سکتی تھیں۔ یہ کہ راحت جبیں اور رفعت ناہید سجاد اگر دوبارہ لکھتیں ... جانے کہاں غائب ہیں؟ اور ہاں بانو قدسیہ کا "حاصل گھاٹ" اس سال پڑھا۔ ان کے باقی ... طرح اس میں بھی بہت مزہ آیا۔

اور رہ گئی بات یادگار بات کی تو "تبدیلی ... سے زیادہ 2018 کی یادگار بات کیا ہو سکتی ہے ... ہی نہیں آتا۔ اس کے علاوہ مرحومہ کلثوم نواز کی وفا... نہ بھولنے والا واقعہ ہے میرے لیے۔ میں ان خاتو... بہت متاثر تھی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلا مقا... فرمائے۔ آمین

تسنیم کوثر ...... کراچی

گیا سال ہمیں کیا دے گیا، بھئی بہت کچھ ... گیا۔ شکر ہے اللہ تعالیٰ کا۔ مگر گزرے سال کا تجربہ ... کیا کہیں بھئی سیاست میں اکھاڑ پچھاڑ، شور شرابا ... اس کے بعد گاتے بجاتے تبدیلی آگئی۔ نئی منظر... آگئی۔ اللہ تعالیٰ نئے نویلے حکمرانوں کو نیک ... دے۔ رہی ہمارے لیے تبدیلی کی بات تو وہی ... روٹین، مہنگائی کا رونا اور اس کے باوجود بھی کسی ... کی سیل پر شاپنگ کے لیے دوڑ لگانا جو کہ زیادہ ... نہیں۔

اس کے علاوہ بیٹے کے سی اے فائنل کے سمسٹر میں کامیابی کے لیے سارا سال اللہ سے دعا مانگتا۔ آج کل فیضان میرے بیٹے کے ایگزام چل رہے ہیں تو یہ سب کچھ کرتے اسی طرح سال گزر گیا اور آئندہ بھی زندگی رہی تو ایسے ہی بھاگتے دوڑتے سال گزرتے رہیں گے۔ اور رہا سوال کوئی عمدہ تحریر تو جناب شعاع کی تو ہر تحریر ہی لاجواب ہوتی ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک خوب صورت تحریر "خواب شیشے کا" دل کو بہت بھائی ہے اور کوئی یادگار بات تو ایسی خاص نہیں ہے۔ مگر بقول شاعر.....

چند یادوں سے دل کی رونق تھی
اب وہ یادیں بھی دل دکھاتی ہیں

سنبل ملک اعوان ...... واہ اللہ دیال شاہ

سوال تو صرف ایک ہے۔ مگر پوری کائنات ہے اس میں۔ سب دکھ ہے۔ سب درد ہے۔ سبق بھی ہے۔ میں ضرور شیئر کروں گی۔

2018 کیسا گزرا؟ سب سے چھوٹا بھائی جسے میں ہیرو کہتی ہوں۔ مگر وہ ہیرو نہیں ہے۔ اس کی زبان دس گز لمبی ہے۔ الزام تراشی میں سب سے آگے۔ اور الزام

لگائے تو صرف بہن پر لگائے۔ مجھے وہ غلط بھی کہتا ہے اور الزام تراشی بھی کرتا ہے۔

خیر جنوری کی صبح بھائی نہا کر نکلا تو ماما اس کی باڈی دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ ماما نے فوراً مجھے بتایا۔ میں اسے شیخ اسپتال لے کر گئی ٹیسٹ ہوئے۔ اور اسے ٹی بی نکل آئی۔

سات جنوری سے لے کر گیارہ مارچ تک میں نے دن رات اس کی خدمت کی۔ میں نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی کرتی۔ دن میں اسے لیے ٹیسٹ کرواتی پھر گھر آ کر ہر گھنٹے بعد اسے سیب کاٹ کر دیتی۔ انار کا شربت بنا کر دیتی۔ اسے قیمہ ابال کر دیتی۔ پھر تازہ آٹا گوندھ کر اسے روٹی بنا کر دیتی۔ اسی میں پھر ڈیوٹی ٹائم شروع ہو جاتا۔ میں سوئے بغیر پھر نائٹ ڈیوٹی کرنے چلی جاتی۔

اسی طرح میں نے سارا مہینہ گزارا۔ تین ماہ کے بعد ٹیسٹ کروائے تو ٹیسٹ +++ کے بجائے ++ آئے اور اسے لگا کہ وہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ تو ایسی زبان چلائی نے امی کے ساتھ کہ استغفر اللہ۔ امی کو گالیاں دیتے برا بھلا کہتا ہے۔ امی جان پہ الزام لگائے۔ مجھ پر بھی لگائے امی نے آنسو بہاتے ہوئے کپڑے اٹھائے اور گھر میں "شیلٹر ہوم" جا رہی ہوں ادھر چلی آئیں ... ماہ بعد بھائی نے دوبارہ ٹیسٹ کرائے

Plus++ آیا۔

ہم لوگ سب کچھ بھول کر اس کی خدمت میں لگ گئے۔ فریج کو پھر سے بھر دیا۔ فروٹ سے۔ گوشت سے۔ انڈوں سے قیمہ جو۔ جو بھی خوراک ڈاکٹر نے کہا ہم نے اس کو دی۔ پورے مہینے کے اینڈ پر ... میں سکے تک ختم ہو جاتے۔

تین ماہ کی لگاتار محنت رنگ لائی۔ اللہ نے دعا سن لی اور صحت عطا کی۔ مگر زبان کو زہر لہجے سے محروم نہ رکھا۔ میرے ایک کزن نے ادھار پیسے دیے تھے دس ہزار۔ "شیلٹر ہوم" جا رہی تھی تو پیسے گم ہو گئے پانچ ہزار لے واپس کر دیا۔ پانچ ہزار رہ گیا۔ اس بار بھائی نے اسے بھڑکا دیا۔ وہ محلے والوں کو اکٹھا کر کے وہ بولا۔ وہ بولا جس کی حد نہیں۔ بدتمیزی حد سے سوا کی اس نے صرف پانچ کے بدلے۔ ہم نے کون سا انکار کر دیا تھا کہ نہیں دیتے۔ ظاہر ہے ادھار لیے تھے دینے ہی تھے۔ مگر بھائی کے بھڑکانے پر اس نے بہت بکواس کی مجمع لگا لیا۔

پھر رات کو آ کر امی سے جھگڑا الگ کیا۔ پاپا نے فوراً بڑے بھائی کو فون کیا (اوئے یار انہوں نے پیسے لیے تھے ان کی وہ بے عزتی کر کے گیا ہے۔ بھیلے تو پتہ ہی نہیں کب اور کتنے پیسے لیے تھے۔ وہ کھڑا پار کیا اور پاپے (الو کے مزید الزام لگائی بڑے بھائی کو بتا کر (چھوٹے پیارے) پورا گھنٹہ بدتمیزی کی۔ میں نے ہاتھ جوڑے کہ میری ماما کو بخش دو۔ مگر وہ مسلسل بکواس کرتا رہا۔ اور میں بے بس اپنی ماں کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ پھر رات کو پاپا صاحب آ گئے باقی کسر انہوں نے پوری کر دی۔

پھر تو امی جان نے قسم کھائی کہ ہم اپنے "شیلٹر ہوم"

بقیہ صفحہ نمبر 257



جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ایشں

ارجمند شاہین ...... حویلیاں ہزارہ

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" دل کے پھپھولے پھوڑنے اور تجربات پڑھنے کے حوالے سے ایک دلچسپ اور حیرت انگیز سلسلہ ہے۔ جسے پڑھ کر حیرت، دکھ، خوشی، صبر، شکر، حوصلہ سب طرح کے جذبات و احساسات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

س "شادی کب ہوئی؟"

ج "شادی بہ یادی 28 فروری 2015ء کو ہوئی۔

س "شادی سے پہلے کے مشاغل و دلچسپیاں؟"

ج "ایم اے اسلامیات کیا۔ کچھ کورسز کیے جن میں سلائی، مارbل موزیک کورس اور کوکنگ شامل ہیں۔ شادی سے پہلے گھر کے کاموں کا جنون کی حد

تک شوق اور ذمہ داری تھی جو نبھانی پڑتی تھی۔ گھر ... کام ایکسرسائز سمجھ کے کرتی تھی جس کی وجہ سے ابھی ... تک اسمارٹ ہوں۔"

س "رشتے میں مرضی شامل تھی؟"

ج "ہماری فیملی ماشاء اللہ پڑھی لکھی ... دنیاوی اور دینی تعلیم دونوں ہی سب نے حاصل ... رکھی ہے۔ چنانچہ رشتہ جب ہوا تو باقی معاملات ... پہلے استخارہ کا کہا گیا مجھے، میں نے استخارہ کیا جو ... آیا اور بات طے ہوئی۔"

س "ذہن میں جیون ساتھی کا تصور؟"

ج "تصور کچھ نہیں تھا۔ بس یہ تھا خالی خولی ... جو انسان کو انسان سمجھے۔ واہ رے قسمت! انسان ... دور کی بات انہوں نے حیوان بھی نہیں سمجھا مجھے ...

کام یا ضرورت شوہر کو کہتی جواب آتا..... امی سے اور باجیوں سے پوچھوں گا۔ وہاں سے تو انکار ہی آتا تھا۔"

س: "منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

ج: "منگنی 4 ماہ رہی اور ان چار ماہ میں میری بڑی دو نندوں میں سے دوسری والی نے جھوٹ کے جو پل باندھے وہ اگر لکھنے بیٹھوں تو آپ کا ایک ماہ کا پورا ڈائجسٹ بھر جائے۔"

س: "شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں خیال؟"

ج: "ظاہر ہے ہر لڑکی اچھا ہی تصور بناتی ہے۔ میری ایک خالہ کہتی تھیں کہ بیٹا انسان انسان کو نہیں کھاتا بس برداشت اور ہمت سے ہر معاملہ نبٹ جاتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے علاقے میں ہی رہتے تھے مگر کام کاروبار کراچی میں تھا۔ کراچی بلدیہ کے علاقے میں دو بلڈنگز کرائے پر دے رکھی ہیں۔ ایک الائیڈ بینک اور دوسری نیشنل بینک کو تقریباً پونے دو لاکھ کرایہ آتا تھا۔ مگر اختیار سب میری ساس اور دوسری والی نند کا تھا۔ میرا دوسرے نمبر والا نندوئی بھی شرابی اور فتنہ باز ذہنیت کا حامل تھا۔ وہ ہمارے علاقے کے الائیڈ بینک کا منیجر تھا۔ جو وہ اور اس کی بیوی کہتے وہ ہی میری ساس اور شوہر کہتے تھے۔ میرے شوہر کے ماتھے پہ نماز کا نشان تھا۔ میری ماں اور بھائی نے داڑھی، محراب اور اس کی تسبیح دیکھی اور ہاں بھر لی۔"

س: "شادی کے لیے کن کن چیزوں کی قربانی دینی پڑی؟"

ج: "اعتماد کی...... کیونکہ میں شادی سے پہلے بہت بااعتماد تھی۔ محلے، خاندان میں اگر کچھ پکا کر دینا ہے یا دعوت وغیرہ ہے تو مجھے سب پتا ہوتا تھا۔ کتنی مقدار میں چیز ڈالی ہے، پکائی ہے۔ کتنا سامان کافی ہو گا۔ ساٹھ سے ستر افراد کا کھانا میں اکیلے پکا لیتی تھی۔ مدد کے لیے بھابھی بھی ہوتی تھیں مگر حساب کتاب دونوں مل کر لیتے تھے کام بھی ہو جاتا تھا اور معاملہ بھی نبٹ جاتا۔

سسرال میں چوتھے پانچویں دن ہی کام کا ... لیکن ساتھ میں جو ہدایات تھیں۔ بھابھی نمک ایسے ... چلانا ایسے چلانا ہے۔ بھابھی کھانے میں بال نہ گرے...... نوالہ ایسے پکڑنا۔ بھابھی آپ کا منہ کیوں کھلا ... اس طرح کے جملوں نے حیران و پریشان کر دیا۔ تو جیسے جنگل سے اٹھ کر گئی تھی۔ بس ان لوگوں کی عادت تھی کنفیوز کرنے کی۔ میری دیورانی کو بھی ٹوک کر انہوں نے نفسیاتی ... کر رکھا ہے ... جب ... نے یہ نوٹ کیا تو تھوڑا اپنے آپ کو مضبوط کیا۔"

س: "شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا بدمزگی ہوئی؟"

ج: "ہمارا ماحول یعنی میکے کا ماحول ... ضرور ہے مگر سادہ ہے۔ الحمدللہ مالی لحاظ سے ... ہے۔ بھائی دونوں پڑھے لکھے ہیں ایک پروفیسر اور ... انجینئر...... سو ساری خواہشیں ضرور تھیں پوری ہوں مگر ہمارا بینڈ باجے والا رواج نہیں تھا اور نہ ہی ... وغیرہ کیا۔ سب کچھ ہال میں ہوا لیکن خاموشی سے شادی ہوئی ہے۔ نکاح والے دن جو کے مہندی پہ ... ہوا میرے دیور نے فائرنگ کرنا چاہی میرے بھائی نے سختی سے منع کر دیا۔"

س: "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟"

ج: "تمہیں بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔" اس کا مطلب ہے وہ جانتے تھے کہ ان کی ماں، بہنیں میری برداشت کو آزمائیں گی۔"

س: "شادی کے بعد کیا تبدیلی آئی؟"

ج: "میں ہر موضوع پر بول سکتی تھی شادی سے پہلے لیکن شادی کے بعد بولنے پر بھی پابندی لگ گئی۔ سسرال والوں میں بیٹھ کر کسی بات پہ تبصرہ ... میرے سامنے وہ سب خاموش ہو جاتے تھے مگر بعد میں میری نقلیں اتارتے تھے۔ وہ لوگ کم پڑھے لکھے تھے اور تو دو لیتے تھے۔ پیسے کا استعمال ان کی روح قبض کرنے کے مترادف تھا۔ دروازے پہ بھیک مانگنے والے کو میرے میکے والے بھی خالی نہیں لوٹاتے تھے مگر سسرال میں جب میں نے بھکاری کو دینا چاہا تو میری ساس صاحبہ نے کہا کہ یہاں یہ رواج نہ پالنا۔ ساتھ ہی انہیں بندوں کے لیے صرف دو انڈوں کا آملیٹ بنتا تھا۔ چار، پانچ کپ چائے بنتی تھی جسے مل کر شکر ... میری سات نندیں اور شوہر کو ملا کر پانچ بھائی ہیں۔ ایک دیورانی، تین اس کے بچے، ساس، میں اور بڑی دونوں بہنیں شادی شدہ۔ ایک کے پانچ اور دوسری کے تین بچے تھے جو ہر وقت وہاں پائے جاتے تھے۔ پانچ نندیں اور تین دیور ابھی کنوارے ہیں۔ سب مل کر مجھے ہر وقت ٹوکتے اور مذاق اڑاتے تھے۔ میرے سسرال میں جھوٹ ایسے بولا جاتا تھا جیسے سانس لازمی ہے ویسے جھوٹ بھی لازم ہے سب پر۔ میں نے جھوٹ پر چپ کو ترجیح دی۔ ان سب کی آنکھوں کے اشارے مجھے بولنے پر مجبور کرتے مگر خاموشی سے اپنے غصے اور اشتعال کو پی جاتی۔"

س: "شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟"

ج: "کم مارچ کو ولیمہ ہوا۔ 6 مارچ کو اٹھائیس بندوں کے ساتھ ہنی مون پہ اسلام آباد گئی دن گیارہ بجے روانگی ہوئی رات گیارہ بجے گھر واپسی ہوئی سب تھکے ہوئے تھے۔ شوہر نے کہا مجھے بھوک لگی ہے کھانا پکاؤ۔ فریج دیکھا چکن پڑے تھے آٹا نکال کر روٹی بنائی۔ ساتھ ساتھ سارے اپنے کمروں سے سر نکال کر آوازیں لگانے لگے۔ بھابھی ہمارے لیے بھی، سو پکانی پڑی۔"

س: "میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟"

ج: "میکے میں ہم کل آٹھ لوگ ہیں۔ والد کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ والدہ بھائی، بھابھی ان کے تین بچے میری بڑی بہن اور میں...... چھوٹا بھائی کینیڈا ہوتا ہے۔ ہمارا سارا خاندان ہی اوپر کا پھیکا سالن کھاتے ہیں۔ ساتھ میں ہری مرچ کی چٹنی یا اچار لے لیتے ہیں۔ پراٹھے ہفتے میں ایک بار کیونکہ امی کہتی ہیں کھانے ہیں تو خالص گھی کے کھاؤ، آئل، گھی نقصان دہ ہیں۔ سو ناشتے میں زیادہ تر سادہ روٹی، فرائی انڈہ دیسی گھی میں پکا ہوا اور چائے۔

سسرال میں بناسپتی گھی کے پراٹھے چائے کبھی کبھار مل گئی تو ٹھیک ورنہ خاموشی۔ دو انڈوں کا آملیٹ وہ بھی کبھی ملا کبھی نہ۔ دن میں سالن میں خوب خوب مرچیں، جو مجھ سے کھائی نہیں جاتی تھیں۔ میکے میں چاول پندرہ بیس دن کے بعد پکتے تھے سسرال میں دن میں ایک بار ضرور جو کے مجھ سے نہیں کھائے جاتے تھے۔ میکے میں دالیں، سبزیاں، گوشت ہر چیز برابر پکتی تھی۔ سسرال میں چاول، چاول اور صرف چاول۔"

س: "سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟"

ج: "نہیں، انہیں بیاہنے کی جلدی تھی اور بیاہنے کے بعد انہیں یہ فکر تھی کہ پڑھی لکھی اور سلجھے اور شریف خاندان کی لے تو آئے ہیں اب کہیں یہ ہمارے بیٹے کو پٹیاں پڑھا کر ہم سے الگ نہ کر دے۔ جبکہ میرا شوہر اور میرے دیور سب کے سب بے روزگار ہیں ایک بے روزگار کو کوئی بے وقوف عورت ہی الگ کرنے کا سوچے گی؟ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ساس صاحبہ آمدنی اور اے ٹی ایم کو ایسے سنبھال سنبھال کر رکھتی تھیں کہ مرنے والا مرے پانی کا گھونٹ بھی پڑوسی آ کے پلائے، میری ساس سے ایسی امید بھی فضول ہے۔"

س: "سسرالیوں سے وابستہ توقعات؟"

ج: "توقعات تسبیح، محراب سے جو بنی تھی کہ نمازی، پرہیزگار، دینی ماحول ہو گا تو بالکل الٹ نکلا۔ ہر وقت انڈیا کے گانے ٹی وی پر چلتے رہتے تھے، نہ مغرب کا پتا نہ فجر کا لحاظ۔ صبح چھ بجے سے رات کے بارہ بجے تک انڈیا کے چینل کو پروموٹ میرے سسرال والوں سے زیادہ کوئی نہیں کرتا ہو گا۔ شوہر سے سب کے سامنے بات کرنے کی اجازت نہ تھی، ساتھ کھانا کھانے کی بھی نہیں تھی البتہ دیوروں کے ساتھ جتنا مرضی بولو، ان کی جتنی مرضی خدمت کرو۔ شریعت کے الٹ سب کام میرے سسرال میں

ہوتے تھے۔ دولاکھ کرایوں کا کہہ کر رشتہ ہوا لیکن دس روپے بھی دیکھنے کو نہیں ملے سسرال میں۔ فروٹ، اول تو آتے ہی کم تھے مگر جب آتے ہم دونوں بہوؤں سے چھپا کر کھا لیے جاتے۔ مچھلی، بجی، آئس کریم بھی دو تین مہینے بعد آتے مگر مجھے اور دیورانی کو ہڈیاں اور خالی ڈبے ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔"

س "پہلے بچے کی پیدائش کب ہوئی؟"

ج "ٹھیک نو ماہ بعد ہوئی۔ تب ہی تو احساس بھی ہو گئی کیونکہ اس دوران میری خوراک، آرام کا خیال رکھنے کے بجائے میرے سسرال والوں کے وہی طعنے، طرز یہ نرالا بچہ پیدا کرے گی۔ میری خوراک کی کمی ڈاکٹرز کے بار بار کہنے کے باوجود میرے میکے والوں نے پوری کی۔ میرا سسرال ادھر حویلیاں دس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ ہر دس دن کے بعد امی دودھ، فروٹ، کھجوریں، دیسی انڈے، تھوڑا مکھن و دیسی گھی، بسکٹ سب بھجوا دیتی تھیں۔ میرے سسرال والے اس فروٹ اور دودھ کے جوس بنا بنا کے پیتے اور کہتے بھابھی بھی تو ہماری روٹی سالن کھاتی ہے اگر ہم نے کھا لیا تو کیا ہوا؟ مجبوراً مجھے ہر دس دن کے بعد ساری چیزیں دوبارہ منگوانی پڑتیں۔ بہر حال اللہ اللہ کر کے بچی پیدا ہوئی۔ جو کہ چھ ماہ کی ہوئی تو پتا چلا کہ ذہنی طور پر معذور ہے۔ میرے سسرال کا یہ موروثی مسئلہ ہے۔ میرا ایک دیور، میری دونوں نندوں کے دو دو بچے معذور پیدا ہو کر فوت ہو گئے۔ میرا دیور تقریباً اب 36 سال کا ہے وہ زندہ ہے اور ذہنی طور پر معذور ہے۔ 6 مئی 2016ء کو میری بچی کی بیماری ظاہر ہوئی اور میں نے اپنی ساری خاموشی ایک طرف رکھتے ہوئے اس کا علاج کروانے کی ٹھانی۔

ایبٹ آباد کے ڈاکٹرز سے میں مطمئن نہ ہوئی تو اسلام آباد کے ڈاکٹر طارق سے ٹائم لیا۔ پاکستان کے سات بڑے دماغ کے ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر طارق بھی ہیں۔ وہاں سے میری بربادی شروع ہوئی۔ میری دوسری والی نند نے ضد پکڑ لی کہ جو ہے وہ ہے بس علاج کی ضرورت نہیں۔ 6 جون 2016ء کو ڈاکٹر کے پاس جانا تھا اور 27 مئی کو رات گیا... میری اس نند نے مجھے مار مار کے گھر سے نکلوا... بھی چھین لی اور امی کے گھر کا چار تولے زیور... چوڑیاں تھیں وہ بھی لے لیں۔

وہ دن یہ دن میں ماں کے گھر ہوں اور... عدالت کے ذریعے منگوالی۔ ماشاء اللہ اس کا... کروایا جب دو سال کی ہوئی تو ڈاکٹر نے علاج ختم... اور کہا کہ اب اسے گھر پر توجہ دیں۔ میں خوشی... ہمت باندھ کر سسرال گئی چلو تھی خرچہ والی بات... شاید وہ لوگ اب مجھے خوشی خوشی رکھ لیں مگر... میری دنیا ہی ختم کہ میرا شوہر تیسری دفعہ دولہا بن... تھا۔ میں ان ہی قدموں پہ واپس آ گئی۔"

س "سسرال کے ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کی؟"

ج "کوشش سوا سال میں کیا کرتی جن میں نو ماہ میری اپنی طبیعت خراب اور بوجھل رہی۔ جواب اکثر یہ ملتا کہ اپنی ڈگریاں اور ذہانت طریقہ سلیقہ سنبھال کے رکھو۔ بس خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

آخر میں آپ سب والدین خصوصاً ماؤں سے التجا ہے کہ بیٹیوں کا رشتہ دیں یا بیٹوں کی بات طے کریں۔ اچانک جا کر ان لوگوں کے گھروں کے ماحول کا جائزہ ضرور لیں۔ علماء اکرام بھی یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس جھوٹ اور فریب کے دور میں ایسا ضرور کریں۔ اطلاع دے کر جائیں گے تو جو میرے ساتھ ہوا یعنی سب ٹھیک اور خوش گوار لگے گا بعد میں سب بگڑ جائے اور بھیانک تو کوئی فائدہ نہیں۔

اب دیکھیں۔ میرا فیصلہ کب ہوتا ہے؟ جہیز تو ٹوٹا پھوٹا واپس آ چکا ہے۔ طلاق نامہ ابھی باقی ہے۔ میرے لیے اور میری بچی کے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔ اللہ پاک معجزہ کرنے والی ذات میری بچی کو ذہنی اور جسمانی دونوں طرح شفایاب کرے۔ آمین۔ ثمہ آمین۔"

☆

رخسانہ نگار عدنان

شام کی چوٹی میں

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آپی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچہ فروشوں سے بھی بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ (ا…) ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے لگتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر…

دوسری جانب کشف کا اسے پڑوسی چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اس کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔



آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے ... دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش ... زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی ناہید اس سے بتول خالہ کے بیٹے جگر ... پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میرو خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یادیں جو اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ وہ اس ... کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میرو اسے منا لے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی مع... پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروا لیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جا... ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف ... بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آ جاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی ہیں ... بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں ... ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں ... ہیں اور اس سے پوچھتی ہیں کہ کیا ہوا ہے اور وہ کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میرو دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عو... کی طرف میرو دہشت زدگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت ... سے چیختا چلاتا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ عورت چلاتے چلاتے میرو کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن د... بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ مر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر زینب سے ملتا ہے تو اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

کشف بیاباں میں تم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آ جاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

منصور ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔

کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔

زینب بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔

ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔

سونیا زینب کو فون پر کشف کی بابت بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ وہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔

... جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔

موحد زینب کو ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔

... ہوٹل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر صورت اس سے ملاقات کرے۔ جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

اب آگے پڑھیے

پانچویں قسط

اس نے ایک جھٹکے سے بیرونی دروازہ کھولا اور سامنے کھڑے جگنو کو دیکھ کر اس کا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"کیا ہے؟" اس کی نیم عاشقانہ مندی مندی آنکھوں کو دیکھ کر اس کے منہ میں گالی تو آئی تھی مگر بمشکل صرف زینب کی ناراضی کا خیال کر کے کہ وہ پہلے ہی اس سے سخت ناراض تھی، اس نے لٹھ مار انداز میں سوال کیا۔

"چل!" اس نے بڑے فلمی انداز میں پشت پر بندھے ہاتھ کو سامنے لا کر کاغذ کے ٹکڑے کو دو انگلیوں میں سگریٹ کی طرح پکڑ کر کشف کے چہرے کے سامنے لہرایا۔ اس نے ناگواری سے اس ناکام عاشق کو دیکھا۔

"لائن مین لگ گئے ہو کیا واپڈا میں؟" وہ لہجے میں حقارت سمو کر بولی۔

"ہاہ ہماری ایسی قسمت کہاں؟" وہ آہ سی بھر کر رہ گیا۔

"آہیں تو یوں بھر رہے ہو جیسے آخری سانسیں چل رہی ہوں تمہاری...... کچھ بھی ملنے کی آس نہیں رہی کیا؟" وہ اس کی طرف سے رخ پھیرتے ہوئے اسے پیچھے کی طرف دھکیل کر اب دروازہ بند کرنے لگی۔

"جس کی آس ہے وہی ہمیشہ ناامید کر دیتی ہے۔ سانسوں کی چاہ کس کو ہے اس کے بغیر۔" وہ ڈوبتی ابھرتی بھاری آواز میں کہہ رہا تھا۔

"لگتا ہے رات چرس کا سوٹا کچھ زیادہ ہی لگا گئے ہو دماغ پہ ابھی بھی گہرے بادل چھائے ہیں۔" وہ مڑ کر طنز سے بولی۔ جگنو ایک دم سے چونکا تھا۔

اس کے چہرے پہ گھبراہٹ سی تھی کشف کو مزہ آ گیا۔
"کک...... کیا مطلب میں کوئی نشہ کرتا ہوں تمہارے خیال میں؟" وہ سخت بوکھلایا تھا۔
"چرس نشہ ہوتا ہے۔ واقعی میں مجھے نہیں پتا تھا۔ وہ تو میں کل شام — چھت سے کپڑے اتارنے تمہاری اماں کہہ رہی تھی۔ اے اگر دوبارہ تمہاری جیب سے چرس کی پڑی ملی تو وہ خود تمہارا ہاتھ پکڑ کر تھانے لے آئے گی۔ سچ سچ جگنو! میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تم اتنا گھٹیا نشہ کرتے ہو گے۔
پاگل اب تو یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہو گئیں۔ نشہ ہی کوئی ہائی فائی کر لیتے اپنی کلاس سے اوپر کا۔" وہ افسوس کر رہی تھی۔
"نہیں نہیں قسم لے لو اللہ کی...... ہم...... مجھے تو کسی بھی نشے کی عادت نہیں وہ تو اماں یوں ہی مجھے تپانے کو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے۔" وہ سچ مچ گھبرا گیا تھا یا کشف کے سامنے بننے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔
"قسم لے لو میں نے تو......" بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی اس کی۔
"اچھا اب ہٹو بھی۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں میری طرف سے تم جس کی مرضی قسم کھاؤ، نشہ کرو یا نہیں میری بلا سے۔" جگنو اچھا خاصا چیکو ہو رہا تھا۔ اس کی بس نکل جاتی تھی یہ خیال آتے ہی وہ اسے ہٹا کر جانے لگی۔ اسی وقت کوریئر کی بائیک آ کر رکی۔
"مس کشف منصور!" بائیک پہ سوار لڑکا ہیلمٹ میں سے منہ نکال کر پروفیشنل انداز میں پوچھ رہا تھا۔
"جی!" وہ کچھ حیران سی ہوئی۔
لڑکا اب اس کے پیچھے کی طرف دیکھ کر گھر کا ایڈریس پڑھ رہا تھا پھر ایک لفافہ نکالنے لگا۔
"یہ آپ کے لیے ہے۔" اس نے ایک چھوٹا سا لفافہ اس کی طرف بڑھایا اور ایک پیپر اور پین اس کی طرف دستخط لینے کے لیے بڑھایا۔ کشف نے سائن کر کے لفافہ پکڑ لیا۔
"کسی نے خط بھیجا ہے کیا؟" جگنو متجسس ہو کر لفافے کو دیکھ رہا تھا۔
کوریئر والا لڑکا تنگ گلی میں بائیک گھماتا واپس چلا گیا۔
"کل تو تمہاری ماں بڑی قسمیں کھا رہی تھی میری کشف بڑی معصوم ہے۔ بھولی سادہ بے زبان گائے اور بیٹی کے پچھن کیا ہیں یہ کوئی ہم سے پوچھے جو تماشے ہم محلے والے دن بھر دیکھتے ہیں۔" خالہ بتول جانے کہاں سے ٹپک پڑی تھی۔
یوں تو اس کے نکلنے کا کوئی بھی وقت مقرر نہیں تھا مگر کشف کے ساتھ اس کی جو خاص دشمنی تھی، اس سے لگتا تھا وہ اس کے آنے جانے کے اوقات میں بطور خاص اب دروازے کی چوکھٹ ہی سے لگی رہتی ہے۔
"موبائل — تمہارے پاس دنیا بھر سے ملنے ملانے کا شیطانی آلہ پھر ایک لڑکا جسے تمہاری ماں بھتیجا بول رہی تھی کہ بھائی کی شکل تو ہم نے کبھی دیکھی نہیں اس عمر میں۔ بھتیجا اللہ جانے کہاں سے دریافت کر لیا تمہاری اماں نے، اس کے علاوہ اب یہ خط و کتابت بھی شروع ہو گئی۔"
"میری سمجھ میں نہیں آتا آپ کو تکلیف کیا ہے مجھ سے اور میری ماں سے۔ آپ کو اپنے گھر میں تو شاید چین آتا نہیں۔ دوسروں کی بھی کوئی گھڑی چین سے نہ گزرے۔ آپ نے پیدا ہوتے ہی قسم کھائی تھی۔" کشف اتنے ملعون طعنوں کے بعد بھی چپ رہتی تو شاید اسے خودکشی کرنی پڑ جاتی۔ یہ نہیں تھا کہ بتول خالہ کو اس سے کسی نرم جواب کی توقع تھی مگر وہ یوں کھلی بدتمیزی پہ اتر آئے گی اس کا بھی اندازہ نہیں تھا جگنو پہلے ہی ماں کو دیکھ کر کھسک چکا تھا۔

"وہ اس لیے ٹھیک ہو کہ تیری اور تیری ماں کی وجہ سے اس گلی کا محلے کا جو ماحول بن رہا ہے وہ سنا ہو گا ناں تو نے بھی پچھلے نام کو پوچھتی ہو کہ ایک گندی مچھلی پورے جل کو......" وہ طعنے تشنے کے بعد اب ڈائریکٹ الزامات پہ جس طرح سے اتر رہی تھی کشف کو لگا وہ یا تو آج خود مر جائے گی یا اس عورت کو مار ڈالے گی۔
وہ پاگلوں کی طرح اس پر جھپٹی بھی تھی۔
"تمہارا منہ نوچ لوں گی۔ ذلیل بڑھیا۔ گندی مچھلی تو تم خود ہو اس گلی کی، نالی کا کیڑا جسے ضرورت سے زیادہ عزت مل گئی تو ہضم نہیں ہو رہی تم سے لوگوں کی زندگیاں حرام کرنے والی۔"
وہ منہ سے کف اڑاتی جنون میں آیا بولتی جا رہی تھی جب کسی نے اسے پیچھے سے پکڑ کر جلدی سے دور کھینچا تھا۔
ارد گرد لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔
شاید سامنے والی سائرہ باجی تھی یا پیچھے والوں کی کوثر، اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ بتول خالہ بھی چیخ چیخ کر کچھ بول رہی تھیں مگر کشف کو کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔
وہ اپنے آپ کو چھڑا کر رستے کی پہچان کے بغیر بس تیز تیز چلتی جا رہی تھی اس کے دماغ میں ہی نہیں ارد گرد بھی جیسے آندھیاں سی چل رہی تھیں۔
"آج کچھ بھی ہو جائے میں گھر واپس نہیں آؤں گی۔ اس ذلت والی جگہ پر رہنے سے اچھا ہے میں چلتی ٹرین کے آگے جا کر لیٹ جاؤں۔" اس کا چہرہ بار بار آنسوؤں سے بھیگتا، جسے وہ رگڑتی، بغیر ادھر ادھر دیکھے چلے جا رہی تھی۔

☆☆☆

"گاڑی اچھی حالت میں؟" زینب نے چونک کر دہرایا۔
آج اس کا تیسرا پیریڈ فری تھا۔
وہ اسٹاف روم میں اکیلی ہی بیٹھی بچوں کے ٹیسٹ چیک کر رہی تھی جب حیدر بھائی کا فون آ گیا ان کی بات سن کر وہ لمحہ بھر کو بے یقین سی رہ گئی۔
"کشف کو کتنا شوق ہے اس کے پاس اپنی گاڑی ہو، اس کی برتھ ڈے بھی تو آنے والی ہے۔ میں اگر اسے گفٹ کروں تو وہ کتنا خوش ہو گی۔" کشف کی خوشی کے خیال نے زینب کو ابھی سے نہال کر دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر میں کتنا کچھ سوچ چکی تھی۔
"بہت اچھی حالت میں ہے اور ان صاحب کو فوری پیسوں کی ضرورت ہے ڈیمانڈ بھی کچھ زیادہ نہیں کر رہے اگر تم ایک نظر گاڑی دیکھ کر پسند کر لو تو میرے خیال میں ان سے بات کی جا سکتی ہے تمہارے بجٹ کے مطابق۔" حیدر بھائی بول رہے تھے اور زینب کی جیسے آنکھیں بھیگی جا رہی تھیں۔ وہ سننے والا ہے وہ بے نیاز ہے۔
اس وقت بھی ساری دعائیں لوٹا دیتا ہے انعام سمیت جب مانگنے والا فراموش کر چکا ہو۔
اور ابھی بہت دیر تو نہیں ہوئی اور آج کل تو اسے لگتا تھا اس نے کشف کے لیے حقیقی معنوں میں جینا ہی ابھی شروع کیا ہے۔ زینب کا جی چاہتا وہ اپنی بیٹی کی چھوٹی بڑی، دل میں چھپی ظاہر، ہر خوشی، ہر خواہش کو جادو کی چھڑی سے پوری کر ڈالے۔
"کہیں وہ منصور کے پاس جانے کی ضد میں پکی نہ ہو جائے، کہیں یہ خوف تو مجھے اس کو خوش کرنے پہ مجبور

نہیں کر رہا۔" وہ پریشان سی خود سے پوچھنے لگی۔
"کیا سوچنے لگیں! اگر ابھی موڈ نہیں ہے گاڑی کا تو میں منع کر دیتا ہوں وسیم کو۔" حیدر نے اس کی خاموشی سے یہی سمجھا کہ شاید ابھی وہ گاڑی خریدنا نہیں چاہتی۔
"نہیں نہیں آپ منع نہیں کیجیے گا۔ گاڑی تو ضروری ہے بہت عرصے سے میں نے سوچ رکھا ہے۔ ابھی پیسے ہیں ایسے بھی خرچ ہو گئے کچھ مہینوں میں تو پھر گاڑی رہ جائے گی، کشف کو بسیں بدل کر جانا پڑتا ہے، اس کو آسانی ہو جائے گی۔" وہ جلدی سے بولتے ہوئے لہجے میں کشف کے لیے فکرمندی لیے ہوئے تھی۔ حیدر اسے کچھ جتاتے جتاتے رک گیا۔
"اپنی ساری ضرورتوں اور خواہشوں کو پس پشت ڈال کر تم صرف کشف کی خواہشوں اور ضرورتوں کے لیے جتنا سوچتی ہو کیا وہ بھی تمہارے لیے اتنی حساس ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ جتائے بغیر نہ رہ سکا۔
"دنیا کے سارے والدین یہی کرتے ہیں حیدر بھائی اور بدلے میں وہ کب سوچتے ہیں کہ ان کی اولاد انہیں کیا دے گی۔" وہ سادگی سے مسکرا کر بولی۔
"اچھا چھوڑیں، بلکہ میں تو کہتی ہوں اگر آپ کو گاڑی پسند ہے تو آپ بات کر لیں۔" وہ کچھ بے دلی سے بولی۔
"نہیں...... تم پہلے دیکھ لو، اگر تمہیں پسند آ گئی تو پھر میں بات کو آگے بڑھاؤں گا اور میرے پاس تمہارے لیے ایک اور بھی اچھی خبر ہے۔" وہ دوسرے لمحے پھر سے اسے سرپرائز کرتے ہوئے بولے۔
زینب بے اختیار چونکی تھی۔
"یہ آج کیا آپ میرا ہارٹ فیل کروائیں گے بار بار مجھے خوش خبریاں سنا کر میرے ساتھ کیا کرنا چاہ رہے ہیں۔" وہ خوشی بھری کانپتی آواز میں بولی۔ حیدر بے ساختہ ہنس پڑا۔
"اچھا سنائیں نان، جلدی سے کیا کہہ رہے تھے۔" وہ بے صبرے پن سے بولی۔
"ایسے نہیں بھئی...... وہ خبر فون پر سنانے والی نہیں۔" وہ بھی اس کی بے صبری کو انجوائے کرتے ہوئے بولے۔
"اب یہ زیادتی ہے حیدر بھائی! پلیز بتا دیں مجھے خوامخواہ بے چینی سی رہے گی۔" وہ بے قرار ہو کر بولی۔ دل ابھی بھی بچہ سا تھا انجانے کو جاننے کی خواہش میں اکثر ہی مچلتا رہتا تھا۔
"تمہیں اسکول سے پک کر لوں میں۔ گاڑی بھی دیکھ لینا اور بات بھی ہو جائے گی۔" وہ فوراً سے تجویز پیش کرتے ہوئے بولے۔
"مجھے آج مارکیٹ جانا تھا گھر کی کچھ ضروری چیزیں ختم ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ خریداری کرنا تھی۔ سوچ رہی تھی کشف کو لے کر جاؤں گی شام میں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔
"خریداری وغیرہ کا پروگرام تم کل کا رکھ لینا آج اگر کچھ بہت ضروری ہے تو وہ لے لینا میں تمہیں اسکول ٹائم کے بعد پک کرنے آتا ہوں۔"
"حیدر بھائی پلیز۔" وہ فون بند کرنے کو تھا جب وہ بے اختیار بولی۔
"آپ مجھے پک کرنے مت آئیے گا۔ میں آ جاؤں گی آپ کے آفس۔" وہ رک کر بولی تھی اس کے لہجے میں کچھ تھا حیدر فوراً کچھ بول نہیں سکا۔
"میں آج آفس نہیں گیا زینب، گھر سے بات کر رہا ہوں۔" وہ رک کر بولے تو وہ جواب میں کچھ بول نہیں

سکی۔
"یہ بھی ٹھیک ہے تم اگر گھر آ جاؤ تمہارے اسکول سے نزدیک پڑے گا تو وہیں سے میں تمہیں گاڑی دکھانے لے جاؤں گا۔ اماں بھی بہت یاد کر رہی ہیں تمہیں، ان سے بھی مل لینا، کیا خیال ہے۔" زینب کچھ کہہ کر جیسے پھنس گئی۔
"گھر!" وہ متذبذب سی بولی۔
"کوئی مسئلہ ہے کیا اس میں بھی؟" حیدر کے لہجے میں کچھ تھا۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ایک شخص آپ کے لیے اتنا کچھ بغیر کسی مطلب لالچ مفاد کے کر رہا ہو اور آپ اس کے لیے ذرا سا طبیعت یا مزاج کے خلاف کچھ بھی نہیں سہہ سکتے۔
"ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی گھر مگر کچھ لیٹ ہو جاؤں گی۔" وہ گہرا سانس لے کر ہامی بھرتے ہوئے بولی۔
"نو پرابلم میں یوں بھی آج گھر میں ہوں لیکن پھر بھی تم کوشش کرنا ذرا جلدی آ جاؤ کیونکہ پھر تمہیں گھر جانے کی بھی جلدی ہوتی ہے، کشف کی وجہ سے۔" وہ اسے جتا کر بولا۔
"پھر تو کشف نے کوئی بات نہیں کی منصور سے متعلق؟" خیال آنے پر وہ پوچھنے لگا۔
"ابھی تو نہیں لیکن میں اسے جانتی ہوں۔ وہ اب اس بات کو بھولے گی بھی نہیں، کچھ نہ کچھ تو اس کے دماغ میں چل ہی رہا ہوگا۔" وہ کچھ افسردہ سی کہہ کر رہ گئی۔
"او کے دیکھتے ہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے لیکن زیادہ مناسب یہی بات ہے کہ تم کوشش کرو اس کا کہیں رشتہ دیکھ کر۔"
زینب کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔
"سوری حیدر بھائی! میری کلاس ہے میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔" وہ بات کرتے کرتے ایک دم سے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔
کشف کی طرف اگر کوئی پتھر بھی پھینکے تو وہ پہلے زینب ہی کو آ کر لگے گا اسے اس وقت بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا وہ آنکھوں میں آتی نمی کو پیتی ہوئی اپنا کاپیوں کا بنڈل سمیٹتی وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔
تیز تیز چلنے سے اس کا سانس پھولنے لگا اور قدم بہکنے لگے۔

آنکھیں ہاتھ کی پشت سے رگڑتے ہوئے اس نے سینے سے کھینچ کر سانس لیا اور اردگرد کے راستہ بچانے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ فٹ پاتھ کے کنارے ہی چل رہی تھی اس کا اسٹاپ چند گز کے فاصلے پر تھا۔

"اگر مجھے بعد میں یوں جذباتی ہو کر رونا ہی ہوتا ہے تو کیوں الجھتی ہوں میں اس پاگل عورت سے بھی ... کل بھی ڈاکٹر موحد ..... بے چارے نے آنی کی جان بچائی اور میں نے بجائے اس کا شکر گزار ہونے کے ایک کھانا کھلانے پر ہی اس کے ساتھ اتنی کمینگی کا مظاہرہ کر ڈالا کرتی ہے۔"

اسے شرمندہ ہونے پر خود پر بے پناہ غصہ آنے لگا تھا۔

"پہلے آنی مجھ سے اتنی ناراض ہیں، میں ہر دن ان کے لیے کوئی نئی مشکل پیدا کر رہی ہوں اب اگر عورت آنی کے پہنچنے پر گھر آ کر جھگڑنے لگی ...... اچھا ہے آنی بھی سنجیدہ ہوں کہ یہ گھر چھوڑنے کے بارے میں ویسے اگر ... تو وہ یہاں سے جانے کا نام نہیں لیتیں۔" وہ اب نارمل انداز میں آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر دور آتی بس کو دیکھ رہی تھی۔

اس کی یونیورسٹی جانے والی بس آ رہی تھی۔

وہ تیزی سے بس کی طرف بڑھی خوش قسمتی سے بس میں رش کم تھا اسے سیٹ بھی مل گئی۔

"کیا اب مجھے ڈاکٹر موحد سے معافی مانگنا ہو گی جا کر۔" کوفت بھرے انداز میں ہاتھ میں پکڑے لفافے کھولنے لگی لفافہ کھول کر اس میں سے نکلنے والے چھوٹے سے کاغذ اور ساتھ لکھی تحریر کو دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

☆☆☆

"کس لیے فون کیا ہے تم نے اتنے سالوں بعد کیسے یاد آ گئی تمہیں ہماری ..... میری" سونیا کے کانوں میں اپنی ہی شکایت بھری آواز گونج رہی تھی۔

"اف! کدھر ہے تمہارا دھیان سونیا! ساری چائے کپ میں ڈالنے کے بجائے ٹیبل پر انڈیل رہی ہو۔" آزر کی جھنجھلائی ہوئی آواز میں غصہ بھی تھا سونیا نے گھبرا کر دیکھا۔

وہ واقعی چائے میز پر گرا چکی تھی۔

"ہوا کیا ہے تمہیں؟" آزر کا غصہ بجا تھا۔

"ہونا کیا ہے تو کبھی یہ بتانے کی تھوڑی ... اس کے دل میں تو کنواں سا اندھیرا جس میں دل کی ہر بات دفن کرتی ہے کسی کو تھوڑی بتاتی ہے، شوہر ہو تم اس کے آزر ابھی تک اپنی بیوی کو اتنا بھی نہیں جان سکے ..... یا اس نے تمہیں کبھی اتنا قریب بھی نہیں آنے دیا کہ تم واقعی اسے ... جان سکو۔"

اماں جان کو تو آگ لگانے کے فن میں ملکہ حاصل تھا اتنے شاندار موقع پر وہ کیسے پیچھے رہتیں۔

آزر نے ماں کی بات پر سونیا کو مشکوک نظروں سے گھورا۔

"کچھ بھی اماں جان چکر سا آ گیا تھا کل سے بی پی لو ہے۔" سونیا نے شرمندگی آواز میں بہانہ گھڑا۔

"کیوں کیا تمہیں یہاں کچھ کھانے کو نہیں ملتا؟ تو فروٹ اور جن کھانے پینے کے سامان سے لاد رہے ہو تو تمہارا بی پی کیوں لو ہو گیا؟" ان کے پاس ہر بہانے کا توڑ موجود تھا اور بھی ایسا جس سے شرمندگی کی نئی لہریں پیدا ہو کر سامنے والا اپنی نظروں میں چھوٹا ہو جائے۔

سونیا نے اپنے ہونٹ بہت سختی سے بھینچ لیے تھے وہ مزید کوئی سخت جواب دے کر پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔

"کسی نے منع نہیں کیا دوا کو اب اس کا آفس ... بنا لیا کام۔"

اماں جان اپنا فون بجنے پر اٹھ کر گئیں تو آزر نے دبے لہجے میں سختی سے سونیا سے کہا۔

"آپ کے خیال میں نہیں کہا ہو گا میں نے۔" وہ چڑ کر رہ گئی۔

"سونیا! مجھے تمہارے خیالوں سے کوئی مطلب نہیں ہے اگر وہ آفس جا رہی تھی۔ تم سے یہ معاملہ ہینڈل نہیں ہو پا رہا تو تم سب کچھ مجھ پہ چھوڑ دو، مجھے بلانا تھا میں اسے آفس نہیں جانے دیتا۔" آزر کو یکایک جانے کیا بے اختیاری سی ہوئی تھی رو دار۔ سونیا کو عجیب سے دکھ نے گھیر لیا۔

"ماں باپ ساری زندگی اولاد پر، بیٹیوں پر بھروسا کرتے ہیں جوں ہی وہ جواں ہوتی ہیں گھر کی دہلیز سے باہر قدم دھرتی ہیں ان کے ہر اٹھتے قدم کو شک کی نظر سے دیکھ کر شاید بیٹیوں کو خود ہی کسی غلط قدم پر اکساتے ہیں۔"

وہ آزر کو کوئی بھی جواب دیے بغیر خاموشی سے چائے کا کپ لبوں سے لگا کر گھونٹ لینے لگی۔

آزر کو اس کی خاموشی اپنی انسلٹ لگی تھی۔

"اگر اس لڑکے نے اسے پھر سے بہکا دیا، کچھ ایسا اس کے دماغ میں بھر دیا کہ وہ کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہو جائے تب، تم ماں ہو، تمہیں اس بات کی سنگینی کا احساس کیوں نہیں ہوا سونیا!" وہ ان دیکھے خدشوں سے پریشان ہو رہا تھا۔

پریشان تو سونیا بھی تھی روا کے جانے سے۔ وسوسے اسے بھی ستا رہے تھے کہ اگر روا نے اپنے قدم واپسی کے ... کی طرف نہیں موڑے تو کیا ہو گا اس کا آج گھر کا جانا خدانخواستہ ہمیشہ کے لیے نہیں۔

"لاحول ولاقوۃ۔" اسے خود ہی اپنی سوچوں پر غصہ آیا۔

"اللہ مالک ہے وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی میرا دل کہتا ہے۔"

وہ گویا خود کو اور آزر کو تسلی دیتے ہوئے چائے کا کپ اسی طرح ہاتھ میں لیے کچھ برتن ساتھ میں اٹھا کر باہر نکل گئی۔

وہ شاید آزر کا مزید سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

وہ اس وقت گھر کے کسی تنہا ویران گوشے میں بیٹھ کر اکیلے میں سوچنا چاہتی تھی۔

اتنے سالوں، اتنے زمانوں کے بعد اس نے اپنے بھائی کی آواز سنی تھی۔ اس کا دل جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔

اور یہ کیسا اتفاق تھا کل کشف اس کے بارے میں جاننے کے لیے آئی تھی یہاں اور آج اس کا فون آ گیا۔

وہ گھر کے آخری کمرے کے آخری کونے میں کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ ادھ پیا چائے کا کپ اسی طرح اس کے ہاتھ میں تھا۔

"شاید تم نے کبھی چاہا ہی نہیں کہ میں واپس آؤں۔" منصور کی شکایتی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو اس کے دل میں اضطراب لہریں لینے لگا۔

"میں کیوں چاہوں گی کہ تم نہیں آؤ، میرا اس میں کیا فائدہ۔" اس نے خود سے اور منصور کے شکایتی لہجے سے نظریں چرائی تھیں۔

"فائدہ، نقصان ..... ان سب سے نکل آیا ہوں میں۔" وہ اداس سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اور ان سب سے نکلنے میں تم نے کچھ جلدی نہیں دکھا دی۔" وہ طنزاً بولی تھی بلکہ وہ تو چاہ ہی نہیں رہی تھی کہ وہ مزید بات کرے۔

بات آگے بڑھے۔ اتنی آگے بڑھے کہ منصور کہہ دے وہ واپس آ رہا ہے اس کا دل بلیوں اچھلا۔

"نہیں ..... نہیں۔" بے ساختہ ہی اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ اس نے کپ وہیں کھڑکی کے فریم پر رکھ

دیا۔
باہر لان میں تیز چمکیلی دھوپ چمک رہی تھی۔
آزر کی گاڑی گیٹ سے نکل چکی تھی۔
"میں اسی لمحے سوچ رہی ہوں وہ میرا بھائی ہے اور ہم دونوں اب عمر کی جن منزلوں پر ہیں وہاں نفع و
صلے سے بڑھ کر رشتوں کا موجود ہونا ہی غنیمت ہے۔" اس نے اپنی ہتھیلیاں زور سے مسلیں پھر کشف اور ز
جن مشکل حالات میں زندگی گزار رہی ہیں۔
"نہیں نہیں منصور کو نہیں آنا چاہیے ورنہ ان کی مشکلات کچھ اور بڑھ جائیں گی۔ مجھے منصور کو منع کرنا چا
تھا کہ اسے پاکستان واپس نہیں آنا چاہیے، جہاں اس نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر گزار دی، وہیں باقی کے
کچھ دن بھی بتا دے۔" وہ خود ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔
"لیکن منصور نے تو واپس آنے کے لیے کچھ بھی نہیں کہا اگر اس کے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں بھی ت
میں کیوں اسے یاد کرواتی۔"
"مجھے زینب کو بتانا چاہیے منصور کی کال کے بارے میں۔" وہ جیسے خود سے پوچھ رہی تھی۔
"نہیں نہیں...... زینب سے مجھے کچھ نہیں کہنا اور خاص طور پر کشف کو تو بھنک بھی نہیں لگنی چاہیے منصو
کال تھی۔" اے اماں جان کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی۔
وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

موحد مختلف ڈاکٹرز کے ساتھ صبح سے ہاسپٹل کے وارڈز کے راؤنڈ پر تھا۔
دل کی بیماریوں کا یہ آخری وارڈ تھا جس کا راؤنڈ ختم کر کے وہ اپنے تینوں کولیگز کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ الوداعی جملے بولتے ہوئے اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹس کی طرف جا رہے تھے جب کشف چہرے پر شدید غصہ لیے آندھی طوفان کی طرح اس کے سامنے آگئی تھی لمحہ بھر کو موحد اس کو دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔
اسے پوائنٹ زیرو فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح اچانک اس کے سامنے یہاں آ جائے گی۔
دوسرا لمحہ اس سے بھی زیادہ غیر متوقع تھا۔
اس نے چیک نکال کر سیدھا ڈاکٹر موحد کے منہ پر مارا تھا۔
"کیا سمجھتے ہیں آپ خود کو...... بہت بڑے بہت اونچے انسان ہیں آپ اور آپ کی ناک آپ کے قد سے بھی بڑی ہے۔"
"کشف!" اس کے منہ سے فقط یہی نکل سکا تھا۔
"اتنی اونچی ناک تھی آپ کی اتنا غرور تھا آپ کو اپنے پیسے اپنے اسٹیٹس کا تو کیوں آئے تھے ہمارے گھر نہیں آتے دعوت کھانے ہم نے آپ کی منتیں نہیں کی تھیں اور اس سے بھی گھٹیا پن کہ اس کھانے کا بل بھیج کر آپ نے اپنی گندی ذہنیت اور گھٹیا سوچ..."
"خاموش...... خاموش ہو جائیں آپ...... کوئی حق نہیں پہنچتا یہاں کھڑے ہو کر اس طرح سے میری انسلٹ کرنے کا۔ چلی جائیں یہاں سے۔" وہ زندگی میں بہت کم غصے میں آیا تھا۔
"تو آپ کو حق ہے آپ جس کو چاہیں ذلیل کریں، اپنے پیسے کی شو ماریں، دوسروں کی عزت نفس خودداری کا مذاق اڑائیں۔" جذباتی پن سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
"آپ اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں ہیں ختم سے بہتر ہے۔"

"حواسوں میں تو آپ کو آنا چاہیے دنیا میں سب کچھ فار سیل نہیں ہوتا ہم غریب لوگ ضرور ہیں مگر بے شرم بے غیرت نہیں کہ مہمانوں کو کھانا کھلا کر ان سے پیسے وصول کریں آپ کو بل پے کرنا تھا تو اس شہر میں ہوٹلوں کی کمی نہیں۔"
"اور یہ آپ کی شرم یا غیرت ہوتی ہے کہ مہمانوں کو گھر بلا کر، کھانا کھلا کر انہیں شرمندہ کریں کہ وہ آپ کے پورے چلنے، مہینے کا کھانا کھا گئے...... یہ ہے آپ کی غیرت شرم اور میزبانی۔" کشف کے پاگل پن نے موحد کو بھی میدان میں اترنے پہ مجبور کر دیا، وہ بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ کر وہ سب بول گیا جو شاید وہ مر بھی جاتا تو بھی یہ سب نہ کہتا۔
اور اس کا اندازہ تو بہرحال کشف کو بھی نہیں تھا کہ وہ یوں بدلہ چکائے گا اس نے لمحہ بھر کو اسے لاجواب کر دیا تھا۔
"وہ سب...... سب میں نے آپ سے نہیں کہا تھا اور میں کیوں کہوں گی۔ میری...... ہماری ایسی تربیت نہیں ہوتی کہ......"
"ایکسکیوز می...... جو آپ کی سرشت میں ہے آپ کی نیچر ہے اس کے لیے تربیت کو الزام نہیں دیں کیونکہ تربیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو فطرت کے آگے ہار جاتی ہے۔ آپ کے ساتھ یہی معاملہ ہے تربیت والے تو بے قصور ہیں۔ فرصت ملے کبھی تو بیٹھ کر اس پر سوچیے گا ضرور، کیونکہ نیچر کی یہ زور آوری آپ کو کوئی بہت بڑا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ایکسکیوز می۔" اس نے چند ہی جملوں میں سارا حساب بے باق کر دیا تھا۔
کشف تو جیسے ساکت سی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔
وہ کس صفائی سے زینب کی تعریف کر گیا تھا۔ اور کشف کی اصلیت کو تاڑ گیا تھا۔
مگر یہ ہوتا کون ہے اسے یوں سر عام سب کے سامنے اس طرح سے ذلیل کرنے والا، اس کی فطرت اس کی طبیعت کو یوں نشانہ بنانے والا، وہ طیش میں پھر چیخی تھی۔
"اور آپ کی اصلیت کیا ہے کسی کی ذرا سی بات پر آپ کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ پیسے کے غرور کو اٹھا کر دوسرے کے منہ پر دے مارو، یہ ہے آپ کی اصلیت۔" وہ اس کے پیچھے دور سے چیخی تھی۔
مگر یہ بے فائدہ تھا کیونکہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کاریڈور کے آخری موڑ پر پہنچ کر دوسری طرف نکل گیا تھا۔
ارد گرد کھڑے کچھ لوگ اس کے چلانے کو شاید کوئی مزے کا سین سمجھ کر اسے کھڑے دیکھ رہے تھے۔
ان کے ہونٹوں پر دبی دبی ہنسی بھی تھی اور آنکھوں میں جو کچھ تھا اس کو سمجھنا کشف کے لیے اپنی بے عزتی سے بھی زیادہ ذلت آمیز تھا۔
وہ مزید یہاں رکتی تو شاید اسے دن کی شروعات میں ہی دوسری بار رونا پڑ جاتا اور دونوں بار...... بہرحال وجہ شاید اس کی نیچر ہی تھی عجیب مغرور اجنبی جو اسے آئینہ دکھا گیا۔
وہ بات جو خود آج تک نہیں جان سکی تھی وہ لمحہ بھر میں اس پر آشکار کر گیا اس کے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے مگر اسے یہ من من کے پتھر اٹھا کر جلد سے جلد اس آکورڈ پوزیشن سے نکلنا تھا۔
وہ جانے کے لیے مڑی اور اس کے قدموں میں کاغذ کا وہی ٹکڑا تھا وہ چیک جس کی وجہ سے اس کا دماغ اتنا خراب ہوا کہ وہ موحد سے جھگڑنے پہنچ گئی۔
"ہاں اچھا ہے دکھاتی ہوں ان کو جس شخص کو وہ اتنا پاک نیک فرشتہ سمجھتی تھیں وہ اصل میں یہ ہے دوسروں کی غیرت کا اپنے پیسے کے زور پر مذاق اڑانے والا پھر تو ان کو میرا یقین آ ہی جائے گا۔"
اس نے جھک کر وہ چیک اٹھایا اور مٹھی میں دبا کر دائیں بائیں کہیں بھی دیکھے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

☆☆☆

"خالہ جان یہ کیا سی رہی ہیں آپ۔" زینب عمر رسیدہ صالحہ بیگم کو سلائی مشین پر جھکے دیکھ کر محبت سے کر بولی۔

صالحہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جواب سلام کر کے بے اختیار اس سے لپٹ رہی تھی۔

"آ گیا تمہیں خیال بوڑھی خالہ سے ملنے کا۔ اب بھی نہ آتیں ایک ہی بار پیغام جاتا تو آ جاتیں آخری منہ دیکھنے مری خالہ کا۔" وہ اسے زور سے اپنے ساتھ لپٹا کر بھینچ بھینچ کر پیار کرتے اپنی کانپتی آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"اللہ نہ کرے خالہ جان! کیوں ایسی مایوسی کی باتیں کر رہی ہیں۔" زینب تڑپ کر ان سے الگ ہوتے ہوئے مصنوعی خفگی سے بولی۔

"اللہ کرے..... ایسا ہو جائے اب تو..... میری تو آنکھیں تھک گئی ہیں۔ اس بلاوے کی راہ تکتے تکتے۔" ان کے لہجے میں ان کے دکھ کراہ کر رو لے۔

"کیوں ایسی باتیں کرتی ہیں، کیا ہو گیا ہے، آپ کا سایہ اس گھر پر اس کے مکینوں پر خاص طور پر ہم پر رہے۔"

زینب رونا نہیں چاہتی تھی صالحہ خالہ کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔

"ملنے نہیں بھی آئی تو بھی میرے دل کو یہ یقین بہت پر سکون کرتا ہے خالہ جان کہ شہر کے کسی کونے میرے خالہ میری ماں کی سگی بہن دل سے بغیر کسی دوسری دنیاوی سوچ کے بالکل خالص دعا کرتی ہے میرے لیے دیکھ لیں اس لیے تو زندگی کا بوجھ اتنی آسانی اور خوش دلی سے اٹھاتی چلی جا رہی ہوں رستوں میں خود بخود آسانیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔"

وہ بڑی محبت سے ان کے الجھے بکھرے سفید بالوں کو پیار سے سنوارتے ہوئے کہہ رہی تھی صالحہ بس اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

"تم تو بالکل ملیحہ جیسی ہوتی جا رہی ہو۔" وہ عجیب حسرت اور شفقت بھرے لہجے میں یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے مدھم سے لہجے میں بولی۔

"تو خالہ جان کیوں نہیں ہوں گی بیٹیاں اپنی ماؤں جیسی تو ہو جاتی ہیں بڑے ہو کر ہے نا۔" وہ شوخی سے صرف ان کو خوش کرنے کے لیے ہنس کر بولی۔

"پتا نہیں میری کوئی بیٹی نہیں ہوئی تو شاید یہ تجربہ بھی محسوس کر کے دیکھ لیتی میں۔" وہ سر جھکا کر حسرت سے قمیض کی ادھڑی سائیڈ کو ٹٹولتے ہوئے بولیں۔

"کیوں کیا میں آپ کی بیٹی نہیں ہوں جو آپ نے ایسا کہا۔" وہ جھک کر ان کی ٹھوڑی انگلی سے اٹھا کر مصنوعی ناراضی سے پوچھنے لگی۔

"ہاں بیٹی ہو تم تو یوں مہینوں مہینوں بعد خالہ کو اپنی شکل دکھاتی ہو۔" وہ ناراضی سے اس کا ہاتھ پرے ہٹا کر بولیں۔

زینب کچھ بول ہی نہ سکی۔

"بالکل اماں! اس کی سزا ایسی ہونی چاہیے کہ اب آپ اسے کم از کم دو تین دن تو بالکل جانے نہیں دیں۔" حیدر اندر سے تیار ہو کر آئے تھے۔

سفید شرٹ کے ساتھ براؤن ڈریس پینٹ میں آنکھوں اور چہرے پر گہری سنجیدگی اور زمانے بھر کا تجربہ لیے اس شخص کے چہرے پر گہری اداسی کی چھاپ تھی جو پہلی بار ملنے والے کو بالکل محسوس نہیں ہوتی تھی۔ چھوٹے سے صحن میں ایک طرف کچھ پودوں کے گملے پڑے تھے۔ واشنگ مشین اور عمر رسیدہ کرسیاں، ایک لکڑی میز اور صالحہ بیگم کا تخت جس پر پرانی چادریں اور گدا بچھا تھا صالحہ کا دن کا زیادہ حصہ اس تخت پر گزرتا تھا۔

بوڑھی ہڈیاں اب اس لکڑی کے تخت پر کڑکڑاتی تھیں اس لیے وہ گرمی کے دنوں میں بھی یہ پرانا گدا اس پر بچھائے رکھتی تھیں۔

"تو رکھ لو ناں بیٹا اسے..... بلکہ ایک دو دن کے لیے کیوں عمر بھر کے لیے رکھ لو تم ماں بیٹے کی تو زندگی بھر کی حسرتیں پوری ہو جائیں گی۔ زینب زینب کرتے جن کی زبانیں نہیں سوکھتیں۔" ثمینہ ڈیزائنر کی خوب صورت شرٹ کے ساتھ میچنگ فیشن ایبل ٹراؤزر پہنے بالوں ری باؤنڈنگ کرائے آدھے پشت پر آدھے کندھوں پر ڈالے چمکتا چہرہ لیے ان پر آ کر چھا گئی تھی، تینوں لمحہ بھر کو گنگ سے رہ گئے۔

زینب نے ذرا سنبھل کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا۔

"کیسی ہیں ثمینہ بھابھی؟" وہ حتی الامکان لہجے کو نارمل بناتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کیا دیا ہے تم نے مجھے۔" وہ زینب کے سلام اور سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے حیدر کی طرف مڑی تھی۔

حیدر نے بے ساختہ اپنے لب بھینچ لیے تھے۔

"میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا دوسروں کو دیکھ کر تمہاری..... مجھے سننے کی صلاحیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔" وہ پھر سے اسی زہر بھرے لہجے میں بولی۔

"میں نے پوری تنخواہ تمہیں دے دی ہے صرف پٹرول کے لیے پندرہ سو اپنے پاس رکھے ہیں۔" وہ ضبط کرتے ہوئے تحمل سے بولا۔

"مائی فٹ، تم پندرہ سو رکھو یا پندرہ ہزار مگر تمہاری اس شاندار سیلری میں، میں یہ گھر نہیں چلا سکتی۔" وہ اس طرح چلا کر بولی۔

زینب کا سر جھک گیا۔

صالحہ کانپتے ہاتھوں سے بوسیدہ قمیض کی سلائی کے ٹانکے ادھیڑنے لگیں۔

"میں اور عاصم بھی لگا تا ہوں ثمینہ جتنا مجھ سے ہو سکتا ہے میں کرتا تو ہوں۔" وہ پھر سے اسی تحمل سے کہہ رہے تھے۔

"تو کیا احسان کرتے ہو، ساری دنیا کے لوگ اس طرح گھر چلاتے ہیں۔ سارے مرد گھروں کو چلانے کے لیے کام کرتے ہیں تم کون سا دنیا سے انوکھا کام کر رہے ہو۔" وہ حقارت سے حیدر کو دیکھ کر کہہ رہی تھی۔

زینب نے اضطراب میں اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں کس کر جکڑ لیا اور نیچی نظروں سے ثمینہ کے پیروں میں پڑی برانڈڈ قیمتی چپل کو دیکھا جس کے تلوے بھی ابھی میلے نہیں ہوئے تھے۔ گویا وہ آج یا کل ہی پہنی گئی ہے۔ غیر ارادی طور پر زینب نے اپنے پرانی چپلوں والے پیر سکیڑ کر تخت کے نیچے کر لیے۔

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ میں احسان کر رہا ہوں۔ میں تو صرف بتا رہا ہوں۔" حیدر نے اداسی اور شرمندگی سے جواب دیا۔

"مجھے تمہارے کسی جواب میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں نے تمہیں سترہ دن پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے سز افتخار کی بیٹی کی شادی میں جانا ہے اس کے لیے مجھے گفٹ بھی خریدنا ہے اور اپنی تیاری بھی کرنی ہے۔ تمہاری اس

تنخواہ میں صرف میں ایک عام سا تحفہ اور اپنے لیے کسی عام برانڈ کا سوٹ ہی لے سکوں گی، مگر کیسے چلے گا، تمہیں سوچنا ہوگا۔" وہ قطعی بے لحاظ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"ثمینہ! میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، ان اونچی اونچی فیملی کی شادیوں میں ہمارا کیا کام۔" حیدر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تم یہ کہہ سکتے ہو، تمہارے اندر کا کامپلیکس بول رہا ہے حیدر علی! تمہارے اندر اتنی ہمت نہیں ہے کہ اپنے کنویں سے باہر جھانک بھی سکو تو پھر اپنی کلاس سے نکلنے کا تم تصور بھی کیسے کر سکتے ہو۔" وہ طنز کی ساری حدیں پھلانگ کر بولی۔

"تو مجھے ضرورت بھی کیا ہے، جتنی میری چادر ہے، میں اتنے پاؤں پھیلانے کو ترجیح دوں گا۔" وہ تحمل سے بولا۔

"چادر..... ہونہہ! رومال سے بھی چھوٹی ہے تمہاری یہ چادر حیدر علی! جس سے صرف تم اپنی آنکھیں ڈھک سکتے ہو کہ تم تیزی سے بھاگتی دوڑتی آگے نکلتی دنیا کو دیکھ ہی نہ سکو اور نہ کسی سے مقابلہ کر سکو۔ صرف ایک آسکتا ہے تمہارا یہ سفید پوش رومال۔"

اس کے انداز میں کتنی حقارت، کتنی نفرت تھی یہ ثمینہ بھابھی کی زبان، ان کی نفرت تھی جس کی وجہ سے زینب اپنی سگی خالہ کے گھر سالوں چکر نہیں لگاتی تھی۔

"اب تم کیا چاہتی ہو، میں جتنا کر سکتا ہوں، جتنا لا سکتا ہوں اور کیا کروں؟ کہیں ڈاکا تو نہیں ڈال سکتا۔" حیدر زچ ہو کر بولے۔

"رہنے دو تم جیسے مرد گھر کے شیر ہوتے ہیں، ڈاکا واکا تم سے کیا پڑے گا۔ ہاں کسی ایک آدھ اپنے جیسی کو امپریس کرنے کے لیے خود کو بہت تیس مار خاں شو کرتے ہو۔ تمہاری اصلیت کیا ہے یہ تو صرف میں جانتی ہوں۔" وہ اب دو سیدھا زینب پر وار کر رہی تھی۔

"اماں سمجھا میں اسے، میری برداشت....." حیدر کی برداشت واقعی آخری حدوں کو چھونے لگی تھی۔

"او ہیلو! یہ تمہاری ماں کی پٹاری میں سوائے سڑی بسی نصیحتوں کے اور ہے ہی کیا، جیسی یہ خود ہیں چھتر دل میں لپٹی ویسی ہی ان کی سوچ ہے۔ یہ میری ہمت ہے جو انہیں اپنے گھر میں برداشت کر رہی ہوں ورنہ اب تو اس شہر میں بھی جگہ جگہ اولڈ ہومز کھل چکے ہیں۔"

صالحہ خالہ یوں آنکھیں لگائے "بلاوے" کا انتظار کر رہی تھیں، زینب کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔

"اپنی زبان کو لگام دو ثمینہ! میں بہت برداشت کر رہا ہوں۔" بات ماں پر آئی تو حیدر کو اپنا رویہ سخت کرنا ہی پڑا۔

"کیا مجھ سے بھی زیادہ؟ اس چھوٹے سے گھر میں جس طرح کے جھگڑے اور کمپرومائز میں کر رہی ہوں، اگر تم میری جگہ آ کر رہو تو تم شاید دوسرے ہی دن یا تو اس گھر کو چھوڑ کر بھاگ جاؤ یا خودکشی کر لو۔ یہ میری ہمت ہے جو یہاں رو رہی ہوں۔" وہ وار پر وار کرتی حیدر کو اپنی ہی نظروں میں گراتی چلی جا رہی تھی۔

اور حیدر اس لمحے کو پچھتا رہے تھے جب انہوں نے زینب کو گھر آنے کو کہا تھا۔

"اور سنو! اس رقم سے میں گفٹ اور اپنا ڈریس لوں گی۔ تم گھر کے دوسرے اخراجات کے لیے اپنے آفس سے لون لینا یا جو بھی تمہیں کرنا ہو کرو، یہ میرا ہیڈک نہیں ہے۔"

وہ جاتے جاتے حیدر پر احسان کرتے ہوئے بتا کر جس طرح آئی تھی، اسی طرح اندر چلی گئی۔

زینب علیحدہ خود کو مجرم محسوس کرتے ہوئے شرمندہ سی سر جھکا کر بیٹھی تھی، صالحہ اپنی سلائی ادھیڑنا بھول چکی

تھیں۔

زینب کی قمیص کے پرنٹ میں جانے کون سے پھول پر نظریں جمائے، کانوں میں اٹھتی سائیں سائیں کو جی لگا کر سنے جا رہی تھیں۔

"مجھے چلنا چاہیے حیدر بھائی!" زینب نے بمشکل بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

صحن میں دھوپ بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی تپش بھی۔

"تم نے کھایا بھی کچھ نہیں۔ میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لے کر آتی ہوں، چائے پی لو۔" صالحہ نادم سی بمشکل اٹھنے لگی۔

"پلیز خالہ جان! مجھے کچھ بھی نہیں کھانا، آپ پریشان نہیں ہوں۔ میں نے اسکول سے نکلتے ہوئے چائے کے ساتھ سموسے لے لیے تھے۔ اب ذرا سی بھی خواہش نہیں ہے، آپ سے ملنے کی خواہش تھی، وہ پوری ہو گئی۔ میں اب چلتی ہوں۔"

وہ محبت سے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگاتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"زینب میری بیٹی! تم اتنے عرصے بعد آئی ہو اور یوں بغیر کچھ کھائے پیے جا رہی ہو، مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ شرمندہ سی اسے دیکھ کر کہہ رہی تھیں۔

"میرا اپنا گھر ہے خالہ جان! پلیز کسی تکلف کی ضرورت نہیں، میں پھر آ جاؤں گی، بعد میں آپ کے پاس بہت سارا بیٹھوں گی، کھانا بھی کھاؤں گی اور چائے بھی پلاؤں گی آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنا کر۔" وہ حتی الامکان صالحہ کی دلجوئی کرنا چاہ رہی تھی۔

مگر وہ جانتی تھی اس کی یہ لفاظی، ان کے زخمی دل کے لیے کسی بھی طرح سے مرہم کا کام نہیں دے سکتی مگر پھر بھی۔

حیدر اندر گئے تھے۔

"کشف کو بھی لے آتی ساتھ، میں نے تو اسے کب سے نہیں دیکھا۔" وہ اس کے یہاں موجود رہنے کو طول دینا چاہتی تھیں۔

"آؤں گی لے کر، وہ خود مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہے یونیورسٹی میں مصروف ہوتی ہے۔ اب آخری سمسٹر سے فری ہو جائے گی تو اسے آپ سے ملوانے ضرور لاؤں گی۔" وہ انہیں یقین بھرے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"میرا دل بڑا کڑھتا ہے، تم ہمیشہ یوں ہی جلد آنے کا کہہ کر جاتی ہو اور کئی کئی مہینے نہیں آتیں۔" وہ حسرت و یاس سے کہہ رہی تھیں۔

"مگر کوئی بات نہیں، خوش رہو۔ میری دعائیں ہیں تمہارے ساتھ۔" انہوں نے حیدر کو باہر کی طرف جاتے دیکھ کر جیسے دل کو سنبھال لیا تھا۔

"آ جاؤ زینب! لیٹ ہو رہے ہیں ہم۔" حیدر کسی بھی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا تو زینب بھی صالحہ سے مل کر اس کے پیچھے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

ٹپ ٹپ آنسو روا کی آنکھوں سے نکل کر اس کے ہاتھوں کی پشت پر گر رہے تھے۔ وہ بالکل سیدھی کسی بت کی طرح ساکت بیٹھی بے آواز آنسوؤں سے روئے جا رہی تھی۔

"روا پلیز۔" جبران نے بے قرار ہو کر اسے پکارا۔

روا نے گہری سسکی لی، انہی گیلے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو رگڑ ڈالا۔

"نہیں، جبران میں یہ نہیں کر سکتی۔" وہ جیسے خود کو مضبوط کرتے ہوئے کمپوزڈ لہجے میں اس کی طرف (دیکھتے) ہوئے بولی۔

"کیوں نہیں کر سکتیں، کیا مشکل ہے اس میں۔" وہ تیز لہجے میں بھنا کر بولا۔

"تم اس مشکل کو نہیں سمجھو گے کیونکہ تم میری جگہ نہیں لے سکتے۔ تم میری طرح ایسے ماں باپ کی بیٹی ہو جنہوں نے اپنی حیات کی ساری توانائیاں نچوڑ کر پرورش کیا ہو۔ وہ کون سا لاڈ، وہ کون سا پیار ہو کا ئنات کا جو انہوں نے مجھ پر نہیں لٹایا۔ میرے بچپن سے لے کر آج تک میری وہ کون سی خواہش، کون سی ہوگی جو انہوں نے میرے کہے بغیر پوری نہیں کی اور آج جب بدلہ چکانے کا وقت آیا تو میں انہیں ایسا دوں، نہیں۔"

وہ رات بھر میں خود کو بہت مضبوط کر چکی تھی۔ اپنی رضا، دل کی خوشی کو اس نے رات ہی سولی پر چڑھا دیا تھا بلکہ شاید دفنا بھی دیا تھا کہ ان کے مرنے کا غم بھی اس کے چہرے پر نہیں تھا۔

"تم خوف زدہ ہو ناں۔" وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر بولا۔

"ہرگز نہیں۔ میں کیوں ڈروں گی۔" وہ چیخ کر بولی۔

"تم ڈر رہی ہو مجھ سے، رات بھر میں تمہارے پیرنٹس نے اتنا ڈرا دیا ہے کہ اگر تم نے کسی طرح میرا انتخاب کر لیا تو تمہاری اگلی زندگی جہنم سے کم نہیں ہوگی اور اس جہنم کی تپش تمہاری ساری خوشیوں کو ہمیشہ کے لیے جھلسا دے گی، ایسا ہی ہے نا۔" وہ بہت جما جما کر وار کر رہا تھا، جیسے وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر ہی لے گی۔

روا نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"کتنی محبت کرتے ہو مجھ سے؟" وہ آزردگی سے پوچھ رہی تھی۔

"ابھی بھی شک ہے تمہیں میری محبت پر۔" وہ ترشی سے بولا۔

"شک نہیں، جبران! یقین سا ہو چلا ہے کہ شاید تم نے کبھی مجھ سے محبت کی ہی نہیں۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی، جبران چونکا۔

"تو اپنے باپ کی طرح تم بھی میری توہین کرو گی۔ تم امیر لوگوں کا یہی دل پسند مشغلہ ہے۔" وہ تڑپ کر بولا۔

"اور تم جیسوں کا دل پسند مشغلہ کیا ہے۔" وہ طنز سے بولی۔

جبران نے اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم رات بھر میں اتنا بدل سکتی ہو۔" وہ جیسے بے یقین سا تحمل کر بولا۔

"اگر تم واقعی مجھ سے محبت کرتے، سچی محبت تو مجھے بھی ان راہوں پر چلانے کی ضد نہیں کرتے جہاں پھولوں بھرا راستہ بھی ماں باپ کی ناراضی کے بعد کانٹوں بھری راہ گزر بن جاتی ہے۔" وہ سر جھکا کر افسوس سے بولی۔

"تمہیں ان کانٹوں سے اتنا ڈر لگتا تھا تو روا آذر تم نے مجھے اس رستے کی طرف کیوں بلایا جس کے اختتام سے بہت پہلے تم نے مجھے چھوڑ کر چلے جانا تھا۔" وہ ایک طرف پتھر پر بیٹھ گیا۔

دونوں کسی ویران راستے میں گاڑی روکے کھڑے تھے۔

روا نے اسے بے بسی سے دیکھا۔ اس کا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔

"پلیز، واپس چلو۔" اسے لگا اگر وہ کچھ دیر اور اسے اسی طرح دیکھتی رہی تو اپنا سارا اختیار اس کے حوالے کر دے گی۔

"تمہیں ڈر لگتا ہے مجھ سے۔" وہ طنز سے بولا۔

"انسان کو دوسروں سے نہیں ہمیشہ خود سے ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے کب کہاں کس موڑ پر اس کا اپنا آپ اسے دھوکا دے جائے۔" وہ رک رک کر بول رہی تھی۔ جبران نے اسے چونک کر دیکھا۔

"کیوں خود پر اتنے بند باندھ رہی ہو۔" وہ بے اختیار اٹھ کر اس کے قریب آیا تھا۔ "خود پر اتنا ظلم کرو گی تو کھل کر سانس بھی نہیں لے سکو گی۔ آگے کی زندگی جینا تو بہت دور کی بات ہے۔"

اس نے آہستگی سے اس کے چہرے کے اطراف بکھری لٹوں کو سلجھایا تھا۔

"مت کرو روا اپنے ساتھ، میرے ساتھ یہ سب کچھ۔ ہم صرف نکاح کریں گے، تم دو چار دن بعد بتا دینا ممی پاپا کو اور میں تم سے وعدہ کرتا ہوں جب تک تمہارے والدین راضی نہیں ہوں گے، ہم رخصتی نہیں کریں گے۔ پلیز اتنا تو مجھے فیور کر ہی سکتی ہو تم۔" اس کی انگلیاں اب روا کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ اس کا لمس اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کرتا چلا جا رہا تھا۔

اس کی آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی۔

اس کا انکار اس کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔

"نہیں رہ سکو گی تم میرے بغیر۔ آگے کی لمبی زندگی صرف ماں باپ کی خوشی کی خاطر جہنم بنا لو گی۔ پلیز مت کرو اپنے ساتھ ایسا، جلد یا بدیر ماں باپ مان جاتے ہیں۔ پھر تمہارے ماں باپ جنہوں نے آج تک تمہاری معمولی سی خوشی کو، ذرا سی خواہش کو رد نہیں کیا۔"

روا اس کی سانسوں کی گرمی سے پگھلتی جا رہی تھی۔

"کیا وہ تمہیں نکاح کے بعد یوں گھر بٹھا دیکھ سکیں گے، انہیں یہیں اس معاشرے میں، اس سوسائٹی میں سروائیو کرنا ہے۔ وہ زیادہ دیر تک، بہت دنوں تک تمہاری خوشیوں سے منہ نہیں موڑ سکیں گے۔" وہ نرم آواز میں اسے سمجھا رہا تھا۔

اور یہ تو سچ تھا روا کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بھی کہ وہ بہر حال جبران کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

اب اس کی بے داغ شرٹ سے اٹھتی روا کی پسندیدہ پرفیوم کی مہک، اس کی قربت، اس کی محبت اور کچھ نہیں تو اپنے دل کی مراد پوری ہو جانے کی بے چینی۔ بس ابھی ہو جائے سب کچھ، یہ شخص بھی اسی گھڑی میرا ہو جائے اور میں اس کی۔

رات بھر اس نے خود پر جو بند باندھے تھے، خود پر جو ضبط کے ضابطے لاگو کیے تھے، جبران کی قربت میں وہ سب جیسے بخارات بن کر اڑتے جا رہے تھے۔

وہ خود کو بہت مضبوط سمجھتی تھی، شاید دنیا کی ہر لڑکی خود کو اسی طرح مضبوط سمجھتی ہے مگر محبت اور لمس کے احساسوں کے سامنے چند ایک ہی ہوں گی جو خود کو بہہ جانے سے، گم ہو جانے سے روک سکتی ہوں گی۔

روا بھی ایک کمزور لڑکی تھی۔

"اگر وہ نہیں مانے تو؟" بہت مدھم، اپنی ہی آواز اسے بہت اجنبی سی لگی تھی۔

"وہ ضرور مانیں گے، جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ہم دونوں نکاح کر چکے ہیں تو ان کے پاس اور میرے گھر والوں کے پاس اور کوئی چوائس نہیں ہوگی۔ ہم دونوں کو ایک کر دینے کے سوا۔"

وہ آہستگی سے اسے اپنے ساتھ لگا کر بڑی چاہ سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتا کہہ رہا تھا۔

"جبران! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ نیم رضامند تھی مگر اپنے ڈر کی آخری بچی ٹوٹتی فصیل کی پناہ لینا چاہتی تھی۔

"میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں روا! یہاں سے ہم ابھی کورٹ میں جا کر نکاح

کریں گے اور وہاں سے سیدھا میں تمہیں لے کر تمہارے گھر جاؤں گا اور انہیں ہم نکاح کے بارے میں بتا[ئیں] گے۔" وہ اسے یوں بتا رہا تھا جیسے یہ خوشی کی خبر سنتے ہی اس کے گھر والے ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈا[لیں] گے۔

"اگر انہوں نے قبول نہیں کیا اور......" وہ پریشان ہونے لگی پھر سے۔

"زیادہ سے زیادہ کیا کریں گے۔ تمہیں گھر سے چلے جانے کا کہیں گے، اگرچہ ایسا ہونے کا چانس ا[یک] فیصد بھی نہیں کیونکہ کچھ بھی ہو ہمارے والدین کو بہر حال اپنی عزت اور دنیا کو منہ دکھانے کا معاملہ اپنی اولاد [سے] بھی بڑھ کر عزیز ہوتا ہے، وہ تمہیں کبھی گھر سے جانے کا نہیں کہیں گے۔"

وہ اسے مطلوبہ ہدف تک لے آیا تھا۔

اور یہ بات تو جبران کے دل میں کہیں نہ کہیں کنڈلی مارے بیٹھی تھی کہ اسے آذر سے اس دن کی توہین کا بد[لہ] بھی لینا ہے اور ساتھ میں اگر روا بھی مل جائے تو اور اسے کیا چاہیے ہوگا۔ وہ اب روا کو ساتھ لگائے گاڑی [میں] بٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

"پلیز ایک اسٹرانگ کافی بھجوا دیں اور میرے روم میں ابھی کسی کو نہیں آنے دیجیے گا، شکریہ۔" اس نے ا[نٹر]کام پر کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

اس کے سر میں شدید درد تھا۔

بار بار وہ منظر اس کی نظروں کے سامنے آ رہا تھا جب کشف نے سب کے بیچ آ کر یوں چیخنا شروع کر د[یا] تھا۔

"اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ اس طرح سے ری ایکٹ کرے گی تو میں کبھی یہ چیک اس کے [پاس] نہیں بھیجتا۔" اسے اب دلی افسوس ہو رہا تھا۔

"اور جب زینب آنٹی کو پتا چلے گا کہ میں نے ان کی معذرت کے بعد بھی کشف کی بکواس کا بدلہ چکانے کے لیے، کھانے کے پیسے بھجوا دیے تو ان کو کتنی تکلیف ہوگی۔ مجھے اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا، کتنی بڑی غلطی ہوگئی مجھ سے۔" عجیب سی پریشان کر دینے والی بے چینی تھی، جس کی کوئی وجہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"جب میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نہ مجھے یہاں کسی سے تعلقات بنانے ہیں، میں یہاں صرف دو چار ماہ مزید ہوں پھر مجھے یہاں سے چلے جانا ہے تو میں کیوں کچھ فضول لوگوں کی فکریں پال کر خود کو ہلکان کر رہا ہوں۔" اس نے کوفت سے سر جھٹکا اور آگے پڑی فائلیں کھول کر ان میں سے ایک کو دلجمعی سے پڑھنا شروع کر دیا۔

"مجھے زینب آنٹی کو پہلے ہی بتا دینا چاہیے، پتا نہیں یہ لڑکی جا کر کیا کچھ اپنے پاس سے مرچ مسالا لگا کر پیش کر دے۔"

اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا تو وہ فون اٹھا کر نمبر ملانے سے خود کو روک نہیں سکا۔

☆☆☆

"روز کی بات ہے یہ تو، تم کیوں شرمندہ ہو رہی ہو۔" حیدر سپاٹ چہرہ لیے سامنے سڑک کو دیکھتا جا رہا تھا۔

زینب پشیمان سی ہتھیلیاں مسل رہی تھی۔

"ثمینہ بھابھی، ایسی کیوں ہیں۔" وہ شرمندہ سے لہجے میں بمشکل ہی بول سکی۔

"تم جیسی ہو، تم ویسی کیوں ہو۔" وہ ایک گہری نظر اس پر ڈال کر سوالیہ انداز میں پوچھ بیٹھا۔

"ہیں تو......" زینب رنجیدہ سی بولی۔

"اس کا جواب تو کسی کے بھی پاس نہیں ہوتا زینب نہ تمہارے پاس نہ میرے پاس میں جیسا ہوں میں ویسا کیوں ہوں۔" وہ افسردگی سے پھیکی ہنسی ہنس کر بولا۔

"ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کوشش کر کے اپنی پرسنالٹی کی کسی ایک آدھ خاص کمزوری پر قابو پانے کی، اسے سدھارنے کی، بہتر بنانے کی کوشش کریں مگر اس پر مکمل اختیار بہت مشکل کام ہے۔ ہے نا۔"

"ہوں!" زینب بے بس سی سر ہلا کر بولی۔

"ثمینہ کو بھی کامپلیکس ہے کہ ہم معاشرے کی مڈل کلاس سے کیوں ہیں۔ اس کی سوچ اس برانڈ کی دوڑ نے، اس کی نام نہاد اپر کلاس دوستوں نے بہت تنگ کر دی ہے وہ اپنے گھر یا فیملی کو سوچنے کے بجائے پہلے خود کو سوچتی ہے کہ اگر میں نے اپنی سو کالڈ دوستوں میں خود کو ایک ماڈرن فیشن زدہ امیر عورت کے طور پر پیش نہیں کیا تو شاید ساری دنیا اسے دھتکار دے، اس پر تھو تھو کرے اور یہ وہ مر کر بھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"یہ تو اچھی بات نہیں ہے، میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ آپ کو انہیں سمجھانا چاہیے۔ ظاہر ہے وہ اندھی تقلید کی جس اسٹیج پر ہیں۔ وہاں سمجھانا الٹا حالات کو مزید بگاڑتا ہے مگر پھر بھی۔ بلال کو بات کرنی چاہیے اپنی ماں سے۔ وہ سمجھدار لڑکا ہے۔" زینب سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

"وہ سمجھدار ہے۔ اس کی ماں تو نہیں۔ بہت ساری ایسی کوششوں اور نتیجے میں جھگڑے اور رونا دھونا دیکھ کر بلال بھی پیچھے ہٹ گیا بلکہ اس نے تو اس گھر سے ہی فرار حاصل کر لی۔ صبح جلدی سے جلدی گھر سے نکل جاتا ہے اور رات کو اکثر میرے بعد ہی گھر آتا ہے۔ بہت فاصلے آ گئے ہیں اس گھر کے مکینوں کے بیچ۔"

وہ سانس بھر کر بے بسی سے خاموش ہوئے تو زینب کو عجیب سی افسردگی نے گھیر لیا۔

"خیر تم پریشان نہ ہو۔ یہ سب تو چلتا ہے۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں اسے بہلاتے ہوئے بولے۔

"اور میں سمجھتی تھی شاید میں ہی زندگی کے سخت ترین موسموں کا سامنا کر رہی ہوں، اکیلی ہوں جو مسلسل اس جبر کو سہہ رہی ہوں۔" وہ کچھ شرمندہ سی بولی۔

"نہیں تم بھی غلط نہیں ہو یہاں ہر شخص کی ذاتی الجھنیں کچھ اس نوعیت کی ہیں کہ ہم ان الجھنوں سے نکل کر دوسروں کے حالات جاننے میں دلچسپی — انہیں یکجا ان کو حل کرنے میں کسی کی مدد کرنا بالکل دو متضاد سی باتیں آج کل کے مادہ پرست دور میں ہیں۔"

"اور آپ وہ کون سی گڈ نیوز دینے والے تھے مجھے جو فون پر نہیں سنائی جا سکتی تھی۔" اس وقت جتنی ضرورت تھی فوراً اسے موضوع بدلنے کی، بصد شکر کہ زینب کو وہ موضوع فوراً ہی سوجھ بھی گیا۔

حیدر نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"مجھے لگتا ہے زینب آج کل تمہارے ستارے اچھی چال چل رہے ہیں۔ ساری تو نہیں مگر تمہاری کافی مشکلات کم ہونے والی ہیں۔"

وہ پھر سے اس کے تجسس کو بڑھا کر جیسے انجوائے کرتے ہوئے بولے۔

"پلیز حیدر بھائی! اب بتا بھی دیں اور کتنا میرے صبر کو آزمائیں گے۔ اوہ...... کیا کتاب آ گئی ہے۔" دوسرے لمحے وہ خود ہی جیسے سمجھ کر بولی تو وہ ہنس پڑا۔

"تم بھی نا، کسی سے کم نہیں ہو مگر۔ خوش خبری ہے۔ پوری خبر یہ ہے کہ تمہاری کتاب پبلش ہو گئی ہے اور اس ویک اینڈ کو مقامی ہوٹل میں اس کی رونمائی کی چھوٹی سی تقریب رکھی گئی ہے جس میں ظاہر ہے آپ چیف گیسٹ ہوں گی۔" وہ صرف دیکھ کر رہ گئی۔

"تمہیں خوشی نہیں ہوئی زینب۔" وہ اس کی خاموشی دیکھ کر بولے۔

"مجھے یہ سب نہیں چاہیے حیدر بھائی! آپ جانتے ہیں مجھے اس طرح کی شہرت، خودنمائی نہیں پسند۔" سنجیدگی سے بولی۔

"پاگل ہو تم تو۔ آج کل لوگ جس طرح ذرا سی شہرت، ذرا سے نام کی خاطر کچھ بھی کر گزرنے کے لیے رہتے ہیں۔ اس طرح کی تقریب تو ان کے لیے گولڈن چانس ہوتا ہے، اپنی پہچان، اپنا نام بنانے کے لیے۔" اسے ڈانٹ کر کہہ رہے تھے۔

"ہوتا ہوگا لوگوں کے لیے گولڈن چانس مگر مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں شاعری اور کہانیاں تسکین کے لیے لکھتی ہوں اور چونکہ اس معاشرے میں رہتی ہوں سو ہزار ضرورتوں سے بندھی ہوں تو اگر اس سے میرے کچھ مالی مسائل بھی حل ہو جاتے تو یہ میرے لیے کافی ہے۔"

حیدر تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئے۔

یہ اس شہر میں واحد سر پھری ہوگی جسے شہرت نہیں چاہیے، نام کی طلب نہیں۔ پہچانے جانے کی ... نہیں۔

"پاگل یہاں تو دو چار کہانیاں لکھتے ہیں۔ چار غزلیں اور چار نظمیں تو خود کو خودی کے ٹوپر بٹھا لیتے ہیں میں تو کہتا ہوں خود اپنی پوجا پاٹ شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی دوسرا تو ان کی تعریف کیا کرے گا وہ تو خود اپنا پرچار کرتے ہیں۔ اپنے کام کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہے ہیں کہ وحشت ہونے لگتی ہے۔ اور سوشل میڈیا نے شہرت کی اس بھوک کو کچھ اور بھی بڑھا دیا ہے۔"

وہ بولنے پر آئے تو بولتے چلے گئے۔

"جو بھی ہو لیکن مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں باہر دیکھنے لگی اور چونک گئی۔

"تم کچھ بھی کہو تمہیں تو میں اس تقریب کے لیے اٹھا کر لے جاؤں گا۔" وہ بھی دھمکا کر بولے۔

"یہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔" ان کی گاڑی ضلع کچہری کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔

"مجھے ایک ضروری کام ہے، سوری صرف دس منٹ لگیں گے۔ ایک اہم فارم لینا تھا اور ایک شخص سے ملنا ہے، تم صرف دس منٹ یہاں میرا ویٹ کرسکتی ہو ناں۔" وہ عجلت بھرے انداز میں گاڑی سائیڈ پر پارک کرتے ہوئے کہہ کر باہر کی طرف لپکے۔

مگر زینب ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس کی نظریں کسی کو دیکھتی جا رہی تھیں۔ اور اس کے چہرے پر اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

"شادی! یو مین میرج۔" وہ منہ پھاڑ کر ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔

ایما کے ماتھے پر بل سے پڑے۔ کچھ اس کے منہ سے آتی ڈرنک کی بدبو اتنی تیز تھی کہ ایما کو ابکائی سی آنے لگی۔

"پلیز ....." وہ ناگواری چھپا کر بمشکل بولی۔

"بھئی، یہ تم لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ تم لوگ جب بھی کسی پرابلم کا سلوشن تلاش کرتے ہو وہ میرج ہوتا ہے ہر مسئلے سے فرار کے لیے اکیلا راستہ شادی، کم آن ایما پلیز! اب تو اس اولڈ فیشن سلوشن سے نکل آؤ بے بی۔" اس نے جوش میں آ کر زور سے ایما کو بانہوں میں بھینچا اور چھوڑ دیا۔

ایما کے چہرے کی ناگواری کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

"تم ..... تم میری ہیلپ نہیں کرو گے۔ انکار کر رہے ہو مجھے۔" وہ قطعی لہجے میں اس کے کان میں چیخ کر بولی۔

اردگرد میوزک کا کان پھاڑنے والا شور تھا جس کی دھمک سے دل بیٹھے جا رہے تھے، گولائی میں بنے اسٹیج پر کپلوں کی شکل میں لڑکے لڑکیاں دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔

وہ رقص گاہ میں سے ڈینیل کو بمشکل گھسیٹ کر اس کونے میں لائی تھی جہاں اس کے تئیں شور قدرے کم تھا۔

"بے بی! میں نے انکار کب کیا ہے تمہاری ہیلپ کرنے سے۔" وہ دور کھڑی کیتھی کو دو انگلیوں کی ویل بنا کر جلدی آنے کا سگنل دے رہا تھا۔ جو اس کے انتظار میں کھڑی تھی وہ اب کسی دوسرے لڑکے کی بانہوں میں رقص کرنے لگی تھی۔

"تو ہاں جاؤ ناں شادی کے لیے ہم دونوں۔" ایما اس کو اپنی طرف گھما کر قدرے منت سے بولی۔

"اُفوہ..... شادی..... لیو دس ٹاپک، تم اپنے گھر میں رہنا نہیں چاہتی تمہیں اپنے پیرنٹس سے irritation ہوتی ہے نا۔ ابھی تمہارے پاس پراپر جاب نہیں ہے تو نو پرابلم۔ تم میرے اپارٹمنٹ میں آجاؤ۔ میرے ساتھ صرف جان تو ہوتا ہے اس کی نائٹ شفٹ ہوتی ہے۔ دن میں بھی چھ گھنٹے وہ ایک اور جگہ اوور ٹائم کرتا ہے۔ سمجھو اٹھارہ گھنٹے اپارٹمنٹ مکمل طور پر ہمارے پاس ہی ہوگا۔ اپنا ضروری سامان اٹھاؤ اور آ جاؤ میرے اپارٹمنٹ میں ایگری۔" وہ بڑے جوش میں اسے مسئلے کا سلوشن بتاتے ہوئے پھر سے اسے اپنے ساتھ لگا کر زور سے بھینچتا ہوا کسی جوکر کی طرح اچھلتا اسٹیج کی طرف بڑھ گیا تھا۔

ایمان اپنے بال جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے اس کو دور جاتا دیکھ کر کچھ سوچنے لگی۔ جلتی بجھتی روشنی میں اس کی گردن اور بازو پر بنے بچھو اور مگرمچھ کے ٹیٹوز بہت ایپلنگ لگ رہے تھے۔

"ناٹ اے بیڈ پرپوزل۔" وہ اس کے دور سے چمکتے ڈائی بھورے سرخ بالوں کو دیکھتے ہوئے کچھ سرشار نظروں سے اسے دیکھتی اونچی ہیل پر مہارت سے چلتی اسٹیج کی طرف بڑھی تھی اس نے منہ کا بھونپو بناتے ہوئے ڈینیل کو آواز لگائی اور جوش میں زور سے بازو اوپر کرکے ہلائے تھے۔ اس کی چھوٹی سی سیاہ ستاروں سے بھری شرٹ اس کے دودھیا پیٹ کو چھپانے میں ناکافی پڑ گئی تھی۔

میرو کی آنکھیں بے اختیار جھک گئی تھیں۔

وہ کلب کے اس بالکل تاریک گوشے میں بیٹھا تھا۔

ایما غصے میں گھر سے نکلی تو وہ بھی بغیر کسی خواہش کے گھر سے باہر چلا گیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کلب میں وہ بغیر کسی ارادے یا خواہش کے آیا تھا اور اسے بہت دیر بعد پتا چلا تھا کہ اس کی بیٹی ایمان بھی اس کلب کے اسٹیج پر اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ موجود ہے۔

اور اب جو کچھ وہ دیکھ چکا تھا کیا، بحیثیت باپ کے کچھ اور دیکھنا اس کے لیے باقی رہ گیا تھا دنیا میں۔

تیز چمکیلی بھڑکیلی روشنیوں میں اسے لگا تھا وہ کسی گھپ اندھیرے غار میں قید ہو گیا ہے جہاں سے نہ جانے کا راستہ نظر آ رہا تھا نہ آنے کا۔ اگر وہ ایما کو پھر سے سختی سے، نرمی سے یا کسی اور طریقے سے روکنے کی کوشش کرتا اول تو وہ اس کی بات سنے گی ہی نہیں اور اگر سن لی۔ اور نتیجہ پھر سے کوئی اندھیر اسپل ہوا تو۔

"نہیں ..... بات اب سمجھانے اور بات کرنے کے مرحلوں سے بہت آگے نکل آئی ہے۔" وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔ اس کے آگے برانڈی پڑی تھی جسے کبھی کبھار جب بہت ٹینشن یا ڈپریشن میں ہوتا تو وہ پی لیا کرتا تھا مگر آج تو لگتا تھا اسے کوئی بھی ڈرنک حال سے بے حال نہیں کرنے والا۔ وہ ڈینیل کے ساتھ وحشی بے ہنگم انداز میں ناچتی اچھلتی کودتی ایما کو وہیں چھوڑ کر چپکے سے اس رنگ کے میلے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

"گھر نہیں جاؤ گی تم۔" وہ حیرت زدہ سا اسے دیکھ کر بولا۔

اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے اس علاقے سے وہاں کے رہنے والوں سے، اس ماحول سے سخت نفرت ہے، مجھے لگتا ہے میں جتنا برداشت کر سکتی تھی جتنا ان سب کو سہہ سکتی تھی سہہ چکی ہوں۔ اب اور نہیں۔" وہ غصہ اور تکلیف محسوس ہونے والے انداز میں بولے گئی۔

"آنی کو پتا ہے تم آج گھر نہیں جاؤ گی۔"

کشف نے جواب میں اسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں ظاہر ہے تم اتنی بڑی خوشخبری خود سے تو آنی کو سنا نہیں سکتیں۔" وہ خود ہی سر ہلا کر بولا۔

"تو یوں کرو تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔" وہ کچھ سوچ کر اسے تجویز دیتے ہوئے بولا۔

"تو پھر اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے گھر چلی جاؤں تمہارے گھر جانے سے تو اچھا ہی ہوگا۔" اس نے چڑ کر کہا۔

بلال ایک دم سے چپ کر گیا۔

"اب تمہیں کیا ہوا۔" وہ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں۔" وہ اپنے جوتے کی نوک سے پتھر کو اڑاتے ہوئے بولا۔

"حیدر انکل تو اچھے ہیں نا ایک آئیڈیل باپ۔" وہ اسے جتا کر بولی۔

"البتہ ثمینہ آنٹی...... کچھ اتنی بری بھی نہیں۔" وہ جیسے اسے چھیڑ رہی تھی۔

"اب اس ڈاکٹر کا کیا کرو گی۔" وہ اسے خوبصورتی سے اپنے موضوع سے ہٹاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تعویذ بنا کر فریم کرواؤں گی۔" وہ بھی جل کر بولی۔

"اتنی محبت ہو گئی ان کی نشانی سے۔" وہ ہونٹ دبا کر بولا تو کشف اسے اپنا بیگ مارنے کو دوڑی۔

"تم سے غصے میں تم بالکل آؤٹ ہو جاتی ہو۔ اب تو چوٹ بھی ہوتی جا رہی ہو۔" وہ اپنا کندھا سہلا کر بولا۔

"اس کمزور سے محبت کرنے سے بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔"

وہ سخت بیزاری سے بولی اور بیگ سے چاکلیٹ نکال کر اس کا ریپر کھولنے لگی "تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا دوپہر میں۔" بلال اسے تیزی سے چاکلیٹ کھاتے دیکھ کر بولا۔

"گھر ہی نہیں گئی تو کھانا کیا کسی ہوٹل سے کھاتی، خیر تم میری فکر سے نکل آؤ تم نے کھا لیا تھا کھانا۔" وہ اسے جتا کر پوچھ رہی تھی۔

"سنو میری جاب مستقل ہو گئی ہے۔" خیال آنے پر وہ جوش سے اسے بتانے لگا جواب میں وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"مبارک باد ہی دے دو اور جل ککڑی۔" وہ اس کے اتنے سرسری ردعمل پر کوفت سے بولا۔

"تم نے گھر میں بتا دیا مطلب انکل آنٹی کو۔" وہ شاید اسے چھیڑ رہی تھی۔

"تم بتاؤ گھر جانا ہے یا یونہی سڑکوں پر گشت کرتی رہو گی میں تو تھک گیا ہوں اگر تمہارا پروگرام مزید آوارہ گردی کرنے کا ہے تو پلیز سوری۔" وہ تھکے ہوئے انداز میں اپنی گردن سہلا کر پوچھ رہا تھا۔

کشف کسی سوچ میں گم چاکلیٹ یونہی ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔

☆☆☆

وہ دونوں کوئی فارم لیے پلٹے تو ردا سامنے کھڑی زینب کو دیکھ کر لمحہ بھر کو ششدر رہ گئی۔

یہاں اس خوفناک سچویشن میں کوئی بھی ہو سکتا تھا اس کے ماں باپ حمزہ یا کوئی بھی مگر زینب نہیں۔ زینب کی موجودگی کا تو اس کے دل و دماغ میں کہیں شائبہ بھی نہیں تھا۔

"آنی! آپ یہاں؟" بمشکل وہ لبوں کے درمیان بول سکی تھی۔ کشف کی دیکھا دیکھی سونیا کے تینوں بچے بھی اسے آنی کہتے تھے۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو۔" زینب اسے کڑی نظروں سے گھور کر بولی جواب میں ردا گڑبڑا سی گئی۔

"ایکسکیوز می ہم یہاں آفس کے کچھ ضروری ڈاکومنٹس نکلوانے آئے تھے۔ میں ردا کا کولیگ ہوں اب ہم واپس آفس جا رہے تھے۔ چلیں ردا یا آپ رکیں گی۔" جبران نے آگے بڑھ کر پر اعتماد لہجے میں اس آکورڈ سچویشن سے ردا کو نکالنے کی کوشش کی۔

ردا نے خشک ہونٹوں پر بمشکل زبان پھیر کر سر ہلایا۔

"ہاں...... وہ جاتے ہیں ابھی یہ میری خالہ ہیں۔ زینب آنی۔" وہ اٹک اٹک کر زینب کی ایکسرے کرتی نظروں سے خائف ہو کر کہہ رہی تھی۔

"او خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" جبران نے ردا کو آنکھوں میں وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

"میں آپ کے ڈاکومنٹس دیکھ سکتی ہوں ایک نظر۔" زینب نے اتنا اچانک کہتے ہوئے لفافہ جبران کے ہاتھ سے آہستگی سے لیا تھا وہ فوری طور پر نہ تو ہاتھ کھینچ سکا نہ اسے منع کر سکا۔

ردا کے چہرے کا رنگ ایک دم سے فق ہو گیا۔

"پلیز...... یہ کانفیڈنشل ہے۔ آپ اسے دے دیں کھلی۔" جبران ایک دم سے گھبرا گیا تھا۔

زینب نے کوئی جواب نہیں دیا ایک گہری نظر دونوں پر ڈال کر وہ دو قدم پیچھے ہو کر لفافے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے ردا کو دیکھتی رہی۔

"پلیز آنی۔" ردا کی آنکھوں میں التجا کے ساتھ نمی تھی۔

زینب نے ذرا سا لفافہ کھول کر اندر موجود ڈاکومنٹس پر ایک نظر ڈالی...... دوسرے لمحے وہ ششدر رہ گئی اس کا فون بج رہا تھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھی۔

☆☆☆

عابدہ بیگم نے اپنے اور سونیا کے زیورات نکال کر ان کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔

سونیا نے چائے کا کپ لا کر ایک طرف رکھا اور طاہرہ کے انہماک کو دیکھ کر خود بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔

"آج ردا پر دائن کر کے آئے گی نا۔" وہ ایک جڑاؤ سیٹ ہاتھ میں اٹھا کر اوپر کرتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

"پھر تو رہی بھی اماں جان ظاہر ہے آج تو بتا آئے گی میں نے تو کہا تھا۔"

"اگر وہ لوگ فوراً اس کا ریزیگنیشن ایکسپٹ نہیں کرتے تو وہ چھٹی لے لے گی۔" وہ سرسری انداز میں طاہرہ کے بھاری قیمتی سونے کے کنگن ہاتھ میں لے کر ان کے ڈیزائن دیکھنے لگی۔

"اتنے چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں استعفیٰ قبول نہیں کرتے نہ کریں۔ سیلری نہیں دیتے نہ دیں مگر کل سے وہ آفس نہیں جائے گی۔" وہ قطعی حکمیہ انداز میں بولیں تو سونیا سر ہلا کر رہ گئی۔

"ابھی آتی ہے تو میں بھی اس سے بات کروں گی۔ وہ کل سے آفس نہیں جائے گی۔ بس گھر میں رہ کر شادی کی تیاریاں کرے۔ شائستہ اور سلیمان کے آنے میں دن ہی کتنے ہیں گھر کی پہلی شادی ہے اور تم کون سا روایتی ماں ہو جنہیں بیٹیوں کے جوان ہوتے ہی ان کو رخصت کرنے کی فکر ستانے لگتی ہے کچھ بھی تو پہلے سے تم نے تیار نہیں کیا اب کچھ ہاتھوں ہاتھ خریدنا پڑے گا۔"

سونیا کنگن ہاتھ میں لیے ساکت سی رہ گئی۔

طاہرہ بیگم کے لہجے اور انداز میں کچھ بھی نیا نہیں تھا مگر سونیا کو لگ رہا تھا شاید وہ آج کل کچھ زیادہ زود رنج ہوگئی ہے کسی کی کوئی بھی بات سیدھی اس کے دل پر جا کر لگتی ہے۔

"پہلے سے بنی چیزیں آج کل کی بچیاں کہاں پسند کرتی ہیں اماں۔" وہ پھر بھی آہستگی سے کہہ گئی۔

"میں کپڑے لتے جوتوں کی بات نہیں کر رہی جہیز کی دس ہزار چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نہ فیشن بدلتا ہے نہ زمانہ۔" وہ اسے پھر سے جھاڑتے ہوئے بولیں۔

"میرا فون بج رہا ہے اماں جان میں دیکھتی ہوں شاید آزر کی کال ہوگی۔" فون کی گھنٹی اس وقت اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھی وہ جان چھڑا کر دوڑ پڑے فون کی طرف لپکی۔

کال ریسیو کرتے ہی اسے پتا چلا یہ گھنٹی رحمت کے فرشتے کی نہیں تھی بلکہ بہت بڑی مصیبت کا دعوت نامہ تھی۔

وہ فون کان سے لگائے ساکت کھڑی رہ گئی تھی طاہرہ بیگم اسے پکارتے ہوئے کچھ بولے جا رہی تھیں مگر اسے تو کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

زریں دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دباتے ہوئے کراہ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے وہ منہ میں کچھ بڑبڑا بھی رہی تھی مگر منصور اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

اس کے چہرے پر گہری فکر اور تشویش تھی۔

زریں نے شاید اسے آواز دی تھی مگر اس نے نہیں سنی۔

وہ اٹھ کر پاگلوں کی طرح اسے جھنجوڑنے لگی۔

"فون کرو اسے، بلاؤ یہاں آئے میرے پاس میں اتنی تکلیف میں ہوں اسے یہاں ہونا چاہیے میرے پاس۔" اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے ایما بھی عنقریب ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی کبھی نہ واپس آنے کے لیے...... سن رہی ہو ناں تم" وہ ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کک...... کہاں چلی جائے گی وہ...... کہاں۔" وہ بے یقین سی تھی۔

"ڈینیل کے ساتھ...... اس کا بوائے فرینڈ۔" وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔ زریں نا سمجھی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"وہ ہماری بیٹی ہے یوں تو ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" وہ نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"ہونہہ بیٹی۔" وہ منہ میں بڑبڑایا۔ "جتنی جلدی ہو سکے اس وہم کو کھرچ ڈالو اپنے دماغ سے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"کیا وہ کورٹ میرج کر رہی ہے۔" وہ منصور کی طرف دیکھ کر کچھ گھبرا کر پوچھنے لگی اس نے بے بسی سے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر وہ کیوں جائے گی۔ وہ نہیں جائے گی، کبھی نہیں۔ یوں ہی عادت ہے نا اس کی تو مذاق کر رہی ہوگی تم سے۔" زریں فوری ہنس کر پھر سے بیٹھ کر اپنی کنپٹیاں دبانے لگی۔

"اف یہ درد۔" وہ منہ میں کراہی۔

"ڈاکٹر کی اپائنٹمنٹ لے لوں میں تمہارے لیے۔" وہ گہرا سانس لے کر ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔

"پیا کو کہو کے بس کی بات نہیں ہے" "میری تکلیف کسی کے بھی سمجھ میں آنے والی نہیں۔"

وہ اسے کچھ دیر دیکھتا رہا۔

"سنو زریں! میں نے فیصلہ کیا ہے کیا تم میرا ساتھ دو گی۔" وہ اس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں ... ہوا تھا۔

اسے دیکھتے ہوئے اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"اگر تم اسی طرح صرف میری ضد میں مخالفت کرتی رہو گی تو ہم سب کچھ کھو دیں گے۔ خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کرو اس وقت اس چویشن میں ہمارے پاس اور کوئی آپشن نہیں ہے۔" منصور اسے نرمی بھری ... سے سمجھا رہا تھا۔

وہ پھر سے دھیرے سے نفی میں سر ہلاتی رہی تھی۔

"زریں! ہم ایما کو کھو دیں گے اس معاشرے کی بھول بھلیوں میں جس طرح ہم نے بیٹے کو کھو دیا کیا ... بھی کھو دو گی خود سے دور کرو گی؟" اس کے بغیر کیا زندگی ہوگی ہماری تم سوچ سکتی ہو ایسا کچھ میں...... ایسا ... سوچ کر ہی میرا دل بیٹھنے لگتا ہے، پلیز میرا ساتھ دو ایما کو لے کر چلتے ہیں پلیز۔" وہ سرگوشی میں کہہ رہا ... دیکھے جا رہی تھی۔

☆☆☆

سونیا نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ روا کے منہ پر مارا تھا۔ روا اپنے قدموں سے اکھڑ کر گرنے لگی تھی۔

زینب فاصلے پر کھڑی بے تاثر نظروں سے دونوں کو دیکھ رہی تھی، سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اس ... چہرے پر عجیب پتھر لیے سے تاثرات تھے۔

"بتاؤ...... بتاؤ مجھے کیا کچھ کر آئی ہو اس کے ساتھ۔ تم اس کے ساتھ کورٹ جاتے ہوئے مر کیوں نہ ... اس کے ساتھ منہ کالا کرنے سے بہتر تھا روا تم مر جاتیں۔ میں تمہاری جوان مرگ پر رو لیتی مگر مجھے یہ ... دکھاتیں تم۔" وہ اب وحشیانہ انداز میں اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ رہی تھی۔

روا بے حس کھڑی سونیا کے جھٹکوں پر لڑکھڑاتی مار کھائے جا رہی تھی۔

"کیا چاہتی ہو تم، یہ وہ بکواس کر رہے جو اس نے ابھی کیا نہیں۔" سونیا جب اسے بری طرح ... زینب ترش لہجے میں بولتے ہوئے دونوں کے درمیان میں آ کر کھڑی ہوگئی۔

"تم ہٹ جاؤ بیچ میں سے زینب! یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔" سونیا غصے اور جذبات میں پاگل ہو رہی ...

"نہیں تھا کوئی بھی ایسا معاملہ تم بھی جھیلا گیا، اس وقت تم نے یہ بات کیوں نہیں سوچی اور ... میں نہیں آتی سونیا تو اس وقت نہ تم یہاں کھڑی ہوتیں نہ تمہاری بیٹی اور کیا میں ہمیشہ تمہارے لیے ... رہوں گی اور تم اسی طرح......"

زینب کا بولتے بولتے سانس پھول گیا تھا مگر اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بول رہی ... طرح تم میری بے بسی کا، خلوص کا مذاق اڑاتی رہو گی۔ تماشا بناتی رہو گی خود کو، مجھے یوں اس طرح ...

وہ سونیا کو کندھوں سے پکڑ کر پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔

سونیا ساکت سی اس کے جھٹکے سہتی بالکل گنگ تھی۔

پھر زینب اس کی چپ پر جیسے خود ہی ہوش میں آ گئی۔

رک کر ہونٹ کاٹتی آنکھیں رگڑتی وہ خاموشی سے پلٹ کر باہر جانے لگی۔

"میں کھانا تیار کر رہی ہوں، تم دونوں کھانا کھا کر جانا۔" وہ میکانکی انداز میں کہہ کر ... باہر نکل گئی۔

کے درمیان اس سے پہلے بڑی خوش گوار باتیں ہو رہی تھیں۔

سونیا چند لمحے آنکھیں بھینچے گہرے گہرے سانس لیتی رہی پھر پلٹ کر ساکت کھڑی ردا کو دیکھتی رہی۔

"کیا چاہتی ہو تم، میں جیتے جی مر جاؤں یا پھر میں زہر کھا لوں۔" وہ اس کے پاس دو قدم چل کر غصے میں بولی۔

"میں نہیں جا رہی تھی، نہیں جانا چاہتی تھی اس کے ساتھ مگر......" وہ آنسو ضبط کرتی ہونٹ کاٹ کر بولی۔

"تم بچی ہو ناں، جسے وہ زبردستی اٹھا کر لے گیا۔ تم مجھ سے غلط بیانی کر کے گھر سے گئیں کہ تم آفس جا رہی ہو۔" سونیا کی نظروں میں ردا کے لیے نفرت تھی۔

"میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا آپ سے۔" وہ تلخی سے بولی۔

"تم اپنا یقین، اپنا اعتبار کھو چکی ہو ردا۔" سونیا کے لہجے میں کچھ تھا ردا نے تڑپ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"آج تم نے جو کچھ کر ڈالا ہے، اب تم سونے میں تل کر بھی آ جاؤ تو بھی میرے لیے بے قیمت رہو گی۔ عورت کی قیمت اس کا وزن، اس کے کردار میں ہوتا ہے۔ آج تم میری نظروں میں بے وزن، بے قیمت ہو۔" ردا ششدر سی ماں کو دیکھتی جا رہی تھی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ اماں جان!" آزر کے چہرے کا رنگ اڑ سا گیا۔

"تم اور تمہاری بیوی مل کر مجھے دھوکا دے رہے ہو۔"

طاہرہ بیگم کے چہرے پر شدید طیش اور غیض و غضب تھا۔

"اللہ نہ کرے اماں جان! ہم ایسا کچھ سوچیں بھی۔ کیوں کریں گے ہم ایسا۔" وہ سچ میں پریشان ہو گیا اسے یہ بھی معلوم تھا اس کی ماں کبھی ہوا میں تیر نہیں چلاتی، کوئی نہ کوئی ثبوت ہوتا ہے ان کے ہاتھ میں۔

"سونیا...... سونیا کہاں ہو تم...... کیا سن رہا ہوں میں۔" وہ اونچا اونچا بیوی کو غصے میں پکارنے لگا۔

"تمہاری بیوی گھر پر نہیں ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولیں۔

"کیا مطلب؟" وہ الجھ کر بولا۔

"اس کا بھی مطلب سمجھاؤں میں تمہیں۔" وہ کرختگی سے بولیں، رک کر کچھ سوچنے لگیں۔ "کسی کا فون آیا تھا، دور جا کر سننے لگی اور پھر حواس باختہ سی گھر کی چپل اور دوپٹے میں باہر بھاگ گئی۔"

"کیا...... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ اماں جان۔" آزر کے جیسے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، سونیا ایسا تو کبھی بھی نہیں کر سکتی، اس کا دل متوقع کسی حادثے کے خیال سے بیٹھنے لگا تھا۔

"تم مجھے صرف ایک بات سچ سچ بتاؤ آزر، یہ سارا معاملہ ردا ہی کا ہے ناں، وہ اس شادی کے لیے تیار نہیں۔ یہ اتنے دنوں سے تم تینوں کے درمیان جو کچھ چل رہا ہے، میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ میں پہلے دن سے جانتی ہوں کہ تمہاری لڑکی دفتر میں کسی لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ یوں ہی نہیں وہ بن ٹھن کر ایک سے ایک عمدہ فیشن کا لباس پہن کر آفس جاتی تھی۔"

وہ رک رک کر یوں بول رہی تھیں جیسے اندر، باہر کی ہر بات کی خبر ہو۔

"خدا کے لیے اماں جان! ایسا الزام تو نہیں لگائیں۔" وہ تڑپ کر کراہا تھا۔

"تو کھاؤ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں، ردا کسی لڑکے کو پسند نہیں کرتی اور آج ان کے درمیان کوئی بڑا معاملہ ہونے جا رہا تھا جس کو روکنے کے لیے تمہاری بیوی گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کر دیوانہ وار گھر سے چلی گئی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ چکی تھیں۔

"کھاؤ میرے سر کی قسم! یہ سب جھوٹ ہے۔ اگر سچ ہو تو مجھے یہیں کھڑے کھڑے موت آ جائے۔" وہ اونچی آواز میں بولیں اور آزر ششدر سا اپنا ہاتھ ان کے سر پر رکھے کھڑا رہ گیا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

وہ پانچوں دائرے کی صورت ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ڈنر انجوائے کر رہے تھے۔

عادل کو کھڑکی کی جانب سے آفس کے قریب ہی گھر مل رہا تھا۔ وہ لوگ عنقریب اس گھر میں شفٹ ہونے والے تھے۔ آج کا ڈنر اسی خوشی میں عادل کی طرف سے تھا۔

"یار، ویسے یہ گھر یاد بہت آئے گا ہمیں۔"

عادل نے چکن پیس کو رائتہ میں غوطہ لگا کر دانتوں کی نذر کرتے ہوئے کن انکھیوں سے حیدر کو دیکھ کر اس کے جملے پر غور کیا۔

"ہوں......" ایک لمبا سا پُرسوچ ہنکارا ابھرا۔ "پھر کیا ہوا۔ ایسا کر جگر! تو بھابھی کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز اسی گھر سے کر لے۔ کیا......؟" پھر داد طلب نظروں سے تمام لوگوں کو دیکھا۔

حیدر کے دانتوں میں ایک ہڈی آ کر کڑک کی آواز کے ساتھ انجام کو پہنچی۔ عادل کے جملے نے سخت تکلیف پہنچائی تھی اسے۔

"منحوس آدمی! تیرے منہ میں خاک۔ اللہ نہ کرے جو میں اپنی نئی نویلی زندگی کا آغاز اس گھر سے کروں۔ میں تو یوں ہی ایک بات کر رہا تھا، اچھا، برا وقت گزارا ہے اس گھر میں آخر۔"

"برا...... صرف برا وقت گزارا ہے یہاں۔ اچھا وقت گزارنے تو اپنے اپنے گھر جاتے تھے۔" احسن نے زبان کھولی۔

"اچھا یارو! کوئی مجھے میرے مسئلے کا حل تو بتاؤ۔" عادل کو اچانک ہی وہ بات یاد آ گئی جس نے کئی دن سے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ سو مدد طلب نظروں سے دوستوں کو دیکھا۔

"مسئلہ بیان کیا جائے۔" احسن نے انتہائی سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"یار! بھائی بھابھی پیچھے ہی پڑ گئے ہیں کہ اس ویک اینڈ پر گھر آؤ۔ پانچ، چھ دن سے ٹیلی فون کا تانتا بندھا ہوا ہے۔"

"تو چلا جا۔ گھر ہی بلا رہے ہیں ناں۔ کوئی کشمیر تو نہیں بھیج رہے جہاد کرنے۔ جو تیری جان پر بنی ہوئی ہے۔" کافی دیر سے خاموش محب اللہ نے زبان کھولی۔

"نہیں جانا چاہتا میں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ماں باپ کے بعد میرا گھر میرے لیے اجنبی کر دیا۔ عید، بقر عید میرے جانے پر منہ بناتے تھے۔ فریج لاک کر دیتے تھے کہ کہیں میں کچھ نکال کر نہ کھا لوں۔ میرے پہنچتے ہی ان کے چہروں پر سوال رقم ہو جاتا تھا کہ واپس کب جاؤ گے؟" شدت جذبات سے عادل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"تو پھر اب کیوں اتنی یاد ستا رہی ہے آپ کی؟" انس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"میرے برسر روزگار ہوتے ہی میرا اسٹیٹس بدل گیا ہے۔ یہ میری ذات نہیں ہے، میری نوکری اور اس کے ساتھ ملنے والی مراعات ہیں جنہوں نے

افشین نعیم

یار دل دار



اچانک ہی اتنا اہم بنادیا ہے مجھے۔"

"چلو کسی بہانے ہی، آپ کی اہمیت کا اندازہ تو ہوا ان لوگوں کو۔"

"صرف اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا اور بھی کئی طرح کی فکریں میرے بارے میں ستانے لگی ہیں ان کو۔"

"مثلاً۔" احسن نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ نامعلوم میری کمپنی کس قسم کی ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ میں رہتا ہوں (انگلی سے ان سب کی طرف اشارہ کیا) وہ کس قماش کے لوگ ہیں۔ اصل فکر یہ ہے کہ کہیں ساری تنخواہ ہم لوگوں پر نہ لٹادوں۔" عادل نے کچھ اس انداز سے کمر پہ ہاتھ لگا کر کہا کہ احسن کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"ایسا کر لالے! اس مولوی کے ساتھ ایک سیلفی لے کر بھائی، بھابھی کو بھیج دے۔ اس سے ذرا امپریشن بہتر ہوجائے گا تیرا۔" حیدر بولا۔

اس سے پہلے کہ عادل کوئی جواب دیتا اس کا موبائل گنگنانے لگا۔ جیب سے نکال کر اسکرین دیکھی، بھابھی کالنگ جگمگا رہا تھا۔

"صبح سے کوئی تیسری بار کال آرہی ہے۔ ایک بار بھی ریسیو نہیں کی میں نے۔" عادل نے بے زاری سے موبائل کو دیکھا۔

"فون تو سن لے۔" محب اللہ بولا۔

"میں نہیں سن رہا۔ پھر وہی اصرار ہوگا۔ کل گھر آجاؤ۔" عادل نے سر جھٹکا۔

"یار احسن! ایسا کر فون ریسیو کرکے کہہ دے میں کہیں باہر گیا ہوا ہوں، موبائل گھر رہ گیا ہے۔"

"نہ بابا نا!" احسن نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "میں نے جھوٹ بولنے سے توبہ کرلی ہے۔"

"اچھا، کب سے؟" عادل نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

"آج، ابھی اور اسی وقت سے۔"

"سوچ لے۔ تجھے بھی کبھی ضرورت پڑسکتی ہے۔" عادل نے یاد دلانا چاہا۔

(فون بج بج کر خاموش ہو چکا

"ہوں...... سوچ لیا۔" احسن نے بڑی ایک [illegible] رکھتے فوراً ہی سوچ لیا۔

فون ایک مرتبہ پھر گنگنانے لگا۔

"لا میری بات کرادے۔" حیدر نے [illegible] آگے بڑھایا موبائل لینے کے لیے۔ "میں نے [illegible] نہیں کی جھوٹ بولنے سے۔ ویسے بھی تو نے [illegible] میری خاطر جھوٹ بولا تھا نا میرے خالو سے۔ احسان کا بدلہ احسان۔" کہتے ہوئے حیدر نے عادل [illegible] ہاتھ سے موبائل لے لیا۔

"جی، السلام علیکم۔" حیدر نے سیل فون [illegible] سے لگا کر بولنا شروع کیا۔

"وہ دراصل...... وہ تو کہیں باہر گیا ہوا ہے [illegible] موبائل ادھر ہی چارجنگ پر لگا رہ گیا ہے۔"

"جی، یہ تو نہیں معلوم، کب تک واپس آ[illegible] گا۔ اصل میں کہہ رہا تھا کہ چھٹی کا دن بھائی بھا[illegible] کے ساتھ گزارتا ہے تو بچوں کے لیے کھلونے اور [illegible] دوسری شاپنگ وغیرہ کرنے گیا ہے۔"

عادل کی آنکھیں آخری حد تک پھیل کر با[illegible] آگئیں۔

"کم بخت، میر جعفر۔" زیرلب اور بھی کئی نا[illegible] القابات سے نوازا۔

"جی، جی، میں یاد سے بتادوں گا۔"

"اللہ حافظ۔" فون بند کرکے عادل کی سمت [illegible] بڑھایا۔

"او......" عادل نے اسے گھورا۔ "یار غدار! کیا بکواس تھی یہ؟"

"بکواس نہیں کہتے، بری بات۔ بھابھی بہت تاکید سے کہہ رہی تھیں عادل سے کہنا کھانے پر خصوصی کھانے کا اہتمام کررہی ہوں، گھر ضرور آئے۔"

"میں اس بکواس کی بات کررہا ہوں جو تو فون پر کررہا تھا۔"

"اچھا...... وہ۔ میں نے بتایا تو تھا کہ میں نے توبہ نہیں کی جھوٹ بولنے سے۔ ویسے بھی اس سے

تو بہتر موقع کون سا ہوسکتا تھا تیرا احسان اتارنے کا۔"

حیدر نے آنکھیں پٹپٹاتے کہا۔

عادل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ حیدر کو کچا ہی چبا جائے۔

"اس سے تو بہتر تھا میں موبائل سائلنٹ پر ہی رہنے دیتا۔" عادل افسوس سے ہاتھ مل رہا تھا۔

"چل بس کردے۔ تھوڑا ظرف بڑا کرلے دوسروں کے غلط رویوں کو نظر انداز کرنا ہی اصل [illegible] ہے، جو انہوں نے کیا بھول جا۔" محب اللہ نے اس کے کندھے کو ہلکا سا دباتے ہوئے کہا۔

"بہت آسان ہے نظر انداز کرنا۔ اگر دوسروں نے کیا ہو تو......" عادل نے سر جھٹکا۔

"چل غصہ تھوک دے اب۔ جو ہونا تھا ہو گیا تو جانے کی تیاری کر اور بازار کا چکر لگالے۔" احسن نے اسے مشورے سے نوازا۔

"کیوں؟ بازار کا چکر کیوں لگانا ہے۔ میں بر دکھوے کے لیے جا رہا ہوں؟"

"نہیں بازار کا چکر، بچوں کے کھلونے اور ضروری شاپنگ کے لیے لگالے۔" حیدر نے دانت نکالے۔

"اندر کر دانت، ورنہ توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گا۔" عادل جارحانہ تیوروں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

حیدر نے جلدی سے دانت اندر کیے۔

☆☆☆

"ہیں...... کیا...... کیوں......؟"

وہ سب منہ کھولے عادل کی بات پر ردعمل ظاہر کررہے تھے۔ عادل نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

اور تو اور ازل کا پرسکون اور خاموش محب اللہ بھی حیرت کی زیادتی کے سبب پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا۔

"یعنی کہ...... واقعی......؟" کچھ اس قسم کے تاثرات اس کے چہرے پر لکھے نظر آرہے تھے۔

"بات کیا تھی؟"

صرف اتنی...... کہ عادل کے بھائی نے فون کرکے عادل سے کہا تھا کہ اپنے ساتھ اپنے ان تمام دوستوں کو بھی لے کر آئے جو اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ وہ ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے جنہوں نے برے بھلے وقت میں عادل کا اتنا خیال رکھا۔ تمام لوگ متذبذب تھے۔ عادل کے گھر ان کا کیا کام بھلا؟ مگر عادل بضد تھا۔ جائے گا تو ان سب کے ساتھ جائے گا۔

چاروناچار سب ہی تیار ہوگئے جانے پر۔

☆☆☆

انس اور حیدر اگلی دو سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

ان کے بالکل پیچھے احسن اور عادل تھے۔ محب اللہ کو سب سے آخر میں جگہ ملی تھی، سو وہ ان سے خاصا دور تھا۔ یہی کوئی دو ڈھائی گھنٹے کا سفر تھا۔

سفر تمام ہونے کو تھا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ میں وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے۔ جب عادل کے سیل پر بھائی کی کال آئی۔ وہ عادل کے آنے کا کنفرم کررہے تھے۔

"جی بھائی! بس پہنچنے والا ہوں۔ اچھا سنیں، وہ میرے ساتھ کچھ مہمان بھی ہیں، دوست ہیں میرے، جو میرے ساتھ رہتے ہیں، انہیں بہت اشتیاق تھا آپ لوگوں سے ملنے کا۔ سو ساتھ ہی آرہے ہیں میرے۔"

بات کرکے فون بند کردیا۔

"تو نے ہم سے جھوٹ بولا کہ بھائی نے بصد اصرار ہمیں آنے کے لیے کہا ہے۔" احسن کا غصے کے مارے برا حال تھا۔

"ہاں۔" سکون سے کہتے ہوئے عادل نے کھڑکی سے بھاگتے دوڑتے مناظر کو دیکھا۔

"کیوں؟" اس کا بس نہیں چل رہا تھا عادل کو چلتی گاڑی سے دھکا دے دے۔

"کیوں کہ جھوٹ بولنے سے تو نے توبہ کی ہے، میں نے نہیں۔" اس کے اطمینان میں رتی برابر فرق نہ آیا۔

”تجھے شرم نہ آئی —— ایسا بے ہودہ مذاق ہم سے کرتے ہوئے۔“
”نہیں۔“ عادل کا سکون قابل دید تھا۔
”ابے، کس چیز کا بدلہ لیا ہے تو نے ہم سے۔“ حیدر نے گردن گھما کر عادل کو گھورتے ہوئے کہا۔
”تیرے کل والے جھوٹ کا۔“ عادل نے جتاتی نظروں سے حیدر کو دیکھا۔ حیدر نے جلدی سے منہ آگے کر لیا۔
”اف عادل بھائی۔“ انس کراہا۔ ”ہم اور بن بلائے مہمان۔ اف۔“ صرف ایک محب اللہ تھا جو ہر بات سے بے خبر تھا۔

☆☆☆

وہ سب ایک چھوٹا سا قافلہ محسوس ہو رہے تھے۔
عادل نے کال بیل پر انگلی رکھی۔
باقی سب کو تو کچھ نہ کچھ اندازہ ہو ہی رہا تھا صورت حال کا۔ صرف ایک محب اللہ تھا جو بالکل ہی بے خبر تھا۔
دروازہ عادل کے بھائی نے کھولا۔ خود سامنے سے ہٹ کر ان لوگوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
عادل ان سے بغل گیر ہوا اور باری باری سب سے ان کا تعارف کرایا۔ عادل، بھائی کی معیت میں، ان لوگوں کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ بھابھی عادل سے ملنے کچن سے باہر آئیں اور اتنے بہت سارے لوگ دیکھ کر دوبارہ سے کچن میں گھس گئیں۔
عادل کے بھائی نے کمال ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیگم کو عادل سے ہوئی آخری گفتگو کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی۔
(وہ بدمزگی جو بیس منٹ بعد ہوئی ہے، وہ پہلے سے کیوں ہو بھلا)۔ سو بھابھی تو اتنے بہت سارے لوگ دیکھ کر گھبرا گئیں۔
ان کی نظر سب سے پہلے عادل کے برابر میں کھڑے محب اللہ پر پڑی تھی، باقی کسی کو وہ دیکھ نہ پائیں۔

”ابھی سنتے ہیں.....“ ان کی پاٹ دار آواز پر ہی نہال بھائی باہر کو بھاگے۔ ”یہ عادل تبلیغی والوں کو ساتھ لے کر کیوں آ گیا ہے؟“
انہوں نے اپنا والیوم کم کرنے کی ضرورت ہرگز محسوس نہ کی۔ محب اللہ بے چارہ تو اس تخاطب پر ہی گھبرا سا گیا۔ عادل نے بھرپور لطف اٹھایا ان کے اس جملے کا۔
”تبلیغی جماعت والے نہیں ہیں، دوست ہیں۔ اس کے ساتھ رہتے ہیں وہاں۔“ بھائی کی منمناتی آواز بھی انہوں نے بخوبی سنی۔
”میں ذرا بھابھی سے مل کر آتا ہوں۔“ عادل ڈرائنگ روم سے باہر چلا گیا۔
پیچھے حیدر نے محب اللہ کو عادل کی کہانی پر بریفنگ دی۔ جس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ باورچی خانہ کی آوازیں انتہائی آرام سے ان تک پہنچ رہی تھیں۔
عادل کے سلام کے جواب میں بھابھی نے اس پر چڑھائی کر دی۔
”یہ تمہیں کیا سوجھی جو اتنا لشکر اٹھا کر ساتھ لے آئے ہو۔“
”اصل میں بھابھی! یہ لوگ میرے بغیر رہ نہیں سکتے تو میں اس لیے انہیں ساتھ ہی لے کر آیا کہ بے چارے میرے بغیر کیسے رہیں گے پورا دن۔“ وہ سب چشم تصور سے عادل کی بتیسی دیکھ رہے تھے۔
”تو، میں نے اتنی بڑی فوج کے تو کھانے کا انتظام نہیں کیا ہوا۔“ بھابھی کی آواز اور فشار خون خطرناک حد تک بلند ہوا جا رہا تھا۔
”اصل میں بھابھی! آپ کو اتنی فکر تھی کہ میں کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں تو میں نے سوچا کہ ان کو ساتھ ہی لے آتا ہوں تاکہ آپ کی تسلی ہو جائے کہ اچھی کمپنی ہے میری۔ کوئی ایسے ویسے لوگ نہیں ہیں۔“
”اف ان کے کھانے کا کیا ہوگا؟“ بھابھی کی آواز حلق میں ہی دبی اٹکی ہوئی تھی۔
”مہمان اپنا رزق ساتھ لے کر آتے ہیں بھابھی!“ عادل نے فلسفہ غلط جگہ جھاڑ دیا تھا۔
”اچھا..... تو کہو اپنے مہمانوں سے کہ ذرا نکالیں اپنا رزق، جو ساتھ لے کر آئے ہیں۔“
اور بے چارے مہمان، ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو یہاں سے بس بھاگ جائیں۔
”میں بازار سے کچھ کھانے وغیرہ کا انتظام کرتا ہوں۔“ نہال بھائی کی شرمندہ سی آواز بغیر کسی رکاوٹ ان کے کانوں تک پہنچی۔
”کوئی ضرورت نہیں ہے بازار سے کھانا وانا لانے کی۔“ بھابھی کی پاٹ دار آواز نے در و دیوار ہلا دیے۔
(کچھ امید سی بندھی کہ گھر سے ہی کھانے کا بندوبست ہو جائے گا)۔
”میں چائے بنا دیتی ہوں، پلا کر ان ویلے نکموں کو رخصت کرو۔ غضب خدا کا، ایسے پرائے گھر میں منہ اٹھا کر آ گئے۔ کوئی لحاظ ہوتا ہے، کوئی طریقہ ہوتا ہے۔“
اور منہ اٹھا کر آنے والوں کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔
”بھابھی! جائیں گے تو یہ لوگ میرے ساتھ ہی۔ ایسا کریں میرے حصے کا کھانا دے دیں، ہم سب مل جل کر کھا لیں گے۔“ عادل کی آواز واقعی لطف اٹھاتی ہوئی تھی یا ان لوگوں کو محسوس ہوئی۔
”ارے تو ان کو شرم نہ آئے گی۔ تمہارے حصے کا کھانا چٹ کرتے ہوئے۔“ بھابھی کی آواز میں ایسا طنز تھا جیسے وہ کھانا چٹ کر ہی گئے ہوں۔
”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ایک سے بڑھ کر ایک بے شرم ہیں ہم پانچوں۔“ عادل نے بھابھی کی تسلی کرائی۔
قصہ مختصر..... آخرکار عادل ایک ڈونگا مرغی کا شوربے والا سالن بھابھی سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔
بھائی، بھابھی سے نظر بچا کر دس بارہ روٹیاں تندور سے لے آئے۔
میٹھے میں بغیر چینی سویوں کا زردہ تھا جو ایک ایک نوالہ سب ہی کے حصے میں آ گیا۔
یہ تھا وہ ٹھیک ٹھاک اہتمام جو بھابھی نے عادل کی آمد کی خوشی میں کیا تھا۔ بعد میں بطور عیاشی ان کو ایک ایک پیالی چائے پیش کی گئی۔
”یار چائے اتنی ہی بدذائقہ ہے جتنی کہ تیرے ہاتھ کی ہوتی ہے۔“ احسن نے عادل کے کان میں سرگوشی کی۔
”بھابھی سے ہی ٹریننگ لے کر گیا ہوں۔“ عادل نے جوابی سرگوشی کی۔
کھانا کھاتے ہی وہ واپسی کے لیے پر تول رہے تھے۔ جب عادل نے محب اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
”یار مولوی! ظرف بڑا رکھنا یار! دوسروں کے غلط رویوں کو نظر انداز کرنا ہی اصل جہاد ہے۔ جو کچھ آج یہاں ہوا ہے، وہ بھول جانا۔“ کہہ کر دائیں آنکھ دبائی۔
اور یہ پہلی بار تھا کہ محب اللہ نے اسے مکا دکھایا۔
سچ ہے، کچھ تکلیف کا اندازہ آپ کو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک آپ ان کا سامنا نہیں کرتے۔
عادل نے باہر نکلتے ہوئے ایک الوداعی نظر اپنے گھر پر ڈالی۔
امید تھی آج کے بعد بھابھی کو اس کی فکر بھی نہیں ستائے گی اور اگر کبھی یاد آ بھی گئی تو اپنے یار دلدار تو ساتھ ہیں ہی نا۔
وہ سب واپسی کے لیے قدم بڑھا چکے تھے، جب عادل ان کے ہم قدم ہوا۔
وہ جو یار تھے۔ دل دار تھے۔

☆

مکمل ناول

پلنگ پر سفید پھولوں اور ہرے پتوں والی کڑھائی کی نیلی چادر بچھی ہوئی تھی، جو وہ اپنے بچپن سے دیکھ رہی تھی۔ کثرت دھلائی سے، جس کے سفید پھول، پیلی رنگت اختیار کر گئے تھے۔ جیسے خزاں مستقل ٹھہر گئی ہو ان پر۔ ہرے پتے بھی کچھ خاکستری ہو چکے تھے اور نیلی چادر اب نیلی کم خیالی ہو چلی تھی۔ پلنگ جس دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا، اس پر دادا ابو کی تصاویر سیاہ فریم میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک کی بڑھاپے کی تصویر تھی اور ایک۔ جوانی کی۔

اس کے برابر والی دیوار پر، پوری دیوار کی لمبائی میں شیلف لگا تھا جس پر ایک طرف کچھ پرانے رسالے دو چار کتابیں تھیں۔ دو لمبے لمبے گل دان بغیر پھول کے اور کچھ برتن سجے تھے، دادی کے جہیز کے برتن جنہیں وہ دل و جان سے عزیز رکھتی تھیں۔ تانبے، پیتل، تام چینی اور سفید چینی کی کچھ پلیٹیں اور ہرے رنگ کا شیشے کا جگ اور چار گلاس جن پر پھول بنے ہوئے تھے۔

اسی کمرے میں پلنگ کے سامنے والی دیوار کے ساتھ لکڑی کا ایک صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ جس لکڑی کی پالش اور رنگ دونوں خراب ہو چکے تھے

نعیمہ ناز سلطان

آس پاس



گدیاں کثرت استعمال سے پچک گئی تھیں پھر بھی ابھی تک وہ زیر استعمال تھیں۔ درمیان میں فرش پر جو خالی جگہ تھی، اس پر لکڑی کی میز تھی۔ ایک دیوار پر آیت الکرسی کا طغرہ لگا ہوا تھا، جس کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی پرانی وضع کی تھی، نسبتاً چھوٹی اور لوہے کی سلاخوں والی، جس کے پٹ ہرے رنگ کے تھے۔

اس کمرے کی مستقل مکین دادی شائستہ تھیں، مزاج کے اعتبار سے اپنے نام کے بالکل الٹ۔ ویسے اس گھر کے بیشتر افراد ناموں کے حساب سے ایسے ہی تھے۔ دادی کے بڑے بیٹے جمال صاحب، جن کا ذوق، شوق اور شکل و صورت کے لحاظ سے جمال سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

ان سے چھوٹے کمال تھے، جن کے اندر کمال نام کی کوئی شے نہ تھی، نہ شخصیت، نہ ہنر، نہ فن۔

پھر بڑی بہو فخر النساء۔ وہ دوسری خواتین کے لیے کیا مثال اور فخر بنتیں خود اپنے آپ پر ہی کوئی اعتماد نہ تھا انہیں، بہت ہی دبو، مسکین اور ڈری سہمی۔ ساس اور شوہر کی تابع دار اور جی حضور قسم کی بہو تھیں۔

ان کی دیورانی تھیں فہمیدہ، کام اور عقل دونوں کی پھوہڑ۔ اس کنبے کی زندگی اور طرز زندگی دیکھ کر اگر کہا جائے کہ اس کا باوا آدم ہی نرالا ہے یا یہ کہ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

بڑی بہو بیگم نے کھانے کی ٹرے لا کر ساس کے سامنے رکھی، جو انہوں نے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے ہی وصول کی۔ ابتدا میں فخر النساء نے اپنے جہیز کی میز جو صوفہ سیٹ کے ساتھ کی تھی۔ کھانے کے وقت ان کے پلنگ کے سامنے رکھی اور اس پر بڑے اہتمام سے کھانا لا کر رکھا مگر ساس بیگم تو جیسے بھڑک گئیں۔

"اے ہٹاؤ اسے، جب یہ نہیں تھی تو کیا ہم کھانا نہیں کھاتے تھے؟" انہوں نے کھانے کی ٹرے اٹھا کر چارپائی پر رکھی اور ایک گھٹنا بچھا کر، ایک کھڑا کر کے وہیں کھانا کھانے لگیں۔

"اماں! چادر پر کچھ گر نہ جائے۔" جھجک کر ساس کو کھانا کھاتے دیکھ کر بہو کچھ ڈرتے ڈرتے بولیں۔ وہ شادی کے ابتدائی دن تھے، اس وقت ساس کی حرکتوں اور باتوں سے فقط متردد اور حیران ہی ہوا کرتی تھیں، بعد کے دنوں میں وہ ساس اور شوہر کے مزاج اور زبانوں سے باقاعدہ خائف اور خوف زدہ ہو گئیں اور اب تک تھیں۔

"بی بی! تم فکر نہ پالو، چادر خراب ہوئی تو ہم دھو لیں گے۔ ہاتھ پیروں میں اتنا دم ہے۔ تھوڑی ہیں تمہارے۔ آخر تمہارے آنے سے پہلے بھی تو اس گھر کے کام ہوتے ہی تھے یا اب بیٹے کے بیاہ کے بعد بہو کی محتاج ہو گئے؟"

ساس نے اپنی کراری آواز میں ایسا جھاڑا کہ بہو کی پھر آگے آواز نہ نکلی۔ اب شادی کے بیس سال بعد تک بھی نہیں نکلی تھی، ساس اور شوہر تو تھے ہی غضب کے، کچھ غضب قدرت نے کیا اور اوپر تلے تین بیٹیاں دے دیں اور اولاد نرینہ کوئی نہ دی بلکہ ایک بیٹا ہوا تو تھا مگر چند گھنٹے جی کر فوت ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں کہ گھر کی دنیا کی آبادی بڑھانے کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا، ساس نے اس پر شکر ادا کیا۔

"اے شکر ہے اللہ کا، سلسلہ ختم ہو گیا ورنہ لڑکیوں کی لائن لگ جاتی اس گھر میں۔ تین ہی بہت ہیں، جی کا جنجال۔ انہیں روپیہ چاہیے انہیں بھی ٹھکانے لگانے کے لیے۔"

وہ با آواز بلند خدا کا شکر بھی ادا کرتیں اور ساتھ ساتھ بہو بیگم کو بھی جتا دیتیں اور سنا دیتیں۔ ویسے اس گھر کی رونق اور شور و غل میں ان کی کراری آواز کا بھی بہت عمل دخل تھا۔ اپنے اقتدار کے سنگھاسن (پلنگ) پر بیٹھی بیٹھی وہ پوری سلطنت پر اوپر سے نیچے اور دونوں بہوؤں پر کنیوں سمیت حکومت کر رہی تھیں۔

☆☆☆

برتنوں کا ڈھیر سنک میں جمع ہو گیا تھا۔ اس کے نیچے کا شو کیس بھی ڈھیروں ڈھیر برتنوں سے خالی تھا، پہلے ملیامن کے ڈنر سیٹ کے کچھ برتن نکلے، پھر کی پتیلیاں بھی نکل گئیں۔

"کب آئے گا یہ منحوس؟" بیچ والی نعمت کی جھنجلاہٹ آج تیسرے دن غصے میں بدل گئی تھی۔

"اس بے چارے کا کیا قصور۔ یہ تو ذمہ داروں کی نااہلی ہے۔" سب سے چھوٹی الفت نے سمجھداری کی بات کی۔

"تو ذمہ داروں کے لیے یہ ذرا چھوٹی گالی ہے، وہ تو سب سے بڑے.........."

"ہیں....." نعمت نے غیرت، ضمیر اور جس کے آگے بے لگا کر اپنی گالیوں کا کوٹہ پورا کیا۔

"آدھے سے زیادہ شہر مصیبت جھیل رہا ہے، ہم کوئی انوکھے ہیں؟" سب سے بڑی رحمت نے سوال کیا۔

"سوال یہ ہے کہ کیوں جھیل رہے ہیں مصیبت۔ ہم بھی اور آدھے سے زیادہ شہر بھی۔" رحمت کا سوال زیادہ فکر انگیز تھا اور اس سوال کا جواب ایک عام آدمی سے لے کر کسی بڑے سیاست دان، کسی زیرک، پالیسی میکر اور سوجھ بوجھ رکھنے والا ماہر اپنے اپنے انداز میں دے سکتا تھا مگر اس کا زبانی اور عملی حل۔ وہ ابھی تک کسی کے بس میں نہیں تھا۔

مسئلہ وہی تھا بہت پرانا اور گھمبیر، پانی پہلے ہی بہت کم آرہا تھا۔ بس جیسے تیسے کام چل رہا تھا مگر اب وہ کم بھی گیا۔ تین دن ہو گئے تھے، پانی کا ایک قطرہ نہیں آیا۔ زیر زمین پانی کا ٹینک تقریباً خالی ہو چکا تھا، چھت پر بنی سیمنٹ کی ٹنکی کب کی خالی ہو چکی تھی کہ جس دن سے پانی کا ناغہ شروع ہوا۔ اس دن صبح تک اوپر نیچے دونوں پورشنز میں کپڑے دھلے تھے یہ سوچ کر کہ پانی شام میں آہی جائے گا مگر خواری کا کوئی وقت، مقام اور وجہ تھوڑی مقرر ہے۔

اس شہر کے مکینوں کی خواری اگرچہ ایک معمول ہے، جس کے عادی بھی بن چکے ہیں۔ مگر پھر بھی کبھی کسی نخریلی لڑکی یا بگڑے بچے کی طرح ٹھنک بھی پڑتے ہیں، ورنہ بجلی، پانی، گیس، کچرے کے ڈھیر، ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، ٹریفک کا رش، لوگوں کا ہجوم، ملاوٹی اشیا اور جانے کن کن مسائل کے شکار کراچوی (کراچی) مسائل میں گھرے اور مشکلات سے نبرد آزما زندگی گزار ہی رہے ہیں۔ اسی دوران مسکرا بھی لیتے ہیں، ہنس بھی پڑتے ہیں اور خوش ہونے کے لیے بھی اپنا دل اور ظرف بڑا کر لیتے ہیں اور کبھی بے طرح غصہ آہی جاتا ہے جیسے ابھی ان لڑکیوں کو آرہا تھا جو بڑی مشکل سے دوچار تھیں۔

بلال میٹھے پانی کا ایک کین کہیں سے بھر لایا تھا، وہ کھانا پکانے اور پینے کے لیے استعمال ہو رہا تھا۔ ایک کین میں کھارا پانی تھا جو صبح منہ پر چھپاکے مارنے اور حوائج ضروریہ سے فراغت میں استعمال ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ پانی خرچ کرنے کی عیاشی کا متحمل کوئی نہیں تھا۔ برتنوں کا ڈھیر بڑھتا جا رہا تھا۔

بورنگ کا پانی پیسے دے کر ٹینک میں ڈلوایا جاسکتا تھا مگر وہاں بھی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔

چوبیس گھنٹے کی لوڈشیڈنگ میں بجلی آنے کے وقفوں میں بورنگ والا موٹر چلا چلا کر پانی دے رہا تھا۔ ابھی تک ان لوگوں کا نمبر ہی نہیں آیا تھا۔ گھر میں پانی بھرنے کا پائپ تھا، وہ ہفتے پہلے چوری ہوگیا۔ بہت آسانی اور آرام سے، مین گیٹ کھلا ہوا تھا۔ سامنے ہی صحن میں ٹینک کے ڈھکن پر پائپ لپٹا ہوا رکھا تھا۔ کوئی بندہ خدا اٹھا کر لے گیا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

دادی کو بھی آہٹ آئی نہ بھنک پڑی کہ گیٹ سے کوئی اندر داخل ہوا ہے ورنہ وہ ذرا ذرا سی آواز یا آہٹ پر فوراً کھڑکی سے باہر صحن میں جھانک کر جائزہ لیتی تھیں، جس کے عین نیچے ان کا پلنگ بچھا تھا۔ اسی کھڑکی کے ذریعے، روشنی، دھوپ، ہوا، آوازیں سب کا داخلہ باآسانی اندر داخل ہوجاتا تھا۔ تو بہرحال پانی بھرنے کے لیے اب یا تو اپنا پائپ لے کر آئیں یا انتظار کریں۔

بے چارہ بلال ہی ذرا بھاگ دوڑ کرلیتا تھا، اپنا پانی بھی بھر لیتا تھا اور دو چار کین نیچے والوں کو بھی لادیتا تھا۔ حمزہ کی تو بس ساری دلچسپی اور محنت کا محور و مرکز باڈی بلڈنگ کلب تھا جہاں پچھلے ایک سال سے پابندی سے محنت کرکے اس نے اپنے مسلز اور سکس پیکس کچھ نہ کچھ تو بنا ہی لیے تھے۔

شارق موبائل کی جان نہیں چھوڑتا تھا یا پھر موبائل اس کی جان نہیں چھوڑتا تھا۔ ہر وقت ٹونٹیاں کانوں میں ٹھنسے موبائل سے آنکھیں چپکا کر رکھتا تھا۔ ان تینوں بھائیوں کے بیچ میں دبلی پتلی نحیف سی کومل تھی، جس کے اوپر ماں اور بھائیوں نے آدھے سے زیادہ کچن کی ذمہ داری ڈال رکھی تھی۔

اچھا تو اب ہم واپس نعمت، رحمت اور الفت کی طرف آتے ہیں جو باورچی خانے میں برتنوں کا ڈھیر دیکھ دیکھ پیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ پانی آنے کی دعائیں کر رہی تھیں، اس بلا کی گرمی میں جب ہر دو گھنٹے بعد بھی نہانے سے سیری نہیں ہوتی، … ہونے کی وجہ سے نہائے ہوئے دو دو دن گزر جاتے تھے۔

ڈھائی گھنٹے کی معمول کی لوڈشیڈنگ کے … بجلی کی دوبارہ تشریف آوری ہوئی تھی۔ تینوں … کمرے میں لگے واحد پنکھے کے نیچے بیٹھی خود کو … کررہی تھیں۔ پسینے میں تر بتر تینوں کا برا حال تھا، … وقت ذریز صحن میں ٹینک کا ڈھکن ہٹانے کی آواز آئی … یہ بلال تھا۔

"پانی آ گیا کیا؟" رحمت کمرے سے … آئی۔

"پانی تو نہیں آیا۔ ہمارا نمبر آگیا ہے، … پائپ لگا رہا ہوں۔" بلال نے پائپ کا سرا ٹینک … اندر ڈالا اور ڈھکن ایسے لگایا کہ تھوڑا سا کھلا ہوا … رہیں۔

"مبارک ہو۔ ہمارا نمبر آگیا۔ میں تو … سے پہلے نہاؤں گی۔" رحمت نے پرجوش ہو کر … بہنوں کو اطلاع دی۔

"کھارے پانی سے نہا کر تو اور برا حال ہو… ہے۔" الفت نے ناک سکوڑی۔

"شکر کرو پانی کا بندوبست ہوگیا۔ کھارے میٹھے کے چکر میں مت پڑو، جو ہے اسی سے کام چلاؤ۔" رحمت بی بی نے بہنوں کو نصیحت کی اور ساتھ ہی سوال بھی۔

"برتن کون دھو رہا ہے؟"

"میں دھو رہی ہوں مگر پتیلیاں نہیں مانجھوں گی۔" الفت نے پہلے ہی خبردار کردیا۔

"ٹھیک ہے، میں مانجھ دوں گی، لیکن برتن دھو کر کچن ضرور صاف کردینا۔ ایسے ہی نہ چھوڑ دینا۔" رحمت نے تاکید کی۔

"کیا ہوا امی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے…" نعمت نے بیڈ پر لیٹی ماں کو فکرمند نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں، ٹھیک ہوں۔" وہ آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ ایک تو وہ ویسے بھی خاموش طبع تھیں۔ مگر آج کل تو بالکل ہی چپ ہو کر رہ گئی تھیں۔ نعمت کچھ دیر ان کے پاس کھڑی انہیں تفکر سے دیکھتی رہی پھر وہاں سے ہٹ گئی، وہ ان کی پریشانی کی وجہ سمجھ گئی تھی۔

"پتا نہیں کیا ہوگا؟" پنکھے کے نیچے واپس اپنی پلنگ پر بیٹھ کر وہ پریشانی کے عالم میں اپنا ناخن کترنے لگی، جو اس کی بچپن کی عادت تھی۔

"اللہ میاں کو پتا نہیں یہ کیا سوجھی، ایک لڑکی میں تین لڑکیوں کا وزن دے دیا۔" اپنا پھولا ہوا بے ہنگم سراپا دیکھتے ہوئے اس نے آزردگی سے سوچا۔ رہی سہی کسر سانولی رنگت نے پوری کردی تھی۔ دادی کو اٹھتے بیٹھتے سب سے زیادہ نعمت کی فکر کھائے جارہی تھی۔

"ارے کون کرے گا اس بارہ من کی دھوبن سے شادی۔" وہ باآواز بلند اپنی تشویش کا اظہار کرتیں۔

"کیا پتا کوئی بارہ من کا دھوبی مل جائے۔" الفت اپنی بہن کے کان میں کھس پھس کرتی۔ تینوں ہنس پڑتیں۔ نعمت مزاجاً خوش باش، چٹکلے ہنسانے والی تھی۔ اپنے ڈیل ڈول اور رنگت کو ابھی تک تو اس نے سنجیدگی سے نہیں لیا تھا مگر پرسوں دادی نے جو شوشا چھوڑا تھا۔ وہ کافی سنگین تھا۔ رشتے کرانے والی سے پھپھیوں کا کہہ رکھا تھا، خصوصاً نعمت کے لیے جو ہے، جہاں ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر وہ کسی بھی رشتے کے لیے راضی تھیں جو رحمت کے لیے راضی ہوجائے۔ پرسوں وچولن آئی تھی، نعمت کے لیے ایک رشتہ بتا رہی تھی۔

"اگر کہو تو بلالوں انہیں؟" ساری تفصیلات بتا کر اس نے سوالیہ نگاہوں سے نانی کو دیکھا۔

"ہاں، چھٹی کے دن لے آنا۔ وہ لڑکی دیکھ لیں، پھر ہم بھی دیکھ لیں گے۔" نانی نے ناک سے مکھی اڑائی۔

"اماں! تین بچوں کا باپ ہے وہ۔ نعمت کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟" بہو بیگم نے وچولن کے جانے کے بعد احتجاج کیا۔

"عمر تو کچھ نہیں مگر ڈیل ڈول دیکھا ہے، چھ بچوں کی اماں لگتی ہے۔ کون بیاہنے آئے گا؟ چٹی گوری ہوتی تو پھر بھی کچھ آس بندھ جاتی، رنگ بھی ماشاء اللہ ہے۔ کس کے آسرے پر بٹھاؤں گی۔" دادی نے ان کے منمناتے احتجاج کو ایک طرف کرتے ہوئے الٹا انہیں باتیں سنادیں۔

"مگر اماں……" بہو کے بجائے ایک ماں بن کر بولنے کی ہمت دوبارہ کی مگر دادی نے پھر بات کاٹ دی۔

"ارے آنے تو دو، ابھی سے کیوں ہوا میں تیر چلا رہی ہو۔ کیا خبر بیل منڈھے چڑھتی بھی ہے یا نہیں۔ آج کل تو جوان بچوں کے بڈھے باپ کو بھی لوگ لڑکی بیاہ دیتے ہیں۔ بڑے نخرے ہیں لڑکے والوں کے، چاہے رنڈوا ہو، کئی بچوں کا باپ ہو۔ کیا پتا تمہاری بیٹی کو پسند کریں نہ کریں۔" دادی کی زبان جب فراٹے بھرتی تو رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔

"اللہ کرے نہ ہی پسند کریں۔" امی مایوس ہوکر وہاں سے اٹھ گئیں۔ آوازیں لڑکیوں کے کانوں میں بھی پڑیں۔ لڑکیاں بھی سوچ میں پڑ گئی تھیں، سدا کی لاابالی نعمت بھی فکرمند لگ رہی تھی۔

چھٹی کا دن بھی آہی گیا اور مہمان بھی آگئے۔ امی پریشان لگ رہی تھیں۔ نعمت بھی آج کچھ حواس باختہ سی ہوگئی تھی۔ بات بے بات پر پھوٹ پڑنے والی ہنسی کے سوتے آج خشک تھے۔ تینوں بہنیں کچن میں موجود تھیں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا ہے، امی ابھی تک کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھیں۔

"امی کو بلاؤں؟"

"رہنے دو، خود ہی آجائیں گی۔" رحمت نے الفت کو منع کیا۔

"بہو! ارے بھئی، کہاں ہو؟ مہمان کب سے آئے بیٹھے ہیں۔"

دادی کی پاٹ دار آواز دونوں کمروں کی دیواروں کا سینہ چیرتے ہوئے امی کی سماعتوں تک پہنچ گئی۔ طوعاً و کرہاً وہ اٹھیں، ملگجے کپڑے ویسا ہی دوپٹا جس کی شکنیں برابر کرکے اسے سر پر اوڑھا اور کمرے

سے نکل آئیں۔ دادی کے پاس جانے سے پہلے وہ کچن میں آ گئیں۔

"اوپر دیکھو، کوئی لڑکا ہو تو کولڈ ڈرنک منگوالو۔ گلاس میں ڈال کر لے آنا۔" ان کی مخاطب تینوں تھیں یا شاید کوئی بھی نہیں۔ ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"کچھ اور بھی منگوانا ہے، نمکو، چپس وغیرہ۔"

"نہیں۔" انہوں نے ہاتھ ہلایا اور اسی بے تاثر چہرے کے ساتھ دادی کے کمرے میں چلی گئیں جو بیک وقت دادی کا بیڈ روم اور ڈرائنگ روم دونوں تھا۔

کمرے میں دادی کے علاوہ تین نفوس تھے۔ امیدوار خود اور اس کی دو بہنیں، صیفہ (وچولن) انہیں یہاں پہنچا کر خود واپس چلی گئی تھی، اسے اپنے کام کے سلسلے میں کہیں جانا تھا۔

امی سلام کر کے بیٹھ گئیں، وہ خاموش تھیں۔ دادی بہنوں سے انٹرویو کر کے شجرہ نسب سمیت ہر بات کی معلومات حاصل کر رہی تھیں۔ لب لباب یہ تھا کہ وہ لوگ شیخ تھے۔ ان ہی کے علاقے میں رہتے تھے، گھر اپنا تھا؟ لڑکے کی اپنی دکان تھی، چھوٹا سا جنرل اسٹور، بیوی فوت ہو گئی تھی۔ بچے چھوٹے تھے اور عمر اڑتیس سال بتائی تھی ٹھیک ہی بتائی ہوگی وہ اتنی ہی عمر کا لگ رہا تھا۔ قد کاٹھ اور شکل و صورت اچھی تھی، کپڑے بھی اچھے پہن کر آیا تھا۔ دیکھنے میں کافی معقول اور بھلا لگ رہا تھا، بہنیں بھی گوری گوری اور خوب صورت تھیں۔ دادی کو تو لڑکا اور گھرانہ دونوں فوراً ہی بھا گئے، امی چپ چاپ بیٹھی تھیں، کسی بہن کے پوچھے گئے سوال کا جواب بے دلی سے دے رہی تھیں۔

"بہو! بچی کو بلالو۔" دادی نے بہو بیگم کو مخاطب کیا۔

"جی۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی اور باہر آ گئیں۔

"آجاؤ۔" انہوں نے نعمت کو مخاطب کیا، جو کچھ سراسیمہ دکھائی دے رہی تھی۔

چند لمحے گومگو کی کیفیت میں کھڑے رہنے کے بعد اس نے کولڈ ڈرنک سے بھرے گلاسوں کی ٹرے اٹھائی اور ماں کے پیچھے پیچھے چل دی۔

☆☆☆

گھر میں ایک تو ویسے ہی ہل چل مچی رہتی مگر آج کچھ زیادہ گہما گہمی تھی۔ اکلوتی اور سب سے بڑی پھوپھو (سب سے بڑی سے مراد اپنے دو بھائیوں سے بڑی)۔ ماجدہ پھوپھو بمع اہل و عیال میکے آئی تھیں۔ ایسا خوش نصیب اور تاریخی موقع عید بقر عید پر بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے شوہر اور سارے بچوں کے ساتھ میکے تشریف لائیں لیکن اب وجہ الگ تھی۔ بیٹی کی شادی کر رہی تھیں، تاریخ کی خبر دینے آئی تھیں۔ شادی بھی کوئی زیادہ دیر نہیں تھی مبارک گھڑی فقط دو ماہ بعد تھی۔

ماجدہ پھوپھو دادی کے ساتھ بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ انہیں چٹنی اور پروٹوکول دینے کو ان کی دونوں بھاوجیں بھی موجود تھیں۔ داماد اور لڑکے بھائی تائی کے پاس بیٹھ کر اب اوپر تھے، جہاں تایا صاحب اور ان کے بیٹے مہمانوں کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ نیچے دادی کے کمرے کے علاوہ مہمانوں کے بیٹھنے کی کہیں اور جگہ نہ تھی، ایک کمرہ بڑی بہو کا بیڈ روم تھا۔

دوسرا کمرہ لڑکیوں کا ٹھکانا تھا جہاں اب مہمان اور میزبان لڑکیوں کا قبضہ تھا۔ باتوں اور ہنسنے ہنسانے کے درمیان نعمت اور رحمت باری باری کچن کا چکر لگا کے اپنے اپنے حصے کی کام دیکھ آتیں۔ نعمت نے پلاؤ کے لیے یخنی چڑھائی ہوئی تھی اور رحمت کا چکن قورمہ بھی چولہے پر بس آخری مراحل میں تھا۔ الفت نے فروٹ کسٹرڈ پہلے ہی تیار کر کے فریج میں رکھ دیا تھا۔ اب اسے سلاد اور رائتہ بنانا تھا سو وہ بے فکری اور فرصت کے ساتھ بیٹھی باتیں بنانے اور ہنسنے میں مگن تھی۔

پتا نہیں کتنی ہنسی آتی ہے ان لڑکیوں کو، جہاں اکٹھی ہو کر بیٹھیں، ذرا دیر بعد قل قل کرتے قہقہے باہر

رہتے تھے۔ اس وقت بھی سب کی سب سر جوڑے ہی بیٹھی تھیں، ہی ہی، کھی کھی اور کھی کھی میں لگی ہوئی تھیں۔

ادھر ماجدہ پھوپھو اپنی والدہ ماجدہ کی کلاس لے رہی تھیں۔

"ارے اماں! ابھی کمرے کی چیزیں اور سیٹنگ بدلوالیا کرو۔ اپنے بچپن سے یہی چیزیں اور یہی منظر دیکھ رہی ہوں۔ میرا بھی اب بڑھاپا آ گیا تمہارا دل نہیں اکتاتا برسوں سے وہی سب کچھ دیکھ دیکھ کر۔" پھوپھو اپنے مخصوص انداز میں بول رہی تھیں۔

"پرانے تو ہم بھی ہو گئے ہیں، ہمیں دیکھ دیکھ کر بھی اب بے زار ہو گئے۔ اکتا گئے ہیں، باہر پھنکوا دو ہمیں بھی۔" دادی کو بیٹی کی بات پر ٹھیک ٹھاک تاؤ آ گیا تھا، جھٹ سے شعلہ جوالہ بن گئیں۔

"اب بھی وہی غصہ ہے اماں تمہارا، ناک پر دھرا رہتا ہے۔"

"کیوں نہ دھرے، ہم کیا کسی سے کم ہیں؟ اور ناک آخر ہے کس لیے؟ اونچی رکھنے کے لیے اور غصہ دھرنے کے لیے۔" دادی نے ناک کے استعمال گنوائے اور جملہ حاضرین کی ہنسی نکل گئی۔

"بھابھی! تم ہی یہ سیٹنگ چینج کر دیا کرو۔" پھوپھو کا روئے سخن بڑی بھاوج کی طرف ہوا اور وہ گڑبڑا گئیں۔

"میں کیسے، وہ اماں۔"

"یہ کام تو میرے مرنے کے بعد ہی ہوگا۔ جیتے جی تو ایک [illegible] ہونے دوں گی۔" دادی کا جلال پھر عود آیا۔

"آپا! شادی کی تیاریاں کتنی ہو گئیں، کتنی رہ گئیں؟" چھوٹی بھاوج نے بروقت عقل سے کام لے کر موضوع بدلا۔

"شادی کی تیاری تو آخری دن تک بھی ختم نہیں ہوتی۔ بس ہو رہی ہے۔ روز بازاروں کے چکر لگ رہے ہیں۔ ماشاء اللہ بیٹی کی شادی ہے۔" ماجدہ پھوپھو دادی کو چھوڑ کر بھاوج کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"ہاں یہ تو ہے۔" دونوں بھاوجیں شدومد سے ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگیں۔ جب تک وہ بول رہتی تھیں، دادی خاموش رہتی تھیں اور دونوں بہوؤ دادی سے زیادہ ماجدہ پھوپھو کو سننے میں دلچسپی ر تھیں۔ جو دادی کے بالکل الٹ بہت میٹھی زبان ا میٹھے سجاؤ کی مالک تھیں۔

لڑکیوں کی محفل بدستور جمی تھی۔ اسی دورا نعمت پلاؤ تیار کر کے دم لگا چکی تھی۔ رحمت کا چک قورمہ کب کا تیار ہو گیا تھا، الفت نے سلاد، را بنا کر رکھ دیا تھا۔ بلال روٹیاں لینے گیا ہوا تھا، وہ آجا تو دستر خوان لگ جاتا، اس مختصر وقفے میں اب جلد جلدی باتیں سمیٹی جا رہی تھیں۔

"پھر کیا ہوا؟" سدرہ کا تجسس اپنے عروج تھا۔

"بس، پھر اس آدمی نے خود ہی انکار کر د گوری چٹی، خوب صورت لڑکی چاہیے تھی اسے نعمت کی اب ہنسی نکل رہی تھی اور اس وقت جان رہی تھی جب وہ کولڈ ڈرنک لے کر مہمانوں تک تھی۔

"اوہو، تین بچوں کا باپ اور نخرے دیکھو۔ ا ہوا منع کر دیا خود ہی، ویسے تائی کو ضرورت کیا پڑی ایسے اوٹ پٹانگ لوگوں کو بلانے کی۔" سدرہ ناک سکوڑی۔

"بس، پتا تو ہے تمہیں دادی کے مزاج عادت کا۔ انہیں لگتا ہے کہ میرا رنگ اور ڈیل ڈ دیکھ کر سب بھاگ جائیں گے۔" نعمت خود اپنے ہنسنے کا بھی بڑا حوصلہ رکھتی تھی۔

"جو نصیب میں ہوگا، وہ ٹھہر جائے گا، بھاگ نہیں۔" رحمت نے لقمہ دیا اور ساتھ ہی سب کو اطلا بھی دی۔

"دستر خوان لگا رہی ہوں میں۔" سا لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سب نے مل کر دستر خو لگایا اور کھانے کے لیے سب کو بلالیا۔

کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کر کے ج پھوپھو رخصت ہونے لگیں تو دادی سے مخا

ہو گیا۔

"کچھ دن پہلے سے ہی رہنے آجانا، میں خود آجاؤں گی لینے۔"

"نہ بھئی، ہمیں نہیں اچھا لگتا، بیٹی کے گھر جاکر پڑ جاؤ۔ چاہے خوشی ہو یا غمی، وقت پر جاؤ اور واپس آجاؤ۔" انہوں نے عادت کے مطابق بیٹی کو بھی ٹکا سا جواب عنایت فرمایا۔

"ارے اب یہ سب باتیں کون سوچتا ہے اور دھیان رکھتا ہے۔ اب تو امیں کئی کئی مہینے بیٹی کے گھر رہ کر آتی ہیں۔ کب تک پرانے زمانے میں جیتی رہو گی؟"

"میں آجاؤں اماں لینے کے لیے؟" داماد نے مداخلت کی۔

"اچھا، دیکھیں گے۔ اللہ رکھے وقت تو آنے دو۔" دادی نے نسبتاً رسان سے جواب دیا۔ یہ دنیا کی واحد ہستی تھی، جن سے وہ دبتی یا ڈرتی تو نہیں تھیں، ہاں ذرا لحاظ ضرور کرتی تھیں۔

☆☆☆

شادی کے دن قریب آئے تو پھوپھو بنفس نفیس خود آئیں دادی کو لینے کے لیے۔ ساتھ میں پھوپھا بھی تھے مگر وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ دادی نے بیماری کا بہانہ کرکے بیٹی داماد کو ٹال دیا۔

"ارے میں خود بیماریوں کا گھر ہوں، مجھے کہاں سنبھالتے پھرو گے۔ شادی کا موقع ہے، لڑکیوں کو لے جاؤ۔ کام دام میں ہاتھ بھی بٹائیں گی۔"

"وہ تو جا ہی رہی ہیں اماں! آپ بھی چلتیں تو اچھا تھا۔"

"ایسی بڈھی بیمار نہ ہوتی تو ضرور چلتی۔" دادی نے صاف ہری جھنڈی دکھادی تھی۔ لڑکیاں تو پہلے ہی اس روز سعید کا انتظار کر رہی تھیں۔ جھٹ پٹ اپنا سامان باندھ کر تیار تھیں، ددھیال کی پہلی شادی تھی، سب کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ خوشی خوشی پھوپھو کے ہمراہ چل دیں۔

ان کے گھر وہی روایتی گہما گہمی، پھیلاوا اور مصروفیت تھی جو شادی کے گھروں کا خاصا ہے۔ رات میں گھر پہنچی تھیں، چولہے پر کڑھی پک رہی تھی۔ سب سے چھوٹی ماہم پکوڑوں کے لیے بیسن گھول رہی تھی۔

"ہم کچھ مدد کروادیں؟" سب کی سب کچن میں ہی کاؤنٹر کے پاس کھڑی ہوگئیں۔ اوپن کچن تو کھڑے ہونے کے لیے پورا لاؤنج کافی تھا جس کے ایک سرے پر کچن بنا ہوا تھا۔

"دسترخوان پر کروادینا۔" ماہم نے بیسن پھینٹنا شروع کیا۔

"دسترخوان پر؟" کومل سب کے مقابلے میں ذرا دیر سے سمجھتی تھی۔ بات بھی، مذاق بھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ کھانے میں مدد کروادینا۔" الفت نے سمجھایا۔

"اچھا۔" کومل آنکھیں جھپکا کر رہ گئی۔

پھوپھو کا گھر ان کے گھر کی نسبت کشادہ تھا۔ چار کمرے نیچے، تین اوپر۔ نیچے کے ایک کمرے میں لڑکیوں نے اپنا ٹھکانا بنالیا تھا۔

کڑھی میں بگھار لگ چکا تھا۔ چاول دم پر تھے۔ ماہم نے کچن سے ہی لاؤنج میں بیٹھے تاثیر بھائی کو پکارا۔

"بھائی، پانچ چھ چپاتیاں لادیں۔"

"اچھا، ابھی منگواتا ہوں۔" وہ موبائل میں گیم کھیل رہے تھے۔ اسے آف کرکے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ پانچ منٹ بعد واپس آئے تو ان کے ہمراہ ایک دس بارہ سالہ بچہ تھا۔

"جو منگوانا ہے، اسے لکھ کر دے دو یا سمجھادو۔" بچے کو ماہم کے سامنے کھڑا کرکے وہ پھر سے اپنے موبائل اور گیم میں غرق ہوگئے۔

ماہم نے بچے کو پیسے دیے اور چپاتیوں کی تعداد بتائی۔ وہ پیسے لے کر چلا گیا۔

"یہ کون ہے؟" رحمت بھی ماہم کے ساتھ کچن میں ہی تھی۔

"محلے کا بچہ ہے، قریب ہی ملتی ہیں چپاتیاں۔"

"ارے بچہ؟ تاثیر بھائی خود ہی چلے جاتے۔" رحمت کو حیرت ہورہی تھی۔

"اتنے اچھے نہیں ہیں کہ باہر کے ہر کام کے لیے بھاگے دوڑے جائیں۔ قریب جانا ہو تو پانچ دس روپے دے کر بچوں سے ہی کروالیتے ہیں۔" ماہم نے واضح کردیا۔

"اچھا۔" رحمت خاموش ہوگئی۔ بچے نے ذرا دیر میں چپاتیاں لاکر دے دیں۔

"چل رہی ہو اوپر؟" ماہم ایک ٹرے میں کھانا لارہی تھی۔ پلیٹ میں کڑھی اور ایک چپاتی رومال میں لپٹی ہوئی۔

"یہ کس کے لیے ہے؟"

"دادی کو کھانا دینے جارہی ہوں۔" ماہم نے بتایا تو رحمت کو اچانک یاد آیا۔ یہاں آکر ایک لمحے میں اسے خیال بھی نہیں آیا کہ ماہم لوگوں کی ایک عدد دادی بھی ہیں۔ وہ ماہم کے ہمراہ اوپر چل دی۔

پہلا کمرہ ہی دادی کا تھا۔ ماہم نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئی۔

"دادی! کھانا کھالیں۔" ماہم نے انہیں مخاطب کیا۔ وہ لیٹی ہوئی تھیں، آواز سن کر اٹھ بیٹھیں۔ رحمت جو اب تک کمرے کا جائزہ لے رہی تھی، ان کی طرف متوجہ ہوگئی اور سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! یہ کون ہے؟" انہوں نے غور سے رحمت کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی۔

"رحمت ہے، جمال ماموں کی بیٹی۔" ماہم نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ کر انہیں بیڈ سے نیچے اترنے میں مدد دی۔ کمرے میں ہی ایک طرف چھوٹا سا کچن بنا ہوا تھا۔ کاؤنٹر اور چولہے کے ساتھ ایک عدد سنک بھی موجود تھا۔ دادی نے وہاں سے ہاتھ دھوئے اور بیڈ پر آن بیٹھیں۔

"آپ کیسی ہیں دادی؟" رحمت نے خوش اخلاقی دکھائی۔

"ٹھیک ہیں بھئی، زندہ ہیں۔ تمہاری دادی کیسی ہیں؟" انہوں نے ٹرے میں موجود کھانے پر ایک نظر ڈالی۔

"فریج میں تھوڑے قیمے کریلے رکھے ہیں، ذرا گرم کردینا۔" وہ ماہم سے مخاطب ہوئیں۔

"جی۔" ماہم نے ان کے کمرے میں رکھا چھوٹے سے فریج کا دروازہ کھولا اور اس میں سے کریلے قیمہ نکالا۔ فرائنگ پین میں ڈال کر اسے گرم کیا اور دادی کے سامنے رکھ دیا۔ پانی کی بوتل اور گلاس ان کے قریب رکھا، پھر رحمت سے مخاطب ہوئی۔

"تم بیٹھی ہو یا چل رہی ہو؟"

"میں......" رحمت ابھی کوئی فیصلہ نہ کرپائی تھی کہ دادی بول پڑیں۔

"آجائے گی ابھی، تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔"

"مجھے کام ہے کچن میں۔" ماہم کمرے سے باہر نکل آئی۔

"ہر وقت مصروف ہی رہتی ہیں شہزادیاں، کبھی دو گھڑی یہاں بیٹھنے کا وقت نہیں ملتا۔" دادی سر جھٹکتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"تمہارے گھر میں سب کیسے ہیں؟" انہوں نے دوبارہ سوال کیا۔

"جی ٹھیک ہیں۔"

"دادی تو ابھی زندہ ہے نا تمہاری؟"

"جی۔"

"دراصل ہماری بہو صاحبہ کسی کے جینے مرنے کا بتاتی ہی نہیں، خود ہی ہو کر آجاتی ہیں۔" انہوں نے انکشاف کیا۔

"جی۔" رحمت کے پاس اس ایک لفظ کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں تھا۔

دادی چھوٹے چھوٹے لقمے بناکر کھارہی تھیں، پھر بھی ایک نوالہ بہت دیر تک منہ میں چبانے کے بعد حلق میں اتارتیں۔

"روٹی چبتی ہی نہیں، گولی سی بن جاتی ہے منہ میں۔" پانی کا گھونٹ بھر کر وہ پھر بڑبڑائیں۔

یہ شکایت تو دادی کو بھی تھی مگر وہ اس کا اظہار اتنی خاموشی سے نہیں کرتی تھیں۔ اپنے مخصوص کرارے لہجے میں باآواز بلند کرتی تھیں۔

"اماں باوا ٹھیک ہیں؟"

"جی۔" رحمت نے ایک نظر ان پر ڈالی پھر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اچھا کشادہ کمرہ تھا، ایک طرف اٹیچڈ باتھ روم اور کمرے کے ایک کونے میں چھوٹا سا کچن بھی تھا۔ بیڈ روم فریج ان کے بیڈ کے ساتھ ہی تھا۔ سامنے ایک ڈبل ڈور وارڈ روب، دیوار میں آئینہ لگا ہوا تھا جس کے سامنے دیوار میں ہی ایک اسٹینڈ جڑا تھا اس میں کنگھا، تیل اور کریم اور ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں پڑی ہوئی تھیں۔

"آپ اکیلی رہتی ہیں اوپر؟" رحمت نے بات کرنے کی غرض سے یوں ہی سوال داغ دیا۔ اندازہ نہیں تھا کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال رہی ہے۔

"تمہاری پھوپھو کی مہربانی ہے، ڈال رکھا ہے الگ۔ اچھوتوں کی طرح پڑی رہتی ہوں اکیلی۔ جب ناشتا، کھانا دینے کوئی آئے تو شکل دیکھ لیتی ہوں۔ کسی دن یوں ہی دم نکل جائے گا، خدا جانے نیچے والوں کو کب خبر ہو۔"

بڑی بی پھٹ پڑیں۔ رحمت شرمندہ ہونے لگی، جیسے ساری غلطی سراسر اسی کی ہو۔ وہ نادم ہو کر خاموش ہو گئی۔ بڑی بی کو کچھ احساس ہوا تو نسبتاً نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"تمہیں تو یاد نہ ہو گی اپنی پھوپھو کی شادی؟"

"مجھے؟ نہیں تو؟" رحمت نے حیران ہو کر جواب دیا۔

"کہاں سے یاد ہو گی۔ چھوٹی سی ہو گی تم۔" بڑی بی نے کچھ دیر سوچا پھر یکا یک ہنس پڑیں۔

"اے لو۔ مجھ بڑھیا کی عقل پر بھی پتھر پڑ گئے۔ بھلا بتاؤ تمہیں کہاں سے یاد ہو گا۔ تمہارے باپ اور چچا کا بیاہ تو ماجدہ کی شادی کے بعد ہوا تھا۔ تاشر دو سال کا تھا اور یاسر......؟" وہ پھر رک کر سوچنے لگیں۔

"جب پیدا نہیں ہوا تھا یا پھر ایک دو ماہ کا تھا۔"

کھانے کے دوران وہ رحمت کو قیمتی معلومات کر رہی تھیں۔

"روٹی اور لا دوں آپ کو؟" رحمت نے ہمدردی سے انہیں دیکھا، ان کی چپاتی ختم ہو گئی تھی۔

"نہ، بس ایک ہی روٹی کی خوراک ہے۔ زیادہ کھا لوں تو بدہضمی ہو جاتی ہے یا گیس۔ پھول جاتا ہے، ویسے کڑھی کے ساتھ تو چاول بھی ہوں گے؟"

"جی، جو لوگ چاول نہیں کھاتے ان کے لیے چپاتیاں منگوائی تھیں۔"

"اچھا۔ ایسا کر ایک پلیٹ میں تھوڑے سے چاول لے آ۔ مگر بالکل تھوڑے سے۔ سمجھی۔"

"جی اچھا۔" رحمت نے تابع داری سے سر ہلایا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

نیچے دستر خوان لگ چکا تھا۔

"تم کہاں رہ گئی تھیں، کھانا کھا لو۔" سدرہ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"ہاں، کھا رہی ہوں۔" رحمت اس سے جان چھڑا کر ماہم کے پاس پہنچی۔

"دادی تھوڑے سے چاول مانگ رہی ہیں۔"

"چاول؟" ماہم نے اسے گھورا۔ "نقصان کرتے ہیں انہیں، منع کیا ہے ڈاکٹر نے۔"

"بالکل تھوڑے سے چاہئیں، بس برائے نام۔" رحمت کا دل پسیج رہا تھا مگر ماہم ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"میری جان! تم پریشان مت ہو ان کے لیے۔ وہ ایسے ہی کرتی ہیں، بد پرہیزی کر کے سب کو پریشان کر دیتی ہیں۔ اس وقت گھر میں ویسے ہی اور بہت کام ہیں، انہیں لے کر ڈاکٹروں کے چکر کون لگائے گا۔"

"دو چار نوالوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟" رحمت کو ماہم کی بے حسی پر حیرت ہو رہی تھی۔

"ایک نوالے سے بھی فرق پڑتا ہے۔ چاول ہضم نہیں ہوتے انہیں۔"

"پھر کیا کہوں جا کر ان سے؟"

"کچھ نہیں، کھانا کھا لو بیٹھ کر۔ دستر خوان لگ گیا ہے۔" ماہم نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"مگر یہ تو بری بات ہے، وہ انتظار کر رہی ہوں گی۔" رحمت نے بحث کی۔

"اوفوہ۔" ماہم زچ ہو گئی۔ ایک چھوٹی پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائے۔ "یہ لو۔"

"لاؤ۔" رحمت نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لی اور اوپر چلی گئی۔

"ارے، جیتی رہو۔ میں تو سمجھی بھول گئیں، نہیں آؤ گی۔" بڑی بی اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔

"دادی! آپ کو چاول منع ہیں کیا؟" رحمت نے پلیٹ ان کے سامنے رکھ دی مگر سوال بھی کر ڈالا۔

"ارے ہاں، منع تو کرتے ہیں ڈاکٹر۔ مگر ان ڈاکٹروں کا کیا ہے، سوائے ہر چیز ہی منع کرتے ہیں۔ اب بتاؤ بھلا، انسان کیا ہوا کھا کر جیے؟" انہوں نے چاول پر کڑھی ڈالی۔

"ذرا چمچہ تو لانا۔" انہوں نے رحمت کو مخاطب کر کے کچن کی طرف اشارہ کیا۔ رحمت نے انہیں چمچہ لا دیا۔

"رحمت آپی! امی بلا رہی ہیں۔ کھانا کھا لو۔" پھوپھو کا سب سے چھوٹا گڈو آیا اور پیغام دے کر چلا گیا۔

"تم جاؤ، کھانا وانا کھاؤ۔" دادی نے رحمت کی ہچکچاہٹ بھانپ لی۔

"آپ کھا لیں۔ میں برتن واپس لے جاتی ہوں۔" رحمت نے مروت دکھائی۔

"نہ، میں برتن دھو کر واپس دیتی ہوں تھوڑے بہت ہاتھ پیر بھی نہ چلاؤں تو بالکل ہی ناکارہ ہو جاؤں گی۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

"اچھا، پھر میں چلتی ہوں۔" رحمت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں ہاں جاؤ، جیتی رہو۔" وہ بڑی رغبت سے کڑھی چاول کھانے میں مگن تھیں۔

☆☆☆

رات میں نیند تو کسی کو کیا آئی تھی، باتوں باتوں میں ہی سب نے سحر کر لی پھر علی الصبح جو ساری کی ساری پڑ کر سوئی ہیں تو دوپہر کی خبر لائیں۔ ایک ایک کر کے سب اٹھ گئیں۔

کچن سمیت پورا گھر صاف ستھرا پڑا تھا۔ ماسی اپنا کام ختم کر کے جا چکی تھی۔ الفت اور کومل کچن میں ناشتا بنانے گھس گئیں۔ رحمت ہاتھ منہ دھو کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ کسل مندی ابھی باقی تھی، صوفے پر بیٹھ کر اس نے اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا۔ ویسے تو پھوپھو کا پورا گھر ہی اسے بہت پسند تھا، صاف ستھرا، مختلف آرائشی اشیاء سے سجا ہوا اور سہولتوں سے مزین مگر ڈرائنگ روم اسے خاص طور پر پسند تھا۔ کشادہ اور روشن کمرہ جو قیمتی قالین، پردوں اور جدید وضع کے صوفوں سے سجا ہوا تھا۔ سجاوٹ بہت عمدگی اور نفاست سے کی گئی تھی۔

ہر لڑکی کی طرح رحمت کا بھی خواب تھا ایک صاف ستھرا گھر جس میں علیحدہ ڈرائنگ روم ہو۔ ضرورت کی اشیا ہوں، سہولتیں ہوں مگر اپنے تین کمروں کے چھوٹے سے گھر میں بہت سے خواب فقط خواب ہی تھے۔ بہت سی خواہشیں دل میں ہی مقید دہائیاں دیتی رہتی تھیں مگر ان کا پورا ہونے کا فی الحال کوئی امکان نہ تھا۔

کاش کبھی ہمارے گھر بھی ایسا ہی ڈرائنگ روم ہوتا۔ صاف ستھرا سجا ہوا اور علیحدہ۔ مہمان آئیں اور کمرہ کھول کر بٹھا دو مگر ہمارے ہاں تو آدھے کمرے میں دادی کے پلنگ نے جگہ گھیر رکھی ہے۔ سامنے صوفے لگا کر اسے ڈرائنگ روم کر دیا۔ سوچتے سوچتے اس کے خیالات کی رو پھوپھو کی ساس کی طرف مڑ گئی۔ بے چاری بڑی بی پتا نہیں کیسے اوپر رہتی ہیں، ہماری دادی ہوتیں تو طوفان آ جاتا گھر میں۔ رحمت سوچتے سوچتے خود ہی مسکرا دی۔

"ہیلو میڈم! خیریت تو ہے یوں اس طرح

اکیلے مسکرانا؟" ماہم اچانک ہی اندر آئی تھی، رحمت گڑبڑا گئی۔
"کیا ہوا؟" اس نے بوکھلے پن سے ماہم کو دیکھا۔
"کچھ نہیں فقط یہ کہ ناشتا لگ رہا ہے۔"
"اب تو کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔" رحمت کی زبان پھسلی، قریبی مسجد سے اذان کی آواز آرہی تھی۔
"تو تم کھانا کھالینا۔" ماہم مشورہ دے کر چلی گئی اور اس کے پیچھے پیچھے رحمت بھی چل دی۔ کھانے کے انتظار میں بھوکا رہنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ پیٹ میں چوہے اُدھم مچا رہے تھے۔
ناشتے سے فارغ ہو کر سب مختلف کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ رحمت برتن دھونے کھڑی ہو گئی۔ ماہم جلدی جلدی مسالا بھون کر چکن بنا رہی تھی۔ جن لوگوں نے صبح ناشتا کیا تھا ان کا لنچ تمام ہو گیا تھا۔
سدرہ اور باقی لڑکیاں جہیز کے ملبوسات پیک کرنے بیٹھ گئیں۔ اس کے بعد جوتے چوڑیاں اور جیولری کی باری تھی۔ برتن دھو کر رحمت، پھوپھو کے پاس گئی تا کہ ان سے بازار جانے کا پوچھ سکے۔ انہوں نے کل کہا تھا کہ وہ بازار جائیں گی تو رحمت کو بھی ساتھ لے جائیں گی۔ رحمت اور الفت کو اپنی چھوٹی موٹی خریداری کرنی تھی۔ ان کے کمرے کے قریب پہنچی تو پھوپھا کی آواز آرہی تھی۔ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔
رحمت متذبذب سی باہر ہی ٹھہر گئی حالانکہ پھوپھا کوئی ہٹلر کے رشتہ دار نہیں تھے۔ بڑے خلیق اور متواضع تھے پھر بھی وہ اندر جانے سے جھجک رہی تھی۔
"تھوڑی دیر میں آکر پوچھ لوں گی۔" وہ واپس جانے کے لیے پلٹی۔ اتنے میں پھوپھو کمرے سے باہر آگئیں۔ پرانی اول جلول سی قمیص، بکھرے ہوئے بال، ہاتھ میں ایک پیالی اور برش۔
"ارے رحمت بیٹا! ذرا اندر تو آؤ، اچھا ہوا تم مل گئیں۔ ذرا میرے بالوں میں ڈائی تو لگا دو۔"
پھوپھو کو باہر نکلتے ہی اپنا گوہر مقصود نظر آ گیا انہوں نے فوراً اسے کمرے میں بلا لیا۔
"جی پھوپھو۔" رحمت کے پاس تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔
پھوپھو کرسی پر بیٹھ گئیں وہ پیچھے کھڑی ہو کر ان کے بالوں میں ڈائی لگانے لگی۔ پھوپھا ابھی تک موبائل کان سے لگائے ہوئے تھے۔
"ہاں ہاں اکرام صاحب! [illegible] پوچھ، آپ سے تو کچھ چھپا ہوا نہیں ہے [illegible] سا۔ یوں ہی تو ہوں میں، اس تنخواہ میں مشکل سے ہوتا ہے۔ بس کھا پی رہے [illegible] رہے ہیں۔ ایک بیٹا معذور ہے، دوسرا [illegible] عارضے میں مبتلا ہے۔ بیٹی کی شادی سر پر [illegible] کے لیے بھی پیسہ چاہیے اور شادی کے لیے [illegible] ہمارے مالی باپ ہیں، اچھا کر دیں گے تو [illegible] دعائیں دیں گے۔"
پھوپھا انتہائی فدویانہ انداز میں بات کر رہے تھے۔ پھوپھو کے بالوں میں ڈائی لگاتی رحمت [illegible] ان کی باتیں سن رہی تھی اور حیران ہو رہی تھی۔
رائی کا پربت بنانا اور پرے کو بنانے کا [illegible] پہلی بار عملی طور پر سچ ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تاثیر بھائی کے پیر میں چوٹ لگ جانے کے سبب ہلکا سا لنگ آ گیا تھا۔ جسے پھوپھا نے بڑے آرام سے معذوری کا نام دے دیا تھا۔ ان [illegible] چھوٹے بیٹے کے گردے میں معمولی سی پتھری تشخیص ہوئی تھی مگر ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ آپریشن کی ضرورت نہیں یہ دوائیوں سے ٹھیک ہو جائے گی۔ ان کا یہی علاج چل رہا تھا۔ ہاں سدرہ کی شادی سر پر تھی اور اس مہنگائی کے دور میں شادی کرنا آسان تو نہیں۔ شادی کے لیے تو پیسے بھی [illegible] کر آندھی کے آم اور شادی کے دام۔ ان کی کوئی نہیں، سوچتے سوچتے رحمت کو دادی کا تبصرہ یاد آیا وہ اپنے داماد صاحب پر کرتی تھیں۔
"اے گھنا ہے، جتنا زمین کے باہر ہے اتنا زمین کے اندر۔ اپنا کام نکلوانا خوب جانتا ہے۔ ایسا [illegible]" رحمت کو دادی کی وہ بات آج [illegible] سمجھ میں آئی تھی۔
"اف۔ کیسے کیسے لوگ ہیں دنیا میں۔" اس نے ایک گہری سانس لی اور احتیاط سے اپنا کام کرنے لگی مگر سماعتوں میں پھوپھا کی آواز بخوبی آرہی تھی۔ [illegible] جواب پھوپھو سے مخاطب تھے۔
"امید تو دلائی ہے اکرام صاحب نے کہ کچھ نہ کچھ کر دیں گے۔ میں نے تو صاف کہہ دیا کہ صاحب غریب آدمی ہوں۔ شادی سر پر ہے، مشکلات میں گھرا ہوں، یا تو فرنیچر کا خرچا اٹھالیں یا کھانا [illegible] دیکھو اب کیا کرتے ہیں۔"
"آپ کام ہی کتنا بچا ہے، جو کرنا کرانا ہے ایک دو دن میں کر دیں۔" پھوپھو نے میاں صاحب کو جواب دیا۔
"کل بلایا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ کام ہو جائے گا۔" پھوپھا بیڈ سے نیچے اتر آئے۔ "کمیٹی کا کیا ہوا؟ [illegible] کر لی تم نے۔"
"ہاں ہاں ہو جائے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میرے ہی ہاتھ میں تو ہے کمیٹی۔ لے لوں گی اس ماہ کی، بلکہ سمجھو لے ہی لی۔ تقریباً ساری رقم جمع ہو چکی ہے۔ بس ایک [illegible] نمبر کے ہی رہ گئے ہیں۔"
"میرا مطلب تھا نجو خالہ کو آگاہ کر دیا تھا کہ یہ کمیٹی تم لے رہی ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عین موقع پر [illegible] اور وہ ادھم مچا دیں، جانتی تو ہو ان کی عادت۔"
"میں سنبھال لوں گی، بے فکر رہو۔" پھوپھو کو [illegible] صلاحیت پر بہت بھروسا تھا اور کچھ غلط بھی نہ تھا۔ [illegible] نجو خالہ اگلے روز آ گئی تھیں۔
"کمیٹی جمع ہو گئی؟" یہ نمبر ان کا تھا۔ ان کا گھر زیر تعمیر تھا، اسی مہینے ان کا یہ تیسرا چکر تھا۔
"خالہ! ایک مشکل آن پڑی ہے۔ کمیٹی اگلے [illegible] دے لینا۔"
"کیا کہہ رہی ہو؟ جانتی تو ہو اگلے ماہ کاشو (بیٹا) کی شادی ہے، جب تک گھر مکمل کروانا ہے۔ ٹھیکے دار چھت ڈالنے کو بیٹھا ہے۔ سیمنٹ، سریا منگوانا ہے، تمہاری کمیٹی کے آسرے پر تھے، پیسے ہاتھ میں آئیں تو کام مکمل کرواؤں۔ اب تم یہ بجھڑیاں نہ چھوڑو۔" نجو خالہ تو بدک ہی گئیں مگر پھوپھو تو بڑی مطمئن تھیں۔
"ارے خالہ کیا بتاؤں۔ سدرہ کے ابو نے اپنے افسر کو لون کے لیے درخواست دی تھی، اب تمہیں تو معلوم ہی ہے، سرکاری دفتروں اور کاموں کا حال۔ لون منظور تو ہو گیا مگر اگلے مہینے ملے گا۔ پہلے پتا ہوتا تو شادی کی تاریخ آگے بڑھا دیتے۔ اب عین وقت پر کیا کریں؟ مجھے تو راتوں کو نیند نہیں آرہی۔ سوچ سوچ کر دماغ پھٹا جا رہا تھا، ان کے ابو کا بھی بی پی ہائی رہنے لگا تھا۔ خدانخواستہ ٹینشن سے انہیں کچھ ہو جائے یا شادی وقت پر نہ ہو سکے تو...... میں تو بس......" پھوپھو کا لہجہ آخر میں ذرا رقت آمیز ہو گیا تھا، نجو خالہ ذرا گڑبڑا گئیں۔
"ارے اللہ نہ کرے ایسا کچھ ہو مگر تم میرا بھی تو سوچو۔ چھت پڑے گی تو پھر باقی دوسرے کام ہوں گے۔ اگلے مہینے کب کمیٹی ملے گی، کب گھر مکمل ہو گا؟ شادی کی تاریخ سر پر آجائے گی، ادھورے گھر میں دلہن بیاہ کر لاؤں گی کیا؟" وہ بھی بولتے بولتے بلبلا اٹھیں۔
"لو خالہ! کیا غیروں والی بات کر دی تم نے۔ ایسی کیا بات ہے گھر مکمل نہ ہو تو بہو رخصت ہو کر یہاں آجائے گی۔ اوپر کا کمرہ خالی پڑا ہے، رہ لیں گے کچھ دن۔ یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔" پھوپھو کی زبان تو سدا کی میٹھی تھی ہی، مگر نجو خالہ بدمزہ ہو گئی تھیں۔
"ارے ماجدہ! بڑی مصیبت میں ڈال دیا تو نے مجھے۔ تیری بیٹی کے بیاہ کا معاملہ نہ ہوتا تو جیتی نہیں۔ ایک ایک پائی نکلوا لیتی۔" وہ مایوس سی ہو کر گھٹنوں پر زور دیتی کھڑی ہو گئیں۔
"چائے شربت تو پیتی جاؤ۔"
"ٹھیکے دار میری جان کو روئے بیٹھا ہے۔ میرے تو حلق سے نیچے کچھ بھی نہیں اترے گا۔ تم اچھی

رہیں، اپنے سر سے بلا اتار کر ہمارے سر ڈال دی۔"

جاتے جاتے وہ طنز کرنا نہیں بھولیں مگر پھوپھو کو اس کی چنداں پروا نہ تھی۔

ان کا کام ہوگیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تاثیر بھائی کا کام ہوگیا تھا۔ تین سال پہلے انہوں نے جنرل اسٹور کھولا تھا۔ جو گزرے تین سالوں میں ماشاء اللہ کافی ترقی کرچکا تھا۔ اس میں مزید نیا مال ڈالنے کے لیے رقم چاہیے تھی۔ پھوپھو نے وعدہ کیا تھا کہ وہ انتظام کردیں گی اور انہوں نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔

اسٹور میں نئے اور زیادہ مال کا مطلب آمدنی میں اضافہ، جو اس وقت بہت ضروری تھا۔ سدرہ کی شادی کے بہت سارے انتظامات تقریباً مکمل تھے۔ پھر بھی دونوں میاں بیوی چاروں طرف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے کہ کہیں سے کچھ بھی ہاتھ آجائے۔ دادی نے اپنے داماد کو ٹھیک ہی پہچانا تھا۔

وہ غریب مسکین بن کر افسروں کے آگے اپنی بے چارگی ظاہر کرتے اور کم و بیش ان کا مقصد پورا ہو ہی جاتا تھا۔ کہنے کو تو وہ چپراسی تھے مگر تنخواہ کے علاوہ بھی اچھی خاصی رقم کما لیتے تھے۔ سستے زمانے میں ایک پلاٹ خریدا تھا۔ تھوڑا تھوڑا کرکے اسے بنوا کر کرائے پر دے دیا۔ اب اس کی دوسری منزل بنانے کے چکر میں تھے۔ پھوپھو کا کچھ کہہ نہیں سکتے کہ وہ شوہر صاحب کی صحبت میں رہ کر ان جیسی ہوگئی تھیں یا پہلے سے ہی ایسی تھیں۔

☆☆☆

یاسر کو اپنا سوٹ لینے بازار جانا تھا اور موٹر سائیکل نے عین وقت پر دغا دے دی۔ ابو پہلے ہی جاچکے تھے اور تاثیر بھائی تو اپنی ٹانگ میں لنگ کی وجہ سے بائیک استعمال ہی نہیں کرسکتے تھے پھر ان کا جنرل اسٹور گھر سے قریب ہی تھا۔ آرام سے پیدل چلے جاتے اور آجاتے۔ اب یاسر صاحب اپنی بائیک کو کک لگا لگا کر تھک گئے مگر وہ اللہ کی بندی اسٹارٹ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"لو جی یہ محترمہ تو گئیں کام سے۔" یاسر [illegible] جھاڑتا ہوا اندر آگیا اور لاؤنج میں صوفے پر [illegible]

"اب کیسے جائیں گے یاسر بھائی؟" [illegible] فکر لاحق ہوئی۔

"جائیں گے اپنی بائیک پر نہیں تو کسی [illegible] لے لیں گے۔" یاسر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اپنی چیز وہ بھی اتنی مہنگی، کون دیتا [illegible]" رحمت کو بھی حیرت ہوئی۔

"ارے اللہ کی رحمت، ہمارے ارد گرد [illegible] وسائل کی کمی نہیں فقط انہیں دیکھنے اور استعمال [illegible] کی ضرورت ہے۔"

یاسر نے لاپروائی سے اپنا بلکہ اپنے گھر کے مکینوں کا فلسفہ بیان کیا جو وہ زندگی گزارنے اور کام نکالنے کے لیے دھڑلے سے استعمال کر [illegible] تھے۔

رحمت خاموش ہوگئی اسے اندازہ تھا کہ [illegible] بھائی جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس پر عمل کر بھی لیں [illegible] اور اپنا کام نکال لیں گے اور یہی ہوا۔ دو گھر چھوڑ [illegible] تیسرا گھر برنی انکل کا تھا۔ حال ہی میں ریٹائرڈ [illegible] تھے۔ ہر دوسرے دن اپنی موٹر سائیکل باہر نکال کر چمکاتے رہتے تھے۔ یاسر ان کے پاس پہنچ گیا۔

"انکل! تھوڑی دیر کے لیے بائیک چاہیے۔" انداز انتہائی شریفانہ اور مؤدبانہ تھا۔ پھر بھی انکل نے گھور کر اسے دیکھا۔

"کس لیے چاہیے؟"

"دادی کی دوائیں لانی ہیں، ختم ہوگئیں۔ ایک تو بہت ضروری ہے ابھی کھانے سے پہلے کھائیں گی۔ ایمرجنسی نہیں ہوتی تو شام میں لے آتا۔ اپنی بائیک ٹھیک کروا کر۔" اس وقت پوری دنیا میں یاسر سے زیادہ مسکین کوئی نہیں تھا۔

"کتنی دیر میں آؤ گے؟" انہوں نے ابرو اچکا کر اس مسکین کو دیکھا۔

"بس یہی کوئی آدھ گھنٹہ لگے گا۔"

"احتیاط سے چلانا اور زیادہ تیز نہیں کرنا رفتار

کو۔" چابی تھماتے ہوئے انہوں نے نصیحت اور تاکید ایک ساتھ کی۔

"شکریہ انکل!" یاسر نے ان کے ہاتھ سے چابی لی اور اڑن چھو ہوگیا۔

☆☆☆

مہندی کی تقریب عام رواج کے مطابق ایک ہی جگہ، ایک ساتھ تھی۔ دن میں تیاریوں کا آغاز صبح سے ہی ہوگیا تھا۔ کومل آنکھ کھلتے ہی پہلے اپنا دوپٹا لے کر بیٹھ گئی۔ اس کے کناروں پر دھنک لگا رہی تھی۔ تھوڑا سا دوپٹا رہ گیا تھا، اسے جلدی جلدی مکمل کررہی تھی۔ ناشتے سے زیادہ سب کو شام کی فکر تھی۔ ماہم کو اب یاد آرہا تھا کہ اس کے لہنگے کی میچنگ بالیاں لگی ہیں۔ نعمت بار بار آئینے میں اپنا جائزہ لے رہی تھی کہ پچھلے ایک ماہ سے وہ جو نہار منہ ایک گلاس نیم گرم پانی میں لیموں نچوڑ کر پی رہی تھی، اس سے کوئی فرق پڑا یا نہیں؟ رحمت ماسک بنانے کے لیے خواتین ڈائجسٹ کا تازہ ترین شمارہ اٹھائے ہوئی بکس پڑھ رہی تھی۔

الفت سب سے بے نیاز ابھی تک لحاف تانے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اپنی نیند اور آرام پر کوئی سمجھوتا نہیں کرتی تھی۔ سدرہ بھی ابھی اٹھی تھی، اب بیٹھی اپنی مندی مندی آنکھوں سے سب کو دیکھتی دہائیاں دے رہی تھی۔

"ارے کوئی جا کر ناشتا تو بنالو۔"

"منہ تو دھولو پہلے، ناشتا بھی مل ہی جائے گا۔" ماہم کچن میں ہی جارہی تھی۔

"آج تو ہاف فرائی بنادے ماہی! کتنے دن ہوگئے انڈا کھائے ہوئے۔" سدرہ نے بڑے پیار اور لجاجت سے چھوٹی بہن کو دیکھا۔

"ہرگز نہیں، تمہیں دودھ جلیبی ملے گی اور بس۔ اسکن اتنی حساس ہے تمہاری، فوراً دانے نکل آتے ہیں۔ دو تین دن اور پرہیز کرلو پھر کھاتی رہنا شادی کے بعد۔ جتنے دل چاہے انڈے اور......"

"کیا ہے بھئی، ایک ہفتہ ہوگیا ہے ناشتے میں دودھ جلیبی کھاتے ہوئے۔ اب تو اچھی بھی نہیں لگتی۔ پتا نہیں تم لوگ کیا چاہتے ہو؟" سدرہ نے منہ بسورا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بہن اپنی شادی کے دن، دنیا کی سب سے خوب صورت دلہن لگے۔"

"وہ تو پارلر والے بنا ہی دیں گے۔"

"جی نہیں، دلہن کی خوب صورتی صرف میک اپ اور بیوٹیشن کی مرہون منت نہیں ہوتی۔ وہ ایک الگ ہی شے ہے جسے روپ کہتے ہیں۔"

"اور جو فقط انڈا نہ کھانے کی وجہ سے آتا ہے؟"

"بالکل۔"

"ہم دونوں مہندی کا تھال لے کر آگے آگے چلیں گے۔" الفت اور کومل سر جوڑے بیٹھی تھیں۔

"کیا پتا کوئی ہیرو ٹکرا جائے، جیسے کہانیوں اور ڈراموں میں ہوتا ہے نا۔" الفت کا چہرہ اپنی ہتھیلیوں کے پیالوں میں دھرا تھا۔ "جلتی ہوئی شمعوں کی روشنی ہمارے چہروں پر پڑ رہی ہو اور......"

"اور کیا ہوتا ہے آگے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے کومل کو دیکھا۔

"تمہارا دوپٹا آگ پکڑ لے اور وہ بچانے آئے۔"

"اللہ نہ کرے۔" آگ کے تصور سے ہی الفت کا دل دہل گیا۔ "نہیں بھئی یہ آئیڈیا ٹھیک نہیں، کافی خوف ناک سا ہے۔"

"اچھا تو تم موم بتی کا تھال اٹھائے آگے جارہی ہو اور ایک دم اس سے ٹکرا جاتی ہو۔" کومل نے دوسرا منظر پیش کیا۔

"وہ تو سب لوگ دیکھ لیں گے۔" الفت نے پھر اعتراض اٹھایا۔

"اب مہندی کے فنکشن میں سارے مہمانوں اور گھر کے مکینوں کو غائب کرکے صرف تم دونوں کا سین کیسے کرواؤں؟" کومل بے چاری مشکل میں پڑ گئی۔

"کہانیوں میں تو ایسے سین ہوتے ہیں۔"

الفت نے دلیل دی۔
”کہانیوں میں ہوتے ہیں بے وقوف! ہو سکتے ہیں۔ کہانی میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اصل زندگی میں تھوڑی ہوتا ہے۔“ کومل نے تفصیل سے اسے سمجھایا۔
”ہوتا ہی ہوگا، تب ہی تو فلموں میں، ڈراموں میں اور کہانیوں میں دکھاتے ہیں۔“ الفت کا دل خواب دیکھنے پر مصر تھا۔
”ہاں ہو سکتا ہے، ہوتا ہے مگر ضروری تو نہیں کہ ایسا سین میرے یا تمہارے ساتھ بھی ہو۔“ کومل کا حقیقت پسند دل اب ذرا ڈھل مل ہو رہا تھا۔
”دنیا میں کہیں بھی، کبھی بھی، کسی کے ساتھ بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ الفت نے اپنے وزن سے بھی زیادہ بھاری فلسفہ بگھارا۔
”ہاں ہو تو سکتا ہے مگر دعا کرو کہ جو کچھ بھی ہو اچھا ہی ہو۔“ کومل نے اس کے فلسفے کے آگے گرہ لگائی۔
”آمین۔“ الفت نے بڑے خضوع و خشوع سے کہا تھا۔

☆☆☆

ماہم جلدی جلدی روٹی بیل رہی تھی۔ دوسرے چولہے پر سالن گرم ہو رہا تھا۔
”رحمت یار! پلیز ذرا یہ سالن پلیٹ میں نکال دو اور میں یہ روٹی ڈال رہی ہوں۔ دادی کو اوپر کھانا دے آنا، میں اب کپڑے پریس کروں گی، لائٹ کا کوئی بھروسا نہیں۔“ ماہم کے ہاتھ اور زبان یکساں رفتار سے چل رہے تھے۔
”ایک بات تو بتاؤ۔ دادی کو اوپر کیوں شفٹ کیا ہوا ہے۔ بالکل ہی اکیلی پڑ جاتی ہیں۔ خدانا خواستہ کچھ ہو جائے تو کسی کو پتا بھی نہ چلے۔“ رحمت جب سے آئی تھی، تب سے یہ سوال اسے چبھ رہا تھا۔ آج اس نے پوچھ ہی لیا۔
”یہ تو امی سے پوچھو، ٹھیک ٹھیک جواب ان ہی سے ملے گا۔“ ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے روٹی توے پر ڈالی۔
”اب ان سے کون پوچھے، تم ہی...“ رحمت نے پلیٹ میں سالن نکال کر ٹرے میں...
”وہی ساس بہو کی روایتی جنگ... امی کمزور تھیں، بے بس تھیں۔ دادی نے کبھی... چھوڑی انہیں تنگ کرنے میں۔ بہت پریشان... امی کو بھی، ہم سب کو بھی۔ پھر سب بچے بڑے... اب امی کا وقت ہے پھر ابو بھی پہلے جیسے... فرماں بردار نہیں رہے۔ اب وہ بھی امی سے... لگے ہیں تو امی نے یہ آدھا گھر نیچے کا کرائے... دادی کو اوپر شفٹ کر دیا کہ نیچے ہم لوگ ہی... رہے تھے۔“
”تو اب لے آؤ نیچے، اب تو کرایہ دار... گئے۔“
”بہت بولتی ہیں بھئی، تمہیں کیا معلوم... بات پر اعتراض، ہر وقت بھی کسی کو... کسی کو لیتی ہیں۔ ایسے بڈھوں کو برداشت... کون کرتا ہے۔“ ماہم نے روٹی سینک کر... میں لپیٹی اور ٹرے میں رکھ دی۔
”ہماری دادی بھی ایسی ہی ہیں۔ ہم نے... قید تنہائی کی سزا تو نہیں دی۔“ رحمت کا دل دکھا تھا... کی بات سن کر۔
”پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری دادی، تمہاری دادی یعنی ہماری نانی سے بھی چار ہاتھ آگے ہی... اور دوسری بات یہ کہ نانی کو اپنے ساتھ رکھنا... کی مجبوری ہے۔ گھر میں کہیں اور کوئی جگہ نہیں... لوگوں کے پاس اگر اختیار اور چوائس ہوتی تو تم لوگ بھی شاید یہی کرتے۔“ ماہم نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
”مگر......“
”اتنا غم نہ کھاؤ ڈیئر! تاثیر بھائی کی شادی ہو جائے تو وہ اوپر ہی رہیں گے، ابھی اس پہلے... اسی اوپر کا پورشن کرائے پر دے رہی ہیں۔ اسی لیے... بنوایا ہے تو دادی اتنی اکیلی بھی نہیں رہیں گی۔“ ماہم نے... تسلی دی اور ساتھ ہی ہدایت بھی۔
”اب ذرا یہ ٹرے اٹھاؤ اور جلدی سے دادی کو کھانا دے آؤ۔“
”جا رہی ہوں۔“ رحمت نے بوجھل دل کے ساتھ ٹرے اٹھائی۔

☆☆☆

شام میں مہندی کی تقریب خیر خیریت کے ساتھ گزر گئی یعنی الفت کے ساتھ اور نہ ہی کومل کے ساتھ کوئی اتفاقیہ سین نہیں ہوا۔ دانستہ یا نادانستہ کوئی ٹکرایا بھی نہیں اور اہم بات یہ کہ کومل اور الفت کو یاد بھی نہیں رہا کہ تقریب سے قبل وہ کس قسم کے خواب بنتی رہی تھیں۔ شور شرابا، ہلا گلا، مزے دار باربی کیو، ... اتنا کہ کوئی حسرت یاد ہی نہیں آئی۔
بارات کے دن سب لڑکیوں کا ایک سا حال... تیار ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتی رہیں۔
”میں کیسی لگ رہی ہوں، میک اپ ٹھیک ہے... یہ اسٹائل سوٹ کر رہا ہے؟“ اور اگلی اپنا آپ... کی فکر میں غلطاں۔ اسے دیکھے بغیر ہی ”ہاں، بہت اچھی لگ رہی ہو“ کہہ کر اپنی جان چھڑاتی۔ ایک دوسرے سے پوچھنے پر تسلی نہ ہوئی تو سیلفیاں لینے میں... ہو گئیں۔ ذرا سی دیر میں بیس پچیس سیلفیاں لے ڈالیں۔ ایک ایک کا بغور معائنہ کر کے بیس بائیس ڈیلیٹ کر دیں، دو تین رہنے دیں۔
تقریباً سب کی سب اسی مشغلے میں مصروف تھیں کہ بارات آنے کا غلغلہ اٹھا۔ ساری کزنز کو استقبالیہ... ہو کر مہمانوں کا استقبال کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے کسی نے ہار پہنانے کے لیے ہار سنبھالے ہوئے تھے، کچھ کے پاس پھول تھے مہمانوں کو دینے کے لیے، کچھ کے پاس پتیاں تھیں ان پر نچھاور کرنے کے لیے۔ سب کی سب ہڑبڑا گئیں۔ موبائل ایک طرف کیے اور ہار پھول، پتیاں اٹھا کر استقبالیہ کی طرف بھاگیں۔
الفت بھی گلاب کی پتیوں کی پلیٹ سنبھالے اور اس کے ساتھ اپنا دوپٹا سنبھالے تیز تیز قدموں سے روانہ ہوئی اور سارا دھیان ہاتھ میں موجود پلیٹ اور بار بار پھسلتے دوپٹے کی طرف تھا۔ سامنے دیکھا ہی نہیں کہ اچانک ہی کسی سے ٹکرائی اور ہاتھ میں موجود پتیاں مہمانوں سے پہلے کسی اور پر نچھاور ہو گئیں۔
”اف......“ الفت کا سارا دھیان اور فکر پتیوں اور پلیٹ کی طرف تھا۔ ٹکرانے والے موصوف جھک کر پلیٹ سیدھی کر رہے تھے۔
الفت نے ایک نظر دیکھا، جھکے ہوئے سر پر آگے کی طرف تو بال گھنے تھے، البتہ سر کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا گنج تھا۔ الفت ابھی ٹھیک سے بدمزہ بھی نہیں ہو پائی تھی کہ موصوف کی اگلی بلکہ پہلی ہی بات پر سارے ارمانوں پر برف بلکہ ڈھیروں ڈھیر برف گر گئی۔ موصوف فرما رہے تھے۔
”معاف کرنا بیٹی! میں آپ کو دیکھ نہیں سکا۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔“ پچاس پچپن کے پیٹے کے وہ صاحب بڑی خوش خلقی سے معذرت کر رہے تھے۔
”اٹس او کے انکل!“ الفت کے ہوائیاں اڑتے چہرے پر اور بے چارگی چھا گئی۔
جلدی جلدی الٹی سیدھی پتیاں پلیٹ میں ڈال کر وہ تیزی سے پھر بھاگی اور بغیر کسی خوش گوار و ناخوش گوار حادثے کے دوسری لڑکیوں کے پاس پہنچ ہی گئی۔ بارات آ گئی تھی، مہمانوں کا استقبال بھی ہو گیا اور معہ دولہا سب اندر آ گئے۔ نکاح مہندی والے دن ہو چکا تھا اس لیے کھانے کے لیے مہمانوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ رخصتی کے وقت دلہن اور گھر والوں سمیت ساری لڑکیاں بھی جذباتی ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

ولیمے کے بعد لڑکیاں اپنے گھروں کو واپس آ گئیں۔
کومل دبو سی ہوئی سی لڑکی تھی، دماغ کو زیادہ زحمت نہیں دیتی تھی۔
الفت خوابوں خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔ کوئی

انجان شہزادہ، کوئی اجنبی اچانک سے زندگی میں آئے گا اور زندگی ایک دم حسین ہو جائے گی۔

نعمت وہی لاپروا اور بے نیازی کے رنگوں میں رنگی ہوئی تھی۔

رحمت ذرا حقیقت پسندانہ خیالات کی مالک تھی۔ آس پاس کا ماحول، لوگوں کے رویے، باتیں دیکھتی سنتی اور محسوس کرتی تھی۔ اسے اپنے گھر والوں کی، اپنی بہنوں کی فکر تھی۔ گھر کے دوسرے مکینوں کی طرح دادی کی باتیں اور رویہ اسے بھی کبھی کبھی کھلتا تھا مگر ماں کی صابر فطرت کا تھوڑا سا اثر اس کے اندر تھا مگر ماجدہ پھوپھو کے گھر جو ماحول اور خصوصاً اپنی ساس کے ساتھ ان کا رویہ دیکھ کر آئی تھی، اس سے رحمت کا دل خاصا برا ہوا تھا۔

پھوپھو گھر داری میں الجھی ہوئی تھیں ان کا میکے آنا کم کم ہی ہوتا تھا۔ ادھر یہ لوگ بھی وہاں کبھی کبھار ہی جاتی تھیں۔ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، پہلے تو مہمانوں کی طرح گئیں دو تین گھنٹے بیٹھ کر آگئیں۔

اب شادی کے موقع پر رہنے کا موقع ملا تو معلوم ہوا کہ چمکتے دمکتے، سجے سجائے گھر اور خوش حالی کی جھلک لیے اخراجات کے پیچھے کیسے کیسے جوڑ توڑ ہیں۔ رحمت کپڑے پھیلانے چھت پر آئی تھی۔ سارے کپڑے دھو کر اکٹھے ہی اوپر لے آئی پھیلانے کے لیے۔ بار بار چکر لگانا بڑا دشوار اور تھکا دینے والا کام بن جاتا تھا۔ وہ سارے کپڑے نکال کر بالٹیوں میں بھر لیتی اور بلال، حمزہ یا شارق جو کوئی بھی میسر ہوتا وہ پہنچا دیتے۔

الگنی پر کپڑے ڈالتے ہوئے طائر خیال پرواز کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ رہا تھا۔ پھوپھو کے بنے ہوئے، سجے ہوئے اسٹائلش گھر اور کھلے گھریلو اخراجات دیکھ کر بھی بھی لڑکیوں کو اپنے گھر اور ماحول کے بارے میں احساس کمتری ہوتا تھا۔

"ڈھنگ کا ایک ڈرائنگ روم تک تو ہے نہیں گھر میں، چار لوگ آجائیں تو بٹھانے کی جگہ نہیں ہے۔ اوپر سے دادی کو شادیوں کی فکر [illegible]" لڑکیاں کبھی کبھی آپس میں بول کر [illegible] نکالتیں۔

"اوپر اچھا خاصا کمرہ موجود ہے [illegible] شفٹ ہو سکتی ہیں مگر نہیں نیچے ہی [illegible] کہ اس کمرے میں شادی ہو کر آئی تھیں [illegible] یہاں سے نہیں نکلیں گی۔ کمرہ خالی ہو جائے تو ڈرائنگ روم بن سکتا ہے۔" پھوپھو سے بھی [illegible]

"چلو چھوڑو، جیسا ہے اسی میں ہی [illegible] کی عادت ڈالو۔" رحمت بہنوں کو چپ کرا [illegible]

"گزارہ کر رہے ہیں۔" الفت [illegible] بناتی، اس کے خوابوں میں اپنے گھر کی [illegible] بھی نہیں تھی۔

ایک بالٹی کے کپڑے ختم ہو گئے تھے [illegible] اب دوسری بالٹی کے کپڑے پھیلانے شروع کیے۔ نعمت اور الفت اور کبھی کبھی رحمت بھی باتوں باتوں میں جتا دیتیں یا گنوائی رہتی تھیں۔

"پھوپھو نے نیا فریج لیا ہے فل سائز کا، ایل ای ڈی ہے، صوفے خریدے ہیں، اے سی لگایا، کچن ری نیو کروایا ہے۔ نئے ٹائل لگوائے ہیں، پردے، برتن، آرائشی اشیا، پھر ان سب کا اپنا اوڑھنا۔" جب بھی کبھی لڑکیوں کا پھوپھو کے گھر جانا ہوتا یا پھوپھو کا یہاں آنا ہوتا، ان کی معلومات میں اضافہ ہی ہوتا کہ پھوپھو کے گھر نیا اضافہ کیا ہوا ہے۔ تینوں بہنیں ماں کے سر ہو جاتیں۔

"امی! کوئی بڑی کمیٹی ڈال کر گھر کے لیے سامان خرید لیں۔"

امی کے لبوں پر ایک پھیکی، بے بسی کی مسکراہٹ آجاتی۔

"میرے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے ہیں بس گھر کے اخراجات کی رقم دیتے ہیں تمہارے ابو۔ پھر تمہاری پڑھائیوں کے خرچے ہیں، وہ فیس وغیرہ بھی بھر دیتے ہیں۔ تم لوگوں کی شادیوں کے لیے ایک بڑی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے انہوں نے۔ مجھ سے

[illegible] امی نے بتایا۔

"[illegible] بہری بھولی امی! آج کل رشتے بھی [illegible] بھی آجاتے۔ لوگ گھر دیکھتے ہیں، [illegible] گھر کی سجاوٹ، اسٹیٹس، باپ بھائیوں کی [illegible] کیا کیا کچھ دیکھتے ہیں۔" رحمت [illegible]

"لوگ کچھ بھی دیکھیں، ہوتا تو وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔"

امی نے بڑی سادگی سے گہری بات کی تھی مگر [illegible] گہرائی سمجھنے کی کوشش لاابالی لڑکیوں نے بھی [illegible] اب رحمت سوچ رہی تھی، پھوپھو کے گھر [illegible] کڑوا احساس کمتری کا شکار ہوتی اور [illegible] انہیں بھی تکلیف پہنچاتی تھیں۔ [illegible] کی حقیقت اب اس پر آشکار ہوئی تھی۔

پھوپھا بڑے چلتا پرزہ قسم کے آدمی تھے، [illegible] نیم سرکاری ادارہ اور سرکاری نوکری تھی۔ افسروں کی چاپلوسی کرنے اور اپنے گھریلو حالات کا رونا روتے تھے ـــــ معمولی سی پریشانی کو اس طرح بیان کرتے کہ رائی کا پہاڑ بنا دیتے اوپر کا کوا۔ دو چار افسران ان پر مہربان تھے، کسی نے گھر شفٹ کیا تو پرانے گھر کا سامان جو نیا سا ہی تھا، انہیں دے دیا۔ آئے دن سو دو سو، پانچ سو ان کی خوشامد بس خدمت پر خوش ہو کر انہیں دے دیتے۔ حتیٰ کہ گھر کی بالائی منزل بنوانے کے لیے بھی ایک معقول رقم اپنے افسران سے انہیں مل گئی تھی۔

"تو پھوپھا جیسے لوگ ہیں جن کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر ہمیشہ کڑاہی میں رہتا ہے۔" رحمت نے سوچا۔

پھر ان کے گھر کا حساب کتاب اور دوسرے معاملات بھی خاصے گڑبڑ قسم کے تھے۔ ابھی پھوپھو نے ان کے سامنے ہی علاقے کے درزی سے شادی کے، دلہن کے ڈھیروں ڈھیر کپڑے سلوائے تھے۔ پانچ ہزار ایڈوانس دے دیے، وہ بے چارے نے خوش ہو کر درجنوں کپڑے سی دیے، چالیس ہزار کا بل بنا تھا۔ لا کر ایک طرف ڈال دیا۔

"ابھی تو نہیں دے رہی میں کوئی پیسے ویسے۔" پھوپھو نے صاف انکار کر دیا۔

درزی صاحب نے چکر لگانا شروع کر دیے، جان پہچان کا تھا۔ علاقے میں ہی دکان تھی، آپا آپا کر کے ان کی خوشامدیں کر رہا تھا۔

"ارے آپا! کچھ تو دے دو، میرا بھی کام چلے۔ کاریگروں کو پیسے دینے ہیں، اپنے پلے سے کہاں سے دوں۔ چلو باقی شادی کے بعد دے دینا، مجھے بھی اندازہ ہے، شادی کا موقع ہے۔" بیٹی کی شادی کا سن کر شریف انسان تہذیب بلکہ رقیق القلبی کا مظاہرہ کرتا ہے، درزی بے چارہ بھی شریف آدمی تھا۔

"آپا کہتے ہو، پھر بہن بھانجی کا ذرا خیال بھی نہیں کر رہے۔ شادی سے فارغ ہو جاؤں، تھوڑے تھوڑے کر کے دے دوں گی۔"

"تھوڑے تھوڑے کر کے؟" درزی بے چارہ کراہا۔

"ارے ہاں، ایک دم سے چالیس ہزار کیسے نکالوں؟ کھانے کے پیسے رکھے ہیں اس میں سے دے دوں تو باراتیوں کو کیا کھلاؤں گی؟"

"مگر آپا میرا بھی تو کچھ سوچو۔"

"ارے میرے بھائی! ایک جگہ سے پچاس ہزار کی کمیٹی ملنی تھی۔ کم بخت نے عین وقت پر دھوکا دے دیا کہ کمیٹی ٹوٹ گئی۔ جو پیسے بھرے تھے وہ بھی نہیں ملے، اس کمیٹی کے آسرے پر ہی میں نے اتنے سارے کپڑے سلوا لیے۔ پتا ہوتا کہ منحوس ماری ایسے کرے گی تو اتنے جوڑے کاہے کو سلواتی؟"

پھوپھو خدا جانے کس نادیدہ ہستی کو کم بخت اور منحوس کے القاب دے رہی تھیں۔ درزی بے چارہ مایوس ہی لوٹ گیا۔ پھوپھو نے ویسے اسے یہ تسلی کرا دی تھی کہ شادی کے بعد یکمشت نہیں تو ماہانہ تھوڑی تھوڑی رقم کر کے وہ ایک ایک پائی چکا دیں گی اور یہ انہوں نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ کسی کا پیسہ وہ اپنے اوپر باقی نہیں رہنے دیتی تھیں۔ دیر سویر چکا ہی دیتی

تھیں، بس یہ تھا کہ اپنے کام نکال لیتی تھیں۔ اگلا بے چارہ خوار ہوتا پھرے، ان کی بلا سے۔

رحمت نے تینوں بالٹیاں خالی کر دی تھیں اور تینوں الگنیاں کپڑوں سے بھر گئی تھیں۔ ایک بالٹی اس نے وہیں چھوڑی اور دو بالٹیوں کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ نیچے جانے سے پہلے ہی بلال سے ٹکراؤ ہو گیا۔

"بلال اوپر ایک بالٹی ہے، وہ ذرا نیچے لا کر رکھ دینا۔"

"اچھا رکھ دوں گا، یہ بتاؤ تم لوگوں نے پکایا کیا ہے؟" بلال شاید اس کا منتظر تھا تب ہی سیڑھیاں اترنے کی آواز پر فوراً باہر آیا تھا۔

"ہم نے؟" رحمت نے سوچنے کی کوشش کی۔ کھانا پکانے کا کام زیادہ تر نعمت کرتی تھی۔ ایک تو یہ کہ اسے شوق بھی تھا پکانے کا اور پھر کچھ اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی تھا تو دادی اور ابا کی خصوصی فرمائش یا مرضی یہی تھی کہ کھانا وہی پکایا کرے۔

"میرا خیال ہے نعمت آلو کے پراٹھے بنا رہی ہے۔" رحمت نے فضا میں تیرتی پراٹھے کی مزے دار سی خوشبو کو محسوس کیا اور پھر اسے یہ بھی یاد آیا کہ جب اس نے مشین لگائی تھی تو نعمت نے ایک پتیلا بھر کے آلو ابلنے کو رکھے تھے۔

"آلو کے پراٹھے۔" بلال نے تھوک نگلا۔ "دو مجھے دو گی؟" وہ انتہائی لجاجت سے بولا تھا۔

"ہاں، اس میں کہنے کی کیا بات ہے۔" رحمت نے حیرت سے اسے دیکھا۔

ابھی اس گھرانے میں یہ روایت باقی تھی کہ آلو کے پراٹھے، بیسن کی روٹی، پائے، نہاری، حلیم یا اسی طرح کی کوئی بھی شے حتیٰ کہ تو چاول بھی پکتے تو اوپر نیچے ایک دوسرے کو ضرور بھیجتے تھے۔ کوئی چیز اگر دادی یا ابا کی پسند کی ہوتی تو فہمیدہ چچی ان دونوں کے لیے الگ سے بھجواتی تھیں۔

"نہیں، گھر میں سب کو نہیں۔ صرف مجھے۔"

"خیریت تو ہے۔" رحمت نے اوپر سے نیچے تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ موٹو بھی تھا اور … ایک بات تھی کہ سب کے کام کرتا تھا اپنے … بھی اور نیچے والوں کے بھی۔

"ارے ہم دوست کبھی کبھی ایک دوسرے کے گھروں پر کھانا کھاتے ہیں۔ آج میرا ایک … آیا ہے کھانا کھانے۔ کومل نے چکن … کی شکل ہی اچھی نہیں، کھانے میں کیا خاک … ہوگی۔"

بلال نے برا سا منہ بنایا۔ سچ تو یہ تھا کہ کومل … گزارے لائق ہی کھانا پکاتی تھی۔ شاید کچن کی ذمہ داریوں سے جان چھڑانا چاہتی تھی جو ماں نے زبردستی اس پر ڈال رکھی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے، میں پراٹھے بھجوا دوں گی۔" رحمت نے اس کے منہ بنانے پر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"نہیں نہیں، میں خود آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے، دس منٹ بعد آ جانا اور ہاں … یاد سے لے آنا۔" رحمت بولتی ہوئی نیچے اتر گئی۔

نیچے کچن میں گئی تو نعمت پیڑھی پر بیٹھی پراٹھے پکا رہی تھی۔ روٹیاں پراٹھے وہ عموماً نیچے بیٹھ کر ہی پکاتی تھی آرام سے۔

"چار پراٹھے زیادہ بنا لینا، بلال کو دینے ہیں۔"

رحمت بھی پیڑھی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گئی۔ کراچی میں سردیاں شروع ہو کر اپنے شباب پر تھیں، یعنی پچھلے ایک دو ہفتے میں … لوگوں نے لحاف اور کمبل اوڑھنے شروع کر دیے تھے۔ باہر جا کر ٹھنڈی اور خنک ہوا میں آئس کھا رہے تھے۔ سستے، مہنگے، ڈیزائنر یا لنڈے کے گرم ملبوسات پہن کر یوں خوش ہو رہے تھے کہ جیسے سردیاں آ گئیں حالانکہ یہاں سردیاں نہیں، سردیوں کی فقط ایک ہلکی سی لہر آتی ہے جو آتی ہے اور پھر فوراً ہی واپس بھی چلی جاتی ہے۔ کچھ اس طرح جیسے کوئی بھی امریکی صدر، بذات خود اپنی آمد کا شرف بخشنے کے بجائے اپنے کسی چھوٹے سے وزیر کے ادنیٰ سے سیکرٹری کے معمولی سے اسسٹنٹ کو پاکستان بھیج

کر دوستی کا حق ادا کرتا ہے۔

رحمت نے کپڑے دھوئے تھے، اسے کچھ ٹھنڈ سی محسوس ہو رہی تھی حالانکہ دوپہر تھی مگر سورج صاحب بھی منہ چھپائے گم تھے۔ کہیں ابر سا چھایا ہوا تھا۔ چولہے کے قریب بیٹھ کر بڑی فرحت بخش گرمائش کا مزہ لینے لگی۔ بلال کو پراٹھے بھجوانے کا کہا تو نعمت نے ہاٹ پاٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اس میں چار پراٹھے موجود ہیں، چٹنی اوپر رکھی ہے کاؤنٹر پر۔ اٹھا لو اور ٹرے میں رکھ کر اوپر بھجوا دو۔"

"یہ تو چچی کے جائیں گے نا، بلال کو الگ چاہئیں۔" رحمت نے وضاحت کی۔

"کیا؟" نعمت نے بہن کو گھورا۔ "اتنا موٹا ہو رہا ہے اور اتنا ہی ندیدہ بھی۔ چار پراٹھے کھائے گا۔"

"اس کا دوست آیا ہے، وہ بھی کھائے گا۔" رحمت نے بتایا۔

"تو کومل سے کیوں نہیں پکوایا کھانا۔" نعمت نے پراٹھا احتیاط سے توے پر ڈالا۔

"پتا تو ہے تمہیں، وہ کیا کھانا پکاتی ہے۔"

"ایسا کہ بندہ اگلی بار پکوائے ہی نہیں۔" نعمت نے بے ساختہ کہا اور پھر خود ہی ہنس بھی پڑی۔ "جتنی اس کی جان جاتی ہے کچن سے، چچی اتنا ہی اسے کچن میں گھسا کے رکھتی ہیں۔"

"کچھ کام اس کے تینوں بھائی زیادہ لے مصروف رکھتے ہیں کچن میں۔ پھر چچی کی بھی مجبوری ہے بلڈ پریشر بھی ہے انہیں۔ شوگر بھی، کبھی گھٹنوں میں تکلیف ہو جاتی ہے، کبھی بدن میں درد ہو جاتا ہے۔ زیادہ کام ہوتا ہی نہیں ان سے، فوراً بیمار پڑ جاتی ہیں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" نعمت نے بہن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ باتوں کے دوران وہ دو پراٹھے اور پکا چکی تھی۔

"دادی کو بھی دے آؤ گرم ہیں ابھی۔"

الفت نے دستر خوان لگا لیا تھا۔ نعمت گرما گرم پراٹھے بنا رہی تھی اور وہ لوگ کھا رہے تھے، آخر میں چار پراٹھے اضافی بنائے، چوتھا بنا رہی تھی کہ بلال آ گیا۔

رحمت نے اس پر ترس کھا کر چار شامی کباب بھی تل دیے تھے۔ بے چارہ پانی بھر کے لا دیتا تھا، سودا سلف لا دیتا، بل بھر دیتا، باہر کے کئی کام کر دیتا تھا۔

نعمت نے چوتھا پراٹھا بنا کر ہاٹ پاٹ میں رکھا اور ہاٹ پاٹ اس کے حوالے کر دیا۔ اپنے پراٹھے وہ پہلے ہی ٹرے میں رکھ چکی تھی۔ بلال پہلے ہاٹ پاٹ اور کباب لے گیا، پھر دوبارہ آ کر چٹنی، سلاد، اچار بھی لے گیا اور کچھ دیر بعد، تیسری بار پھر آیا۔

"نعمت۔" اس نے کھانا کھاتی نعمت کو مخاطب کیا۔

"کیا ہے؟" اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

"ایک پراٹھا اور مل جائے گا؟" کیسا مسکین لب و لہجہ تھا بلال کا۔ پھر بھی نعمت بیگم کا دل نہیں پگھلا۔

"اب اٹھا کے رکھ دیا ہے سب کچھ اور ویسے بھی میں کھانا کھا رہی ہوں۔ (نظر نہیں آ رہا، اندھے)۔" دل ہی دل میں کہا۔

"بہن نہیں ہو؟" اف بے چارہ بلال اور اس کی بے چاری سی خوشامد۔

"ہرگز نہیں، میں صرف ابھی دو بہنوں کی بہن ہوں اور کسی کی کوئی بہن وہن نہیں ہوں، سمجھے۔" نعمت اس بھاری بھرکم، گول مٹول کزن کو بہت ہی ہلکا لیتی تھی۔ فوراً ہی بگڑ گئی، ڈپٹ کر مزاج درست کیے۔

"اچھا، چلو کزن ہی سہی۔" بلال نے مصالحت کا جھنڈا لہرایا۔ "میری اچھی سی کزن نہیں ہو۔"

"میں بتا دوں بلال بھائی۔" الفت بے چاری کا دل اتنی خوشامد اور التجاؤں پر گداز ہو گیا۔ ویسے بھی اس کے سارے پیپرز کے دوران بلال روزانہ اسے

چھوڑنے جاتا، واپس بھی لے کر آتا۔ اب وہ بھی بلال بھائی کے لیے کچھ کرنا چاہتی تھی مگر بلال بھائی تو بس اپنے نام کے ایک ہی تھے، بولے تو یہ بولے۔

"تم رہنے دو، کومل جیسے پکاؤ گی پچکے ہوئے یا تو کچے یا جلے ہوئے۔ نعمت اچھا پکاتی ہے کھانا۔" نادانستگی میں اس نے سچ بولا تو تعریف کی۔ کچھ اندازہ نہ ہوسکا مگر بہرحال نعمت کا دل تھوڑا سا پسیج گیا۔

"ابھی بناتی ہوں، دو تین نوالے رہ گئے، یہ کھالوں۔"

"ہاں ہاں تم کھانا کھالو، پھر بنادینا، دو بنادینا۔" بڑی خوش دلی سے بولتے ہوئے آخر میں ذرا ٹھہر کر اس نے "دو" کا جو نعرہ لگایا تھا تو لامحالہ نعمت کو گھورنا ہی پڑا۔

"ابھی تو ایک کہہ رہے تھے تم؟"

"وہ تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ اگر پکا ہوا رکھا ہے تو ایک دے دو، اب تم پکاؤ گی تو دو ہی پکادو۔ میرا دوست بھی بہت تعریفیں کر رہا تھا۔ تمہارے ہاتھوں کی۔" بلال کی جلدی جلدی کی گئی وضاحت میں سے نعمت نے ایک لفظ پکڑا تھا۔

"'بھی' سے کیا مراد ہے؟ اور کون تعریفیں کرتا ہے میری؟"

"گھر میں تو سب ہی کرتے ہیں نا تمہاری کوکنگ کی تعریف۔ مجھے خود تمہاری پکائی ہوئی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔" بلال بے چارہ سراپا کئیں دماغ کا بھی بھونڈو تھا۔ بڑی سادگی اور سچائی سے اپنے خیالات پیش کر رہا تھا۔

"اچھا۔" نعمت اٹھ کھڑی ہوئی۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں کسی کا بھی، کچھ بھی پکایا ہوا اچھا لگتا ہے بس کھانے کی شے ہونی چاہیے۔"

"کوئی نہیں، وہی چیز اچھی لگتی ہے جس میں ذائقہ ہو۔ تب ہی تو میں آئے دن تجھے کھانا کھاتا ہوں۔ تمہارے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے نا۔" بلال کے خلوص کو سلام پیش کرنے کو جی چاہتا تھا اور رحمت نے سوچ لیا تھا کہ یہ سلام بلکہ سلامیاں، بلال کو وہ پیش کرے گی۔

☆☆☆

سدرہ کی شادی کو تیسرا ماہ تھا۔ پھوپھو سے پہلے کی آئی ہوئی تھیں۔ اب پھر اپنے بچوں کے ہمراہ آئی تھیں اور آنے کے بعد سب کو دادی کے سامنے بٹھا کر انہوں نے ایسی بات کی پہلے تو سب کے منہ حیرت کے مارے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پھر بات یقین اور سمجھ میں آئی تو سب کے بلیوں اچھلنے لگے۔ پھوپھو نے جو اعلان جاری کیا اس کے مطابق وہ تاثیر بھائی کے لیے کومل کا اور یاسر کے لیے الفت کا رشتہ لائی تھیں۔

"برا نہ ماننا بھابھی! میرے لیے تو میری بھتیجیاں برابر ہیں، رحمت بڑی ہے۔ امی کا بھی میں نے کہا مگر آپ کو پتا ہے یہ آج کل کی اولاد ان کی مرضی اور خوشی بھی پوچھنی پڑتی ہے۔ یاسر نے الفت کا نام لیا تو اس کی مرضی پہ راضی ہونا پڑا۔" پھوپھو نے امی کے سامنے وضاحت کی۔

"کوئی بات نہیں، اللہ نے جو ان کے نصیب میں لکھا ہے۔ وہ بھی ایسے ہی بھیج دے گا، جیسے آپ کو بھیجا ہے۔"

امی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رسان سے کہا۔ وہ موجودہ دور اور دنیا کے مروجہ اصولوں کے مطابق کوئی ہوشیار قسم کی خاتون نہیں تھیں۔ کسی حد تک دلی دبائی، سہمی ہوئی کمزور سی عورت جو بہت زیادہ سوشل بھی نہیں تھیں کہ بیٹیوں کے رشتوں اور شادیوں کے معاملے میں ادھر ادھر ہاتھ پیر مارتیں یا کوششیں کرتیں۔ ان کا یقین تو بس ایک بات پر تھا کہ اللہ صرف چالاک، ہوشیار اور زمانہ شناس لوگوں کا ہی نہیں ہے کم عقل، سیدھے سادے اور خاموش لوگوں کا بھی ہے۔ ان کے یقین نے ان پر آسانیوں کا پہلا دروازہ کھول دیا تھا۔

کومل بہت خوش تھی۔ پھوپھو نے اگلے ہفتے آکر رسم کرنے کا کہا تھا۔ الفت بے چاری گم صم سی تھی۔ نعمت نے اپنی مخصوص لاپروائی اور خوش مزاجی

کے ساتھ بہن کو مبارک باد دی۔

"لو بھئی تمہارے سپنوں کا شہزادہ آ گیا۔"

"اونہہ شہزادہ؟ یہ تو وہی ہیں جانے پہچانے، دیکھے بھالے۔" الفت کا منہ لٹکا ہوا تھا۔

"تو؟" رحمت نے اسے گھور کر دیکھا اور بھاشن دینے کی تیاری کی۔

"بی بی اگر آپ کسی اجنبی سے بھی شادی کریں گی نا تو شادی کے کچھ عرصے بعد وہ بھی جانا پہچانا اور دیکھا بھالا ہو جائے گا۔"

"بلکہ اب تو موبائل فون کی کرامت سے کوئی بھی اجنبی، شادی کے بعد نہیں بلکہ منگنی کے بعد ہی جانا پہچانا اور دیکھا بھالا ہو جاتا ہے۔" نعمت نے ٹکڑا لگایا۔

"کوئی اجنبی ہوتا، کہیں سر راہ اچانک ہمارا ٹکراؤ ہوتا یا کہیں ملاقات ہوتی۔ دھیرے دھیرے بات بڑھتی، وہ مجھے پسند کرتا پھر چاہنے لگتا۔ میں بھی اس کے پیار میں ڈوب جاتی، پھر وہ اپنے گھر میں میرا ہاتھ مانگنے آتا۔" الفت اپنے معصوم اور ادھورے خواب بیان کر رہی تھی کہ رحمت نے بات درمیان سے اچک لی۔

"پھر وہ اپنے گھر میں تمہارا ہاتھ مانگنے کی بات کرتا۔ اپنی اماں سے صلواتیں اور ابا سے دو جوتے کھاتا، پھر اس کمبخت کی محبت سے اپنے کان پکڑ کر توبہ کرتا اور ماں باپ جہاں کہتے، وہاں شادی کر لیتا۔"

"میری ایک سہیلی کی ایسی ہی ہوئی تھی لو میرج۔ وہ اس کی بائیک سے ٹکرا گئی پھر.........." اس سے پہلے کہ الفت اپنی سہیلی کی پوری لو اسٹوری سناتی، نعمت نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"خدا کا واسطہ ہے الفت! پچھلے ایک سال سے ہر دوسرے دن تیری سہیلی کی لو اسٹوری سن سن کر میرے کان پک بھی گئے اور تھک بھی گئے۔ مجھ پہ رحم کر اور میرے کانوں پہ رحم فرما دے۔"

"دفع ہو جاؤ تم۔" الفت نے برہم نظروں سے اسے دیکھا۔

"کتنا شوق تھا مجھے لو میرج کرنے کا۔ سارے ارمانوں پر پانی پھر گیا۔" الفت بے چاری نے ایک سرد آہ بھری۔ بہنیں بھی کتنی ظالم اور سنگ دل تھیں، کوئی بھی اس کا درد سمجھنے کا تیار نہیں تھی۔

"ویسے ایک سرپرائز ہے تمہارے لیے۔" رحمت نے بڑی پیاری مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

"ہوگا۔" الفت نے احتجاجاً دوسری طرف منہ پھیر لیا (جیسے اپنے خوابوں سے پھیرنا پڑ رہا تھا)۔

"یہ لو۔" رحمت الماری سے کچھ نکال کر لائی تھی۔

"کیا ہے؟" الفت نے بے زاری سے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ حسرت بھی سمٹ آئی، کاش ایسا ہی پھول کوئی بڑے پیار سے اسے دیتا۔

"یہ آپ کے لیے آئی ہے۔" رحمت نے ہاتھ میں پکڑی گلاب کی ادھ کھلی کلی اسے پکڑائی۔

"کک..... کیا مطلب؟ کہاں سے آئی ہے؟" الفت گڑبڑا گئی۔

"بھائی یاسر نے بھجوائی ہے نیک تمناؤں کے ساتھ۔ ماہم دے کر گئی تھی۔ یہ پوچھ رہی تھی کہ الفت اتنی اکھڑی اکھڑی اور بے زار کیوں لگ رہی ہے۔"

"ہاں، نوٹ کرلیا تھا اس نے کہ تم خوش نہیں لگ رہیں۔" نعمت نے ٹکڑا لگایا۔

"کوئی نہیں، ایویں اپنی طرف سے اندازے لگاتی رہتی ہے وہ۔"

الفت کا چہرہ گلابی گلابی ہو گیا جب اس نے وہ کلی رحمت کے ہاتھ سے لی۔ وہ دونوں اگلے ہفتے ہونے والی رسم میں پہنے کپڑوں اور تیاری کی باتیں کرنے میں مگن ہو گئیں اور الفت ان سے رخ موڑے اس ادھ کھلی کلی کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھتی رہی، دیکھتی رہی..... یہاں تک کہ اس کی ہر پتی میں اسے یاسر کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔

☆☆☆

چائے کا کپ لے کر وہ اپنی پسندیدہ جگہ بیٹھی تھی، یہاں سے آسمان بہت کھلا اور روشن نظر آتا تھا۔ بادلوں سے ذرا نیچے کبوتروں کی ٹکڑیاں محو پرواز تھیں۔ الشرعی کبوتروں پر نظریں جمائے وہ اپنے خیالات میں گم تھی کہ اچانک کوئی دھم سے اس کے قریب آ کر بیٹھا۔

"اف..... میری چائے۔" رحمت کو بغیر دیکھے ہی پتا چل گیا تھا کہ سلمان خان کا علاقائی ایڈیشن جو ان کے گھر میں رہتا ہے، یہاں بیٹھ کر حسب عادت اور حسب معمول اس کی چائے اٹھا چکا ہے۔

"یہ میں اپنے لیے لائی تھی۔" رحمت نے اس کی طرف چہرہ موڑ کر احتجاج کیا۔

"اور بنا لینا۔ تم لڑکیوں کے لیے کیا مشکل ہے چائے بنانا۔" حمزہ نے لاپروائی سے کہتے ہوئے چائے کا کپ منہ سے لگایا۔

"چائے بنانا لڑکوں کے لیے بھی بہت آسان ہے۔" رحمت نے اسے اطلاع دی۔

"ہوگی آسان، جب بنی بنائی چائے مل جاتی ہے تو کچن میں جانے کی زحمت کون کرے۔" حمزہ نے لاپروائی سے چائے کا گھونٹ بھرا۔

"چینی کتنی کم ڈالتی ہو؟"

"کیونکہ یہ چائے میں نے اپنے لیے بنائی تھی۔" رحمت نے دانت پیس کر اسے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"اپنے لیے بناؤ یا کسی اور کے لیے، میٹھی بنایا کرو۔" حمزہ نے چائے ختم کرتے ہوئے مفت میں مشورہ دیا۔

"کیا کام ہے؟ جلدی بولو۔" رحمت کو اندازہ تھا کہ وہ کیوں آیا ہے، ہر ہفتے پندرہ دن میں اسے سو، دو سو یا زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپے کی ضرورت پڑتی تھی اور وہ رحمت سے ادھار لیا کرتا تھا۔ ادھار واپس کرنے کے چار پانچ دن بعد پھر واپس مانگ لیتا۔

"کچھ رقم چاہیے۔" حمزہ نے سامنے آسمان کی وسعتوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"کتنے پیسے چاہئیں؟"

"ضرورت تو ڈھائی لاکھ کی ہے تم ... کر سکو، کر دو۔"

"ڈھائی لاکھ؟ نیند میں ہو یا نشے میں؟" ... تو اچھل ہی پڑی۔

"ضرورت ہے۔" حمزہ اب بالکل سنجیدہ تھا۔

"کس لیے؟"

"میں اپنا 'جم' کھولوں گا۔"

"اس کے لیے تو لاکھوں روپے چاہئیں ... کرو گے؟ کہاں سے کرو گے؟"

"آدھا بندوبست تو سمجھو ہو ہی گیا ہے۔ جس جم میں ورزش کے لیے جاتا تھا، وہ میرا اور ... ہے۔ وہ باہر جا رہا ہے۔ فیملی تو پہلے ہی باہر تھی، اس ... شوقیہ یہ کام شروع کیا تھا۔ اب وہ ساری ... اونے پونے دام میں بیچ رہا تھا، میں نے بات ... ہے۔ اس کا بندوبست تو ہو گیا ہے، امی اور ابو ... دے دیے ہیں، کچھ میری سیونگز تھی، اب مجھے ... کرائے ... تھی ہے۔ ایک جگہ دیکھ کر آیا ہوں، ... ایڈوانس کے لیے ڈھائی لاکھ چاہئیں پھر کرایہ ... ہی جائے گا۔ بہت لڑکے آئیں گے، آج کل ... بھی لڑکوں کو جنون سوار ہے ایکسر سائز کا، باڈی بنا... کا۔"

"جیسے تمہیں تھا۔" رحمت نے فقرہ کسا۔

"تھا نہیں، ہے۔" حمزہ نے تصحیح کی۔

"اتنی بڑی رقم کا انتظام تو بہت مشکل ہے۔" رحمت نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ جتنی ہو سکے، ا... رقم کا بندوبست کر دو۔"

"میں کہاں سے کروں گی، میں کوئی کما... ہوں؟" رحمت گڑبڑا گئی۔

"تایا ابو کے پاس ہوں گے؟"

"تم خود پوچھ لو۔"

"دو سے تین ہفتے کا ٹائم ہے میرے پاس ...

... اٹھانے کے لیے۔ تب تک جگہ کا بندوبست ... نہیں ہوا تو یہیں لا کر پڑی رہیں گی گھر پہ۔ یہاں تو جگہ بھی نہیں ہے، کہاں رکھوں گا۔"

"یہیں رکھ لینا، جہاں بیٹھے ہو۔" رحمت نے ... کہا تھا پھر اچانک ہی وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

"بات سنو، تم کسی دوسری جگہ ڈھائی لاکھ ایڈوانس دو گے تو اپنی چھت جو پوری خالی پڑی ہے ... کیوں نہیں بنوا لو، اچھی خاصی جگہ مل جائے گی۔" رحمت کو بیٹھے بٹھائے خیال آیا تو اس نے حمزہ کو مشورہ دیا۔

"ڈھائی لاکھ میں تو چار کمرے کھڑے ہوں گے۔ چھت ڈالنے کے لیے مزید رقم چاہیے کہاں سے ... گی۔ وہ ڈھائی لاکھ کا ہی بندوبست نہیں ہو رہا۔" حمزہ نے اس کی تجویز یکسر مسترد کر دی۔

"پلر کھڑے کرنے اور لینٹر ڈلوانے کی کیا ضرورت ہے، سیمنٹ کی چادریں ڈلوا لو یا ٹاکوں کی چھت دیکھ لو۔"

"ٹاکوں کی چھت بھی سستی نہیں پڑے گی اور سیمنٹ کی چادریں تو بالکل ہی بے کار آئیڈیا ہے۔ اے سی لگانا پڑے گا، آدھے سے زیادہ لڑکے اے سی کے چکر میں آتے ہیں۔ سیمنٹ کی چادروں میں اے سی کہاں لگاؤں گا پھر ساری 'ٹھنڈ' بھی خراب ہوگی۔ جگہ کا 'لک' بھی تو اچھا ہونا چاہیے۔" حمزہ نے یہ مشورہ بھی یکسر مسترد کر دیا۔

"تھرماپول لگا لینا، چھت نظر ہی نہیں آئے گی کیسی ہے اور اے سی بھی لگ جائے گا۔" رحمت کا دماغ خوب کام کر رہا تھا۔

حمزہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے اپنا سر کھجایا۔

"اچھی بات ہے کہ آج سے پہلے تک مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم عقل کی بات بھی کر سکتی ہو۔"

"سارے بے عقلوں کو ہر کوئی اپنے جیسا ہی لگتا ہے۔" رحمت کی تو جان ہی جل کر رہ گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سوچتا ہوں اس آئیڈیے پہ۔" حمزہ نے جاتی ہوئی رحمت کو مخاطب کیا۔

"میری بلا سے، سوچو یا نہ سوچو۔" رحمت بغیر کوئی جواب دیے دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر گئی۔

☆☆☆

گھر میں خوشی اور گہما گہمی تھی۔ پھپھو رسم کرنے آئی تھیں۔ بس گھر کے ہی افراد تھے، سدرہ اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھی۔ چھت پہ سارا انتظام کیا گیا تھا۔ قریبی قریبی رشتہ داروں کو بلایا تھا پھر بھی ٹھیک ٹھاک لوگ ہو گئے تھے۔

کومل اور الفت تیار ہو کر آئی تھیں اور اب ایک ساتھ بیٹھی تھیں۔ دونوں بہت اچھی لگ رہی تھیں اور شرما بھی رہی تھیں۔ تقریب کی رونق دوبالا کرنے کے لیے تاشیر اور یاسر بھی خوب تیار ہو کر تشریف لائے تھے اور پھپھو سب کے آگے صفائیاں پیش کر رہی تھیں۔

"منع کیا تھا میں نے کہ یوں جانا اچھا نہیں لگے گا، ابھی گھر پر ہی تھو، مگر یہ آج کل کے لڑکے، مانتے کہاں ہیں کسی کی۔ کہنے لگے کہ ان لڑکیوں کی منگنی کہیں اور ہوتی تب بھی تو جاتے ہی، ہم تو اپنی نانی اور ماموں کے گھر جا رہے ہیں، سسرال نہیں۔"

"اچھا بس یہ کہانیاں بند کر، آ گئے تو آ گئے۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں بچے ان کی نانی کا گھر ہے۔" دادی نے بیٹی کی تقریر سے بے زار ہو کر انہیں ٹوک دیا۔

"کوئی بات نہیں آپا! بچوں کا اپنا گھر ہے، آج کل تو ویسے بھی لوگ بہت ماڈرن ہوئے پڑے ہیں، لڑکے خود ہی انگوٹھیاں پہنا رہے ہیں اپنی منگیتروں کو۔" فہمیدہ چچی نے پھپھو کو مخاطب کیا۔

"ہائے، کتنا رومینٹک لگے گا اگر ایسا ہو جائے تو۔" الفت کے دل میں گدگدی ہوئی۔

"کون کے انگوٹھی پہنا رہا ہے؟" ابو نے اپنی گرج دار آواز میں استفسار کیا۔

"کوئی نہیں، یوں ہی بات کر رہے تھے کہ آج کل تو نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے دنیا میں۔" فہمیدہ چچی

نے گھبرا کر وضاحت پیش کی۔

"ہوں!" وہ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔ کون مہمان آ گیا اور کون رہ گیا، پھر جملہ حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

"دنیا میں بھلے کچھ ہوتا رہے ہمارے گھر وہ سب نہیں ہوگا، چلو آپا بسم اللہ کرو اور سب کا منہ میٹھا کراؤ۔"

"ہاں ہاں کر رہی ہوں۔" ماجدہ پھپھو نے گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھا، مٹھائی کا ڈبا کہاں رکھ دیا؟ بھائی صاحب تھے تو ان سے چھوٹے مگر مزاج، طنطنہ اور تیور اپنی والدہ ماجدہ سے ورثے میں ملے تھے۔

سب کا منہ میٹھا کیا گیا اس سے پہلے دونوں لڑکیوں کا، بسم اللہ پڑھ کر پھپھو نے باری باری دونوں کو انگوٹھیاں پہنائیں، پھر ایک ایک کر کے ساری رشتہ دار خواتین الفت اور کومل کو مٹھائی کھلانے لگیں۔

"اگر اس مٹھائی کی جگہ کوئی پیزا یا تکہ وغیرہ ہی رکھ دیتے تو کتنا اچھا ہوتا، مٹھائی کھا کھا کر طبیعت مالش کرنے لگی ہے۔" موقع پا کر الفت نے کومل کے کان میں سرگوشی کی۔

"خوشی کے موقع پہ مٹھائی ہی کھائی کھلائی جاتی ہے، بے وقوف۔" کومل نے اسے گھُرکا۔

ادھر یاسر رحمت کے سر ہو رہا تھا۔

"ایک سیلفی کا بندوبست کرا دے، بہن نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں ابو کو پتا چل گیا نا تو اف......!" رحمت نے جھرجھری لی۔

"ارے کچھ نہیں ہوتا، لوگ تو منگنیوں میں پوری پوری البم شوٹ کروا رہے ہیں۔ ایسے ایسے پوز بناتے ہیں کہ شادی پہ بھی کیا بنتے ہوں گے۔"

"مگر یہاں ایسی کوئی کہانی نہیں ہے اور ویسے بھی اس گھر میں ایسا کوئی خفیہ اور خاموش مقام نہیں جہاں آپ سیلفیاں لے لیں اور کسی کی نظروں میں بھی نہ آئیں۔" رحمت نے صاف انکار کیا۔

"اپنے لالا سے کم ہٹلر نہیں ہو تم۔" یاسر نے اسے گھور کے دیکھا۔

"اچھا دو منٹ کی ملاقات تو کرا دو، مبارک[باد] دے دوں۔"

"میں پہنچا دوں گی آپ کی مبارک باد اور کہ..."

"اللہ تجھے سمجھے پھولن دیوی۔"

"آپ ادھر جا کر سب کے ساتھ بیٹھ جاؤ، د[یکھو] تاثیر بھائی کتنی شرافت سے بیٹھے ہیں وہاں۔" ر[حمت] نے سامنے اشارہ کیا جہاں مردانہ محفل جمی تھی۔

"اتنے شریف بھی نہیں ہیں ہمارے بھا[ئی] صاحب۔ موبائل لا رہے تھے کومل کو گفٹ کرنے کے لیے، اماں نے پکڑ لیا۔" یاسر کے انکشاف پہ رحمت [کو] ہنسی آ گئی۔

"تم لڑکے بھی نا، ایویں اتاؤلے باؤ[لے] ہو جاتے ہو۔" رحمت نے دادی کی زبان استعما[ل] کی۔

"تم لڑکیاں ہی بناتی ہو ہمیں اتاؤلا باؤلا۔" یاسر نے ترنت جواب دیا۔

"اچھا بھئی میں تو چلی، اس سے پہلے کہ کو[ئی] یہاں آ کر تفتیش کرے کہ ہم یہاں کھڑے کیا [باتیں] بنا رہے ہیں۔" رحمت وہاں سے کھسکی۔

"اللہ کرے رحمت! تیری شادی جس سے ہو اس سے تیری نہ بات ہو، نہ ملاقات بلکہ شکل بھی شادی کے بعد ہی دیکھے۔" یاسر جل بھن کر کباب ہو گیا تھا اور جلے دل سے آہوں اور دھوئیں کے علاوہ بد دعا ہی نکلتی ہے۔

"اچھا؟" رحمت نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔ "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ہیں؟" قریب آتا حمزہ یاسر کی بد دعا اور رحمت کا جواب سن چکا تھا۔ اس سوال جواب سے اسے کچھ محسوس ہوا تھا، پتا نہیں کیا؟

خیروخوبی اور خوشی کے ساتھ تقریب نمٹ گئی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد سب کے سب مل کر پھیلاوا سمیٹ رہے تھے، سوائے الفت اور کومل کے۔ [جو] آج کی مہمان خصوصی تھیں سو آج کے دن انہیں [کام سے] استثنا دے دیا گیا۔

بلال دیگوں میں سے بچی ہوئی بریانی اور چکن کڑھائی نکال رہا تھا۔

"اے لڑکی ادھر آ، یہ میٹھے کا تھال پیچھے لے کر چلو، میں یہ کھانا لا رہا ہوں۔" بلال نے قریب سے گزرتی نعمت کو مخاطب کیا۔

"کتنا بچا ہے؟" نعمت نے قریب آ کر میٹھے کا تھال دیکھا۔

"اتنا سا؟"

"یہی بچا ہے، سالن تو بہت بچ گیا، کسی نے احتیاط سے کھایا ہی نہیں بالکل بھی اچھا نہیں تھا۔ اس سے اچھا تو تم گھر میں بنا لیتی ہو، خود ہی بنا لیتیں، پانچ کلو چکن کی کڑھائی۔"

"بہت فارغ نظر آ رہی ہوں تمہیں، گھر کی تقریب تھی۔ اپنی تیاریاں کرتی یا دیگیں کھڑکاتی؟" نعمت نے اسے گھورا۔

"سدرہ کی دعوت میں پکائی تھی نا، ویسی ہی پکا لیتیں۔ سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔" بلال لڑکوں میں سے تھا جنہیں لڑکیوں کی شکلیں بھلے یاد نہ رہیں مگر کھانوں کے ذائقے ضرور یاد رہتے تھے۔

"سچ کہتی ہے رحمت اچھا بھلا دل تو بس کھانے پینے میں ہی اٹکا رہتا ہے۔" نعمت ایک صاف پلیٹ ڈھونڈ کر اس میں تھوڑا سا میٹھا نکال رہی تھی، کھانے کے وقت تو ٹھیک سے کھایا ہی نہیں گیا تھا۔

"تو؟ اور کہاں اٹکے گا دل؟" بلال کی حیرت بھری نظروں میں بڑی معصومیت تھی، مگر نعمت یہ حرکت اور معصومیت دیکھنے سے قاصر تھی۔ اس کا سارا دھیان اور ساری توجہ اپنی پلیٹ کی طرف تھی۔

"میں یہ پتیلیاں پیچھے لے جا کر رکھ رہا ہوں، اس میں سے ہمارے لیے کھانا نکال دینا اور تھوڑے سے چاول گرم کر دینا۔ کھانا تو ٹھیک سے کھایا ہی نہیں تھا۔" بلال پتیلا اٹھانے لگا۔

"بریانی کی چار پلیٹیں کھا کر بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تم نے؟"

"تم میرے نوالے گن رہی تھیں؟" بلال ششدر ہوا۔

"نوالے نہیں، پلیٹیں۔" نعمت نے تصحیح کی اور میٹھے کا تھال اٹھا کر آگے آگے چل دی۔

☆☆☆

الفت اور کومل کی منگنی کے بعد دادی کو ایک بار پھر نعمت کی فکر نے ستایا ہوا تھا۔

"ارے لوگ چاہے اپنے ہی کیوں نہ ہوں، اچھا اچھا مال چھانٹ لیتے ہیں اب ماجدہ کو ہی دیکھ لو، ہے تو میری بیٹی مگر سچ تو سچ ہے، بڑی دونوں کو چھوڑ کر تیسری پہ ہاتھ ڈالا جو سب سے خوب صورت ہے۔"

دادی اپنے پلنگ پہ بیٹھی بیٹھی ایک بار پھر تقریر فرما رہی تھیں، اور ان کی تقریر سننے کے لیے ان کے آس پاس ہونا ضروری نہیں، وہ گھر کے کسی بھی کونے کھدرے میں با آسانی سنی جا سکتی تھی۔

"اے کیسی ماں ہو تم لڑکیوں کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔" بہو بیگم کسی کام سے کمرے میں آئیں تو دادی ان پر ہی برس پڑیں۔

"کیا کروں اماں؟" وہ حواس باختہ سی ہو گئیں۔

"فکر کرو، کہیں کوشش کرو، اور کیا کرو گی؟" دادی کو ٹھیک ٹھاک غصہ آ رہا تھا۔

"چھوٹی بہن کا رشتہ ہو گیا، بڑی ابھی بیٹھی ہیں، جانے کیا ہوگا ان کا؟"

"اللہ مالک ہے اماں، فکر نہ کریں۔" دال چنتی امی نے دبی زبان سے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی جو مہنگی پڑ گئی، دادی الٹا ان ہی پہ بگڑ گئیں۔

"تم میاں بیوی تو فکر کرتے ہی نہیں ہو، میں بھی فکر نہ کروں؟ سینے پہ دو پہاڑ دھرے ہیں، سرکانے ہیں یا نہیں؟" دادی کی زبان چلتی تو بس چلتی ہی چلی جاتی، ان کے آگے دم مارنے کی مجال کسے تھی، بہو بیگم خاموش ہو گئیں۔

"اب کچھ بولو گی بھی یا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے

بیٹھی رہوگی؟" ان کی خاموشی پہ دادی جھنجلا اٹھیں۔
"میں کیا کہوں؟" بہو بیگم نے بے بسی سے ساس کو دیکھا۔
"اس کو بلاؤ، وہ نگوڑ ماری، کیا نام ہے اس کا وہ جو رشتے کراتی ہے، کئی ہفتوں سے اس نے بھی خیر خبر نہیں لی، دو چار رشتے دکھا دکھو کے غائب ہوگئی۔" اب دادی کا غصہ دوچولن پہ اتر رہا تھا۔
"میں کہلوادوں گی، کسی سے......" بہو بیگم نے دھیمی آواز میں جواب دیا مگر ان کے کہلوانے سے پہلے ہی دو روز بعد دوچولن خود آگئی۔
"کہاں مرگئی تھی؟" دادی کسی کو کچھ بھی کہہ سکتی تھیں اور کہنے سے چوکتی نہیں تھیں، مزے کی بات یہ کہ کوئی ان کی باتوں کا برا ابھی نہیں مانتا تھا۔
"ان ہی بچیوں کے لیے کوشش کر رہی تھی دادی، اپنے پاس سے کرایہ لگا کر کئی جگہ جا کر رشتے دیکھے ہیں، خوش خبری لے کر آئی ہوں۔" وہ رازداری سے آگے کو جھک کر دادی کو تفصیل بتانے لگی۔
"لے آنا مہمانوں کو، دیکھ لیتے ہیں۔" دادی نے آمادگی ظاہر کی۔
وہ اگلے روز ہی لے آئی، مہمان بھی کیا تھے، ایک وہ امیدوار اور ایک اس کی رشتے کی کوئی خالہ یا چچی وغیرہ تھیں، بہنیں گھر بار کی تھیں دو چار جگہ اپنے بھائی کے لیے رشتے دیکھے تھے مگر ہر ایک میں انہیں کوئی نہ کوئی نقص نظر آجاتا تھا تو یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ رہی تھی۔ لہٰذا صاحب موصوف نے خود ہی کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔
"میرے گھر اور میرے بچوں کو دیکھنے والی، سنبھالنے والی کوئی چاہیے، بہنیں ایسی لڑکی دیکھ رہی ہیں جیسے میں کوئی کنوارا چھیل چھبیلا ہوں، میری تو کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے، بس یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی زور زبردستی نہ ہو۔"
دانش صاحب نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا اور دادی کو یہ صاف گوئی اچھی لگی، امیدوار بھی ٹھیک ٹھاک ہی لگے۔
"پھر میں آؤں گی اپنے بیٹے بہو کے ... بار دیکھنے۔" مہمانوں کی روانگی کے وقت دادی نے عندیہ دیا۔

☆☆☆

ناشتے میں جلا ہوا پراٹھا اور اس سے ... چائے، بلال کو کیا ضرورت تھی بدمزہ چیزیں زہر مار کرنے کی، ایک نوالہ کھا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹرے کچن میں رکھ کر دینے چلا آیا۔
نعمت وہیں تھی جہاں وہ اکثر پائی جاتی تھی، کچن میں۔ بلال وہیں چلا آیا، چھوٹا سا باورچی خانہ ... کے وجود کا متحمل نہیں تھا وہ دروازے کے بیچوں بیچ ... ہوگیا۔
"چائے مل جائے گی ایک کپ؟"
پیچھے مڑ کر بیٹھی نعمت نے بے اختیاری سر اٹھایا تھا۔ چہرہ کیا گیلا سا ہو رہا تھا۔ بلال کو لگا وہ رو رہی تھی۔ اس نے نیچے نظر دوڑائی۔ پیاز تو کہیں نظر نہیں آئی جسے کاٹنے کے دوران اکثر اس کے آنسو نکل آتے تھے۔
"بنا دیتی ہوں۔" بغیر کسی پس و پیش کے اس نے چولہا جلا کر چائے کا پانی رکھ دیا۔
"ناشتہ کر کے آئے ہو؟" بلال کی طرف دیکھے بغیر وہ رخ موڑ کر پتی چینی کا ڈبا کھول رہی تھی، آواز بھی بھاری بھاری سی ہو رہی تھی۔
"نہیں۔"
"تو؟ خالی چائے پیو گے؟" وہ چولہے پر رکھے پانی کو دیکھنے لگی، جو بتدریج گرم ہو رہا تھا۔
"کچھ لے آؤں گا، پاپے یا باقر خانی وغیرہ۔"
بلال کو کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہو رہا تھا مگر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا؟
"فریج سے آٹا نکال کر لا دو، پراٹھا بنا دیتی ہوں۔"
بلال نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔
"تم رو کیوں رہی تھیں؟" پیڑا بناتی نعمت سے سوال ہوا۔

"جب تمہاری شادی دو بچوں کے باپ سے ہو گی تو تم بھی روؤ گے ہنسو گے نہیں۔" نعمت بہت ... دادی اور باپ کے سامنے کچھ بولنے کی مجال تھی نہیں، جس نے سوال کیا اسی پر برس پڑی۔
"لاحول ولا قوۃ، میری شادی کیوں ہو گی دو بچوں کے باپ سے؟" بلال گڑبڑا گیا۔
"ہاں تو دو بچوں کی اماں سے۔" پیڑا بیلتے ہوئے نعمت نے تصحیح کی۔
"اللہ نہ کرے۔" بلال برا مان گیا۔
"مگر میرے معاملے میں تو اللہ بھی کر رہا ہے اور بندے بھی۔" نعمت نے پیڑے کے اندر گھی بھرا اور اسے بند کرنے لگی۔
"تمہاری شادی ہو رہی ہے؟" بلال کو پوری کہانی میں یہی بات قابل غور لگی۔
"ہاں۔"
"تو...... یہاں کون کام کرے گا؟" بلال بے اختیار بولا تھا۔
"کون سا کام؟"
"میرا مطلب ہے کچن کون سنبھالے گا، مجھے تو تمہارے ہاتھ کے سوا کسی اور کا پکا ہوا اب اچھا بھی نہیں لگتا۔" بلال نے بڑی سادگی سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا اور نعمت سر سے پاؤں تک اچھی طرح جل بھن کر رہ گئی تھی، جی تو چاہ رہا تھا کہ یہ پراٹھا بھی ایسے ہی جلا دے۔
"آجایا کرنا وہاں، پکا پکا کر کھلا دیا کروں گی۔" اس نے دانت پیسے۔
"کہاں؟"
"میری سسرال۔" پراٹھا سینک کر اس نے ٹرے میں رکھا، ابلتی ہوئی چائے مگ میں انڈیلا اور ٹرے بھی تقریباً اس کے آگے پٹخ ہی دی۔ "لے جاؤ۔"
بلال چپ چاپ ٹرے اٹھا کر چل دیا۔ بھوک لگ رہی ہو تو اس کا دماغ زیادہ کام نہیں کرتا تھا۔ رغبت سے ناشتہ کرتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا۔
ناشتہ کر کے وہ دکان پہ چلا گیا، باپ کی اسپیئر پارٹس کی دکان تھی، جیسے تیسے انٹر کر کے وہ دکان پہ بیٹھ رہا تھا اور باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ شارق کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کر کے چار چھ گھنٹے دکان پہ بٹھا ہی لیتا۔ حمزہ گھر کی چھت پر کام کروا رہا تھا، وہ اپنا کام کرنے کا شوقین تھا، اس کے تو دل کی مراد پوری ہو رہی تھی، اب مسئلہ تھا بلال کے دل کا، جس میں نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔
نعمت کی شادی کی خبر نے اسے بیٹھے بٹھائے سوچ میں ڈال دیا تھا۔ اڑتی اڑتی سنی تو تھی کہ نعمت کے رشتے کے لیے کوششیں ہو رہی ہیں، مہمان آرہے ہیں دیکھنے، وہ بھی امی اور کول باتیں کر رہی تھیں تو بلال نے سنا تھا اس سے آگے کیا ہوا، نہ اسے پتا چلا، نہ اس نے جاننے میں دلچسپی لی۔ مگر اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ پانی شاید سر سے اونچا ہو رہا ہے۔

☆☆☆

مزدور کام کر کے جا چکے تھے، شام کے سائے پھیلے ضرور تھے مگر گہرے نہیں ہوئے تھے، رحمت اوپر آگئی، وہ یہ دیکھنے آئی تھی کہ تعمیرات کا کام کہاں تک پہنچا، حمزہ نے رقم کا بندوبست کر ہی لیا تھا، پھر وہ ایسا کام کروا رہا تھا کہ جس میں ہلدی، پھٹکری کم سے کم لگے اور رنگ چوکھا آجائے، تو رحمت کی تجویز کی بدولت کچھ اس طرح ممکن ہو گیا تھا۔
رحمت اوپر آئی تو گھوم پھر کے جائزہ لینے لگی۔ چھت اب کھلی چھت نہیں رہی تھی، اسے ڈھک دیا گیا تھا اور نیچے سے ایک پورے اور وسیع و عریض ہال کی شکل دی جا رہی تھی۔ وہ گھوم پھر کر ادھر ادھر جائزہ لیتی رہی، پھر تھک کر ایک جگہ ٹک گئی۔
"چلو کسی کے تو خواب پورے ہوں۔" یاسیت میں گھری سوچ رہی تھی، بار بار اسے نعمت کا خیال آرہا تھا۔ دادی کو جلدی تھی۔ وہ جو کچھ کر رہی تھیں اور کرنا چاہ رہی تھیں، اس کے لیے ان کے اپنے دلائل تھے، وہ عمر رسیدہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ خاتون تھیں زندگی اور لوگوں کو برتنے کا ایک وسیع تجربہ تھا ان کے پاس،

وہ حقیقت پسند تھیں، بے رحمی کی حد تک حقیقت پسند......

وہ خوابوں، خیالوں کی دنیا میں نہیں رہتی تھیں مگر نوعمر لڑکیوں کے دل تو خوابوں کے محل پہ ہی دھڑکتے تھے، ان کی آنکھوں کو خواب دیکھنے سے کوئی کیسے روک سکتا تھا۔ اچھے گمان اور امید بھرے دل ان کے قیمتی اثاثے تھے۔ دنیا والوں کے بعض معاملات، قاعدے قانون، طور طریقے اور رسم و رواج بہت تکلیف دہ اور ظالم تھے خصوصاً لڑکیوں کے لیے اور جتنی تکلیف بیٹیاں اٹھاتی ہیں اس سے کہیں زیادہ دل ان کی ماؤں کے دکھتے ہیں اور پریشانی کے آسیب باپوں کے دلوں کو بھی اپنے گھیرے میں لیے رہتے ہیں جسے وہ کبھی بھی اپنے رعب اور سخت گیری کے پردوں میں چھپا لیتے ہیں۔

رحمت بہت کچھ سوچ رہی تھی، ایک لڑکی کی قابلیت، صلاحیت، محنت، اچھی سیرت بھی اس کی گہری رنگت میں کھو جاتی ہے کہیں اس کے پہاڑ جیسے وجود میں چھپ جاتی ہے، تو کبھی یہی اہلیت اور غربت اس کی اچھائیوں اور خوبیوں کو نگل لیتی ہے۔ زندگی کی حقیقت کتنی سنگلاخ اور خاک سی، لڑکیوں کی آنکھیں خوش رنگ خواب دیکھنے سے باز نہیں آتیں، نعمت کے آنسو، ماں کو اور بہنوں کو تکلیف دے رہے تھے مگر کسی کے بس میں کچھ نہ تھا اس اعتراض اور انکار کی جرات کرنے کی کوشش کی، دادی کے دلائل نے انہیں چاروں شانے چت کر دیا۔ "عمر اور بڑھ جائے گی تو اس سے بھی جائے گی۔"

"اللہ سے اچھی امید رکھو بیٹا اماں!" امی تو ڈھے سی گئیں۔

"اچھی امید اور خوش فہمی میں فرق ہوتا ہے۔" دادی کی اپنی ایک منطق تھی۔

رحمت کتنی ہی دیر اپنی سوچوں میں گم بیٹھی رہی، شام کے سائے گہرے اور لمبے ہو رہے تھے، اس کے خیالات اور حالات کی طرح، اپنے خیالات میں تھی اسے پتہ بھی نہیں چلا، وہ کب سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا اور اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"تم اس وقت کیا کر رہی ہو ادھر ... مغرب ہونے والی ہے۔" وہ حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"میں بس نیچے ہی جا رہی ہوں ... تمہارا کام کہاں تک پہنچا۔" رحمت اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تقریباً ہو ہی گیا، ویسے تمہارا آئیڈیا ... گیا۔"

"پھر بھی ہم لڑکیوں کی کوئی قدر ہی نہیں۔" بے اختیار رحمت کی زبان سے پھسلا۔

"ارے ایسی کیا بات ہے، میرے دل سے پوچھو، کتنی قدر و قیمت ہے تمہاری۔" حمزہ ... ہنسا تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ، تمہارے جم میں لڑکیاں بھی ایکسرسائز کر سکتی ہیں نا؟"

"بالکل، لڑکوں سے الگ، ٹائمنگ ہو گی، مگر نہیں لگتا کہ ہمارے علاقے کی لڑکیاں یہاں آئیں گی، ادھر ابھی اتنا رجحان ہے نہیں۔"

"علاقے کی لڑکیوں کی کون بات کر رہا ہے، میں تو نعمت کی بات کر رہی ہوں، اگر وہ باقاعدگی سے ایکسرسائز کرے تو کتنے عرصے میں وزن کم ہو جائے گا؟" رحمت کو انوکھے خیال آتے ہی رہتے تھے۔

"صرف ایکسرسائز سے کام نہیں چلتا، ڈائٹ پلان بھی بہت اہم ہوتا ہے، مستقل مزاجی سے محنت کی جائے تو کوئی کام ناممکن نہیں ہے۔" حمزہ نے سنجیدگی سے کہا "اور صرف نعمت ہی کیوں، وہ جو ہمارا پہلوان ہے بلال، اسے بھی ایکسرسائز کروائی جائے دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔"

"ہاں!" رحمت نے اس کی بات پہ دھیان دیے بغیر اثبات میں سر ہلایا اسے ایک اور خیال آیا تھا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ ایکسرسائز کے لیے لڑکیاں اور خواتین بھی آ سکتی ہیں تم کسی ٹرینڈ لڑکی کو رکھ لو، اپنی صنف کو دیکھ کر خواتین آسانی سے آ جائیں گی۔"

"... وہ کے بھی خوشی خوشی آئیں گے۔" حمزہ نے ...

... فضا میں پرندوں کی چہکار گونجنے لگی تھی گھروں کو لوٹتے پنچھی آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

"میں جا رہی ہوں، اذانیں ہونے والی ہیں۔" ... دوپٹہ ٹھیک کرتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف ... حمزہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بڑھ گیا۔

☆☆☆

کومل پہلی بھی تھی اور پیٹ کی ہلکی بھی، بات کسی کی بھی ہو، کہیں کی بھی ہو، کسی کے متعلق ہو، وہ اپنے ... میں نہیں رکھ سکتی تھی، الفت سے تو خاص ... کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔ الفت کے پاس آ ... کے مطابق چٹکے چٹکے اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور چلی گئی، اس ادھر ادھر کی باتوں میں ... ایک خاص بات تھی جو اس نے بے حد ... انداز میں الفت کے گوش گزار کی۔

"امی نے وجیہہ سے بلال بھائی کے لیے کوئی لڑکی دیکھنے کو کہا تھا اور حمزہ بھائی کے لیے، حمزہ بھائی نے تو منع کر دیا کہ ابھی وہ فی الحال اپنا کام سیٹ کر رہے ہیں، ابھی شادی وادی اور رشتے کے چکر سے ... دور رکھیں — بلال بھائی فوراً راضی ہو گئے، امی ... کہ ادھر ادھر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے ... گھر میں لڑکی موجود ہے اسے دیکھ لیں۔"

"کون؟" الفت بے اختیار چونکی۔

"نعمت اور کون؟ بھائی کہہ رہے تھے کہ اتنی ... کرتی ہے چٹنی بھی ... ہوتی ہے۔"

"ہائے......!" الفت کے دل میں گدگدی ہوئی وہی کہانیوں والی سچویشن۔

"پھر؟" اس نے بڑی بے چینی سے آگے کا حال دریافت کیا۔

"پھر کیا، امی نے کہا کہ وہ تو تم سے دو مہینے بڑی ہے اور موٹی بھی ہے لوگ کیا کہیں گے بیٹے کے لیے کوئی ڈھنگ کی لڑکی نہیں ملی۔"

"اچھا!" الفت بے چاری مایوس ہو گئی۔ "یہ تو بالکل ہی کہانیوں والی سچویشن ہے، ظالم سماج بلکہ ولن بیچ میں آ گیا۔"

"آئی ایم سوری یار، مجھے بھی امی کی بات اچھی نہیں لگی، مگر بھائی خود ہی چپ ہو گئے تو میں بھی خاموش رہی، اگر انہیں انٹرسٹ ہے نعمت میں، تو تھوڑی سی فائٹ تو کرنی چاہیے تھی نا، وہ تو خاموشی سے چلے گئے۔"

کومل یہ قصہ ختم کر کے اب ایک اور نیا قصہ شروع کر رہی تھی۔

رحمت تک بات پہنچ گئی۔

"اچھا، دو مہینے بڑی ہے تو کیا ہوا، دنیا بھر کی کئی مشہور خواتین اپنے اپنے میاؤں سے بڑی ہی ہیں۔" پالک کی گڈی بنا کر کاٹتے ہوئے وہ اتنے زور سے بول رہی تھی کہ اوپر آواز نہ جائے مگر سامنے بیٹھے بلال تک ضرور پہنچ جائے، جس نے چار آلو اپنے کچن سے لا کر نعمت کو دیے تھے کہ ان کی ٹکیاں بنا دے۔ اس کی ترکاری پک رہی تھی اور وہ انتظار میں بیٹھا تھا ادھر رحمت کھٹا کھٹ سبزی کاٹ رہی تھی اور چھری کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی چل رہی تھی۔

"اب لیڈی ڈیانا کی دونوں بہوؤں کو دیکھ لو، دونوں اپنے اپنے میاؤں سے بڑی ہیں، ایشوریہ رائے اور انوشکا شرما بھی اور وہ جو ابھی منگنی ہوئی ہے پریانکا چوپڑا اور نک جونس کی، وہ تو دس سال چھوٹا ہے۔" رحمت کو اس وقت ساری مثالیں یاد آ رہی تھیں۔

"پاکستان کی بھی کوئی مثال ہے یا نہیں؟" بلال جھنجلایا، امی کو بتانے کے لیے کچھ تو ہو۔

"پاکستان کی؟ ہاں کیوں نہیں، ہو گی ضرور ہو گی بلکہ ہونی چاہیے۔" رحمت کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا، شوبز سے لے کر کرکٹ سارے مشہور "کپلز" جو یاد آ رہے تھے، کھنگال لیے مگر ایسی کوئی مثال ذہن

میں نہیں آئی۔
"افوہ......!" وہ جھنجلائی، اچانک دماغ میں ایک نام چمکا۔
"ثانیہ مرزا اور شعیب ملک؟"
"نہیں بھئی، وہ تو شعیب ملک کے چہرے پہ ہی اتنی معصومیت بھری بے چارگی ہر وقت چھائی رہتی ہے اس لیے وہ چھوٹا لگتا ہے۔" الفت نے نفی میں سر ہلایا۔
"اچھا ہاں، ابھی کچھ عرصے پہلے ایک ٹی وی ایکٹریس کی شادی ہوئی تھی، وہ بھی اپنے میاں سے بڑی ہے، میں نے مارننگ شو میں دیکھا تھا دونوں آئے تھے، نام یاد نہیں آرہا۔" رحمت اپنے ذہن پہ زور دے دے کر تھک گئی۔
"مارننگ شو میں دیکھا تھا؟ پھر تو امی کو ضرور یاد ہوگا وہ تو کوئی مارننگ شو نہیں چھوڑتیں، ریپیٹ میں بھی دیکھتی ہیں۔" بلال نے اطمینان سے کہا۔
"ایک درجن سے زیادہ مارننگ شوز آتے ہیں روزانہ ٹی وی پر، اب پتا نہیں کس پر آیا تھا؟"
رحمت نے تشویش کا اظہار کیا، مگر بلال کو کوئی خاص تشویش نہیں تھی۔
دراصل وہ اتنا بھوندو بھی نہیں تھا جتنا کہ نظر آتا تھا تھوڑی بہت عقل تھی اس میں، جسے استعمال کرتے ہوئے اس نے ماں سے زیادہ بحث کرنے کی کوشش نہیں کی، اس کے بجائے وہ سیدھا باپ کے پاس گیا اور ان کی خدمت میں اپنی عرض داشت پیش کی۔ بچے کا معاملہ تھا، خون نے جوش مارا، انہوں نے بیٹے کو یقین دلا دیا تھا کہ بیگم صاحبہ کو راضی کر کے اس کی نیا ضرور پار لگا دیں گے۔
نعمت اس ساری کہانی سے بے خبر بجھے دل سے زیرے اور کلونجی کے بگھار والی ترکاری تیار کرنے میں جتی ہوئی تھی۔ ہاں، رحمت کی آواز ضرور اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اور وہ بے زاری سے سوچ رہی تھی۔
"جبھی بھی تو رحمت بالکل ہی فضول باتیں کرنے بیٹھ جاتی ہے؟"

☆☆☆

اتوار کو دادی اور امی ابو کو دانش صا... جانا تھا اتوار آنے میں ابھی ایک دن باقی... سے چچا اور چچی نیچے اتر کر دادی اور بھا... پاس آگئے اور نعمت کے لیے دست سوال... پل بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
نعمت الفت بد گمان تھی، اس بھو... کوئی "بہت" تک نہیں دیا تھا کہ وہ... "حرکت" کرنے والا ہے۔ الفت حیران... میں تو اتنی جلدی مسائل حل نہیں ہوتے... تو بڑا ہی نرم دل یا بزدل نکلا، فوراً ہی گھٹنے ٹیک... رحمت بھی خوش تھی۔
"لگتا ہے میری تقریر کام آگئی ہے۔" ... خوش فہم ہو کر سوچا۔
دادی بڑے خوش گوار موڈ میں بیٹھی... باتیں کر رہی تھیں۔
"تمنا تو میری بھی تھی کہ گھر کی لڑکیاں... کھپ جائیں۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش رہتی... تو اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ ان سے زور زبردستی... کر سکتا ہے؟ چلو خیر، اللہ کا شکر ہے ایسا نے... کیا، مجھے اس لڑکی کی سب سے زیادہ فکر تھی۔"
دادی کی سخت گیری اور جلد بازی کے پیچھے... محبت اور فکر چھپی تھی وہ اب محسوس ہو رہی تھی۔
"تمہارے گھر میں رشتوں کے معاملے... الٹی گنگا چل رہی ہے، پہلے الفت، پھر نعمت اب ر... کی باری ہے۔" کومل نیچے آئی ہوئی تھی۔ رشتے... شادیوں پہ تبصرے ہو رہے تھے۔
"اب دیکھو رحمت بی کا نصیب کس سے کھ... ہے دور دیس کا کوئی شہزادہ کیا آئے گا؟"
"کوئی نہ کوئی شریف انسان تو دنیا میں آیا ہی... کا مجھ نا چیز کے لیے بھی۔ کبھی کبھی خوشیاں ہمارے آ... پاس ہی ہوتی ہیں، وقت آنے پر مل ہی جاتی ہیں۔"
رحمت اپنے سوٹ کی کٹنگ کر رہی تھی جواب دے... جھک گئی، چاک سے نشان لگا... کانوں میں مانوس سی آواز آئی۔
"ذرا اس کی کڑاہی بنا دینا، وہ گھنٹے بعد لینے آئیں گی۔" بلال صاحب چکن کی تھیلی نعمت کو پکڑا رہے تھے۔
"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" رحمت نے اسے...
"یہ چکن دینے آیا تھا، کیوں؟" بلال حیران...
"اب تمہارا نیچے آنا منع ہے، جو بھی کام ہو، کومل... کرو۔" رحمت نے از حد سنجیدہ منہ بنایا۔
"ٹھیک ہے، میرا نیچے آنا منع ہے تو اسے اوپر... آنا منع نہیں ہے نا؟" پھر تو بلال کا بھی... آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔
"ارے، تمہارے منہ میں تو زبان بھی...
"زبان تو پہلے بھی تھی، استعمال کم کرتا تھا، وہ... کے بعد آجاؤں؟" رحمت کو جواب دے کر وہ نعمت سے مخاطب ہوا۔
"ہاں!" نعمت نے اثبات میں سر ہلایا، اس کے سانولے چہرے پہ سرخی چھا رہی تھی۔ بلال کی نظریں اور انداز بہت الگ، بہت مختلف تھے۔
رحمت نے بہت احتیاط سے سوٹ کی کٹنگ مکمل کر لی تھی۔ بلال کے جانے کے بعد نعمت کچن میں چلی گئی، الفت اور کومل ہمیشہ کی طرح سر جوڑے آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔

★★★

گھر میں آنے والی نئی خوشی کا ذائقہ ابھی تازہ ہی تھا کہ دادی اچانک بیمار پڑ گئیں۔ اچانک پڑنے والے دل کے دورے نے سارے کس بل نکال دیے تھے۔ وہ تو بستر کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ خاموش لیٹی جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھیں۔
"دادی کی زبان شکر ادا کرتی ہو گی کہ بیماری کے بہانے کچھ ریسٹ ملا۔" الفت نے چپکے سے بہنوں کے سامنے کہا۔
"بدتمیز!" نعمت اسے متنبہ کر رہی تھی مگر ہنسی آ گئی۔ رحمت نے البتہ سنجیدگی سے گھور کر دیکھا تھا۔
"میں سوچ رہی ہوں کہ دادی کے کمرے کا شیلف صاف کر کے سارا سامان ہٹا دیتی ہوں، ایویں ہر مہینے ساری چیزیں اتار اتار کر دھونا پڑتی ہیں اور صاف کر کے رکھنی پڑتی ہیں مصرف تو کوئی ہے نہیں ان پرانے برتنوں کا۔" الفت نے شوشا چھوڑا۔
"ان کی جان ہے اپنے جہیز کے سامان میں، کھا جائیں گی تمہیں۔" نعمت نے ڈرایا۔
"کوئی نہیں، جب سے بیمار ہوئی ہیں۔ چپ چاپ ایک طرف پڑی رہتی ہیں، اب تو کسی چیز میں دلچسپی باقی نہیں رہی ان کی۔" الفت کا تجزیہ ٹھیک تھا مگر رحمت نے ٹوک دیا۔
"ان چیزوں سے ان کی جذباتی وابستگی ہے جیسے رکھی ہیں ایسے ہی رہنے دو، ہٹاؤ گی تو انہیں تکلیف ہو گی۔"
"یہ جذباتی وابستگیاں بھی بڑا غضب ڈھاتی ہیں۔" نعمت کو کچھ خیال آیا۔
"دادی کو اپنے والدین سے جذباتی وابستگی تھی، ان کی خواہش تھی کہ اپنے پوتوں کے نام ان کے نام پہ رکھیں، چچی نے اس معاملے میں ان کی ایک نہیں چلنے دی تو وہ ساری محبتوں کا پہاڑ ہم پہ ٹوٹ پڑا، دادی نے وہ دونوں محترم نام ہم دونوں بہنوں کو بخش دیے، اسکول، کالج میں ہر دوسری بندی یہی سوال ضرور کرتی تھی، تمہارے نام کس نے رکھے؟ اس کا نام تو پھر بھی بہتر ہے کم از کم اٹھارویں صدی کا تو نہیں لگتا۔" اس نے بولتے بولتے الفت کی طرف اشارہ کیا۔
"کوئی نہیں۔" وہ تو جیسے تڑپ اٹھی۔
"لڑکیاں اتنا مذاق بناتی تھیں میرا، وہ چار کی ٹولی آتی اور مجھ سے پوچھتی، تم الفت ہو ناں، ہم میں جیسے ہی ہاں میں سر ہلاتی، آگے سے فوراً سوال ہوتا کس کی؟ اور ٹھٹھے لگاتی ہوئی غائب ہو جاتیں، اتنا غصہ آتا تھا اپنے نام پر، کیا بتاؤں۔" الفت بھی بھری بیٹھی تھی۔

"اب اتنے بُرے نام بھی نہیں ہیں، معنی تو اچھے ہیں، ان نئے نویلے ناموں سے تو بہتر ہیں، جن کا مطلب تو رکھنے والوں کو بھی معلوم نہیں ہوتا اور بولنے والوں کی زبان سو سو بل کھا جاتی ہے۔" رحمت نے دونوں کو گھرکا۔

"نصیب اچھے ہونے چاہئیں، نام نئے ہوں یا پرانے کیا فرق پڑتا ہے، ویسے بھی آج کل پرانے نام رکھنے کا فیشن ہے۔"

رحمت نے مزید کہا، دونوں کان دباتی خاموشی سے سنتی گئیں۔ جتنی دیر بھی رہتیں، لیکچر سننا پڑتا ویسے یہ بات نہیں تھی کہ وہ کوئی بدتمیز یا گستاخ قسم کی پوتیاں تھیں، بس کبھی کبھی بے دھڑک بول جاتیں، بغیر سوچے سمجھے اور پھر جب رحمت کے لیکچر شروع ہوتے تو اگلی بار اپنی زبان کو قابو رکھنے کا عہد کرتیں۔

☆☆☆

سدرہ اپنے شوہر کے ساتھ دادی کی عیادت کے لیے آئی تھی۔ ویسے وہ دادی کی بیماری کے دوران اسپتال بھی گئی تھی انہیں دیکھنے، پھر گھر بھی آئی تھی، اب کچھ دن بعد پھر ان کی طبیعت اور خیریت دریافت کرنے آئی تھی، شوہر اچھا تھا، ہنس مکھ تھا۔ سب کے ساتھ منٹوں میں گھل مل جاتا، اب بھی دادی کے پاس بیٹھا مزے سے ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

سدرہ اٹھ کر لڑکیوں کے پاس آ گئی جو اس کی خاطر مدارات کے لیے اہتمام کر رہی تھیں۔

"سدرہ آپی آنے سے پہلے فون کر دیتیں، ہم کچھ بنا لیتے۔" الفت صاحبہ اپنی کزن کم نند کی خاطر داری میں پیش پیش تھیں۔

"ابھی تو تم نعمت سے سیکھو، جب ہمارے گھر آ جاؤ گی، پھر بتا کر بھی آئیں گے اور فرمائش کر کے بھی پکوائیں گے۔" سدرہ کی بات اور مسکراہٹ دونوں بڑی شریر تھیں، الفت شرما گئی، باقی سب ہنس پڑیں۔

نعمت جلدی جلدی دہی پھلکیاں بنا رہی تھی، چٹنی وغیرہ بنانے میں الفت اس کی مدد کر رہی تھی۔

رحمت، سدرہ کو لے کر کمرے میں آ گئی۔

"اور تم سناؤ، کہیں کوئی بات بنی یا نہیں؟"

کی جب سے اپنی شادی ہوئی تھی اسے باقی کی فکر لگ گئی تھی، کاٹن کا بڑا مہنگا اور نفیس جوڑا ہلکا پھلکا زیور اور ویسا ہی میک اپ وہ بہت رہی تھی۔

"جب نصیب میں ہو گی، ہو جائے گی۔" نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ویسے بھی ابھی تو ساری توجہ اور فکر دادی کی طرف لگی ہوئی ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" سدرہ نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لوگ بھی کچھ دیکھ کر ہی آتے ہیں ڈھنگ کا کوئی ڈرائنگ روم تک تو ہے نہیں، ہم سوچ رہے ہیں کہ دادی کو اوپر چھت کے پورشن میں شفٹ کر دیں اور اس کمرے کو ڈرائنگ روم بنا کچھ رقم تو خرچ ہو گی مگر مہمانوں کو بٹھانے کی اچھی جگہ بن جائے گی۔"

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟" سدرہ نے حیرت سے رحمت کو دیکھا۔

"اگر گھر اور ڈرائنگ روم دیکھ کر لڑکیوں کی شادیاں ہوتیں تو پوش علاقوں کے کسی بنگلے میں کوئی لڑکی رشتے کے انتظار میں نہ بیٹھی ہوتی، سب کی شادیاں ہو گئی ہوتیں مگر یہ مسائل تو وہاں بھی ہیں جگہ ہیں۔ یہ تو نصیب کے کھیل ہیں۔ اس گھر میں لڑکیوں کے رشتے ہو چکے ہیں وہ کیا ڈرائنگ روم دیکھ کر ہوئے ہیں؟"

"پھر بھی کبھی کبھی بہت ہی زیادہ بول جاتی ہیں، اسپیشلی جب امی کو باتیں سناتی ہیں تو بہت برا لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب فہمیدہ چچی کو بھی ان کی ذمہ داری اٹھانی چاہیے، ایک عمر ہو گئی، ہماری امی انہیں سنبھال رہی ہیں بلکہ بھگت رہی ہیں۔" رحمت کی زبان اس وقت بالکل دادی کی زبان کی طرح چل رہی تھی۔

دادی سے بیزار ہو گئی ہو تم نانی جان سے، کہیں ادھر ادھر کرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں امی سے کہوں گی، ہم نانی کو اپنے گھر لے جائیں گے، وہاں رہ لیں گی۔ ویسے بھی تم لوگوں نے بہت خدمت کر لی، اب ہماری باری ہے۔" سدرہ کا لہجہ گواہی دے رہا تھا کہ اسے رحمت کی باتیں بری لگی ہیں۔

"اپنے گھر میں کہاں رکھو گی، وہاں اتنی جگہ ہوتی تو اپنی دادی کو اکیلی اوپر پھینکنے کے بجائے اپنے ساتھ نہ رکھ لیتے تم لوگ۔" رحمت اب آئی تھی اصل

"وہ تو... وہ تو الگ بات ہے۔" سدرہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"وہ الگ بات ہے کہ وہ تمہاری دادی ہیں، ان کے متعلق تمہاری فیلنگز وہ نہیں ہیں جو اپنی نانی کے متعلق ہیں اور اس میں تمہارا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نے بچپن سے ان کا رویہ اپنی امی کے ساتھ ویسا ہی دیکھا ہے جیسا روایتی ساسوں کا ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے اور جو کچھ ان کے ساتھ سلوک ہے وہ بھی عجیب نہیں، جب بہوئیں طاقت ور ہو جائیں تو ساس کا نقشہ الٹ دیتی ہیں اور مظلوم سے ظالم کی صف میں شامل ہو جاتی ہیں، یہ بھی ہمارے معاشرے کا عمومی رویہ ہے۔ کوئی کوئی بہو اتنی اعلا ظرف ہوتی ہے کہ بڑھاپے اور کمزوری کی حالت میں اس عورت سے اچھا سلوک کرے، جس نے ساری زندگی اسے بے حد پریشان کیا ہو۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" سدرہ اب الجھ رہی تھی۔

"صرف اتنا کہ اپنی دادی کے لیے بھی ویسے ہی سوچو جیسے نانی کے لیے سوچ رہی ہو، انہیں سب سے الگ تھلگ قید تنہائی میں رکھ کر پھپھو کا بدلہ تو شاید پورا ہو جائے گا مگر اللہ جانے آگے اس "بدلے" کا کیا "بدلہ" ملے؟ صرف تمہیں سمجھانے کے لیے میں نے

دادی کے متعلق ایسی باتیں کیں، اب تم پھپھو کو تم انہیں اچھی طرح کنونس کر سکتی ہو، یہ بات منوا ہو۔ عورت ہو یا مرد، اس کی سب سے بڑی خوشی بڑھاپا اپنے بچوں اور ان کے بچوں کے ساتھ گز ہے۔ اپنی دادی کو اس خوشی سے محروم مت کرو۔"

"ٹھیک ہے، میں امی کو سمجھاؤں گی، بلکہ کوشش کروں گی کہ وہ دادی جان کو نیچے ہی شفٹ لیں۔" سدرہ کی سمجھ میں بات آ گئی تھی۔ اس وعدہ کیا۔

"شکریہ!" رحمت خوش ہو گئی۔ پھپھو کی سا اس طرح گوشۂ تنہائی میں دیکھ کر اور ان کی باتیں رحمت کا حساس دل بہت دکھی ہوا تھا۔ بہت سو کے بعد بالآخر دماغ میں ایک ترکیب آ ہی گئی ڈائریکٹ پھپھو کو نہیں سمجھا سکتی تھی، وہ کوئی بھی ظاہر کر سکتی تھیں، بھڑک بھی سکتی تھیں اور ہنس بھی سکتی تھیں۔ مگر سدرہ کی سمجھ میں اگر بات آ گ اپنی امی سے اپنی بات منوا لے گی۔ رحمت خیالات میں گم تھی اور سدرہ وہ بھی خاموش بیٹھی

"تم کیا سوچ رہی ہو؟ اتنی چپ بیٹھی ہو، باتیں بری تو نہیں لگیں؟" رحمت نے کچھ بے چی کر اسے دیکھا۔

"نہیں۔" سدرہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"بلکہ میں سوچ رہی تھی کہ دادی پوتی یا پو رشتہ اپنی جگہ ایک الگ نوعیت اور الگ اہمیت ہے۔ بچے عموماً اس رشتے کو اپنی ماں کی عینک دیکھتے ہیں۔ ہماری ماؤں کی سوچ اور رو رشتے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ورنہ ہم پر ان کا ہے اور جو ہمارا فرض ہے، وہ اپنی جگہ ہے، ہم ا پورا کر سکتے ہیں اور کرنا چاہیے۔"

"میں بھی یہی سوچتی ہوں۔" رحمت کی تائید کی۔

"بلکہ تم تو عمل بھی کرتی ہو، میں نے دیکھ کئی بار تمہیں، تم نانی جان کے معاملے میں کتنا اور برداشت سے کام لیتی ہو۔" سدرہ نے

سے اعتراف کیا۔
"ٹھہرو، مجھے سوچنے دو، اب میں تمہاری شان میں کیا بیان کروں؟"
رحمت اور وہ دونوں مسکرا رہی تھیں جب نعمت اندر داخل ہوئی۔
"آپ دونوں معزز خواتین کیا خفیہ میٹنگ کر رہی ہیں؟" وہ ان دونوں کو مسکراتا دیکھ کر نعمت کچھ مشکوک ہوئی۔
"ہم رشتے جوڑنے کی باتیں کر رہے تھے۔" سدرہ نے جواب دیا۔
"ہیں! کوئی رشتہ دیکھا ہے رحمت کے لیے؟" نعمت پرجوش ہوئی۔
"رشتہ تو پہلے سے موجود ہے دیکھا بھالا ہے، بس اسے جوڑ کر اور مضبوط کرنا ہے۔" سدرہ کی مسکراہٹ اور معنی خیز ہو گئی۔
"کیا مطلب؟" نعمت نے کچھ پریشان ہو کر دونوں کو دیکھا۔
"ارے کوئی مطلب وطلب نہیں، یہ محترمہ مذاق کر رہی ہیں۔" رحمت نے جلدی سے وضاحت کی۔
"اچھا، میں یہ کہنے آئی تھی کہ دادی کے کمرے میں ناشتہ لگا دیا ہے، آپ دونوں آ جائیں۔"
"چلو بھئی نعمت کے ہاتھ کے دہی بھلے کھائیں۔"
سدرہ کھڑی ہو گئی، دونوں دادی کے کمرے میں پہنچے تو جملہ حاضرین کے ساتھ بلال صاحب بھی موجود تھے۔
"تمہیں کیا خوشبو پہنچ جاتی ہے ہر چیز کی جو دوڑ کر چلے آتے ہو؟" رحمت نے آہستہ سے اسے رگیدا، دادی کے سامنے تو کسی پوتے کو کچھ کہنا، اپنی شامت کو دعوت دینا تھا۔
"خوشبو نہیں، میسج۔" بلال نے بھی دھیمی آواز میں ہی تصحیح کی۔
"دہی بھلے بنائے ہیں۔ آ جاؤ، کباب تلے ہیں، ادھر رکھ دوں یہیں یا اوپر بھجوا دوں؟ چائے/کافی ... ہے، پیتی ہے تو آ جاؤ۔" بلال نے دھیرے دھیرے آموختہ سنا دیا۔
"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے، تمہاری محبت کا آغاز آخر کچن سے ہوا ہے فوڈ لور۔"
رحمت نے مہمانان و میزبانان پر نظر دوڑائی سب یکساں انداز میں ہی اشیائے خورد و نوش پہ ہاتھ صاف کر رہے تھے، امی نے دادی کو بھی ایک پیالے میں بغیر چٹنی کے دہی بھلے نکال دیے تھے، جسے وہ آرام آرام سے کھا رہی تھیں۔
"اچھا ہوا، اس لڑکے کا بیڑا پار ہو گیا، اب کھانے پینے کے لیے ادھر ادھر نہیں بھاگنا پڑے گا، بڑی اچھی لڑکی مل گئی اس ناہنجار کو، نصیب اچھے ہیں، باپ کی طرح ساری عمر بدذائقہ کھانے تو نہیں کھانے پڑیں گے۔"
دادی آج کسی اور ہی دھن میں تھیں۔ پوتی کی تعریف کرتے ہوئے پوتے کو رگید رہی تھیں اور وہ اپنی عزت افزائی سے بے نیاز بدستور رحمت سے اپنے دکھڑے رو رہا تھا۔
"دنیا جہاں کی منگیتریں ایسے ایسے رومینٹک میسج بھیجتی ہیں ایک آپ کی بہن ہے جو بھی میسج آتا ہے کھانے سے شروع ہو کر کھانے پہ ختم ہوتا ہے۔ بیسن کے پراٹھوں سے لے کر آلو کے پراٹھوں پہ، لسی سے لے کر چکن ملک شیک پہ، بریانی سے لے کر دال ... تک آ رہی۔"
بلال کھاتا جا رہا تھا، داستان غم نم آنکھوں سے سناتا جا رہا تھا۔ آنکھیں نم اس لیے ہو رہی تھیں کہ چٹنی کی مقدار کچھ زیادہ ہی ڈال لی تھی جس کی وجہ سے آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔
"اچھا، میری بہن کی شکایتیں مجھ سے کر رہے ہو اور خود تمہارا کیا حال ہے؟ شروع تاریخ کا چاند تمہیں ناریل کی پھانک اور تربوز کی قاش نظر آتا ہے۔ پورا چاند دیسی گھی میں تلی پوری کچوری، سورج دیکھ کر گرما گرم پیزا اور ستارے دیکھ کر ہوئے پائن

ایپل کے چھلکے یاد آتے ہیں۔ برسات میں تمہیں پکوڑوں اور میٹھے پوڑوں کا ہوکا اٹھتا ہے، سردیوں کی طویل راتوں میں تمہیں کشمیری چائے اور پنجیری کی طلب اٹھتی ہے۔" رحمت نے بولنا شروع کیا تو بس نہیں کیا۔
"ایسے بندے کو پیار بھرے نہیں کھانے بھرے میسج ہی اچھے لگ سکتے ہیں۔"
"ثابت کر دیا کہ اپنی بہن کی بہن ہی ہو تم۔" بلال نے بڑے اطمینان سے انڈوں کا حلوہ پیالی میں نکالا اور رحمت اسے گھور کر ہی رہ گئی۔ مہمانوں سے زیادہ میزبان ڈشوں کا صفایا کر رہے تھے۔

☆☆☆

حمزہ کے "ہیلتھ اینڈ فٹنس کلب" کا افتتاح ہو گیا تھا۔ کافی لڑکوں نے جوائن کیا تھا جن میں بلال کے اور لڑکی فی الحال ایک ہی تھی، نعمت کو بڑی مشکل سے بلکہ گھیر گھار کر رضامند کیا گیا تھا۔ اس کی مورل سپورٹ کے لیے رحمت بھی اس کے ساتھ ہوتی تھی، شروع کے دو ہفتوں تک تو نعمت...... رات میں ہائے ہائے کرتی رہتی تھی، کبھی کہیں درد ہوتا تھا، کبھی کہیں، تیسرے ہفتے میں اب آہستہ آہستہ سیٹ ہونے لگی تھی۔
بلال البتہ تھوڑا جھنجلا گیا تھا۔ نعمت کو ڈائٹ پلان دیا گیا تھا، اس کے حساب سے اب چکنی چیزوں پہ کم بلکہ سبزیوں اور پھلوں پہ زیادہ زور تھا۔ لسی، [illegible] کے شربتوں اور چائے، کافی کے بجائے لیموں پانی اور سبز چائے کی تاکید تھی۔
"پتا نہیں کس احمق نے مشورہ دیا تھا گھر میں جم کھولنے کا۔" اسی جھنجلاہٹ کے عالم میں ایک روز رحمت کے سامنے پھٹ پڑا اور پھر رحمت نے جن خطرناک نظروں سے اسے گھورا تھا، اس نے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

فہمیدہ چچی کتنی دیر سے بیٹی کی خوشامدیں کر رہی تھیں مگر وہ کسی سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ حمزہ کے لیے کوئی لڑکی دیکھنے جا رہی تھیں۔ بیٹی کے علاوہ ... ساتھ لے کر جاتیں، مگر وہ اپنا ٹی وی ڈرامہ چھوڑ ... پر آمادہ نہیں تھی، الٹا انہیں مشورہ دے رہی تھی۔
"تصویر منگوا لیں پہلے، پسند آ جائے تو ... جائے گا۔"
"خالی خولی تصویر سے کیا پتا چلے گا؟" ... جھنجلائیں۔
"ذرا سی دیر کی ملاقات سے بھی کچھ پتا ... چلے گا، ادھر ادھر جانے کو رہنے دیں اپنے آس پ... ہی دیکھ لیں، آپ کے مطلب کی لڑکی مل جائے ...
حمزہ جو بہت دیر سے اماں اور بہن کی تکر... رہا تھا، مداخلت کر ہی بیٹھا، وہ خود تو بول بال کر ... بنا، بیچے فہمیدہ خاتون ساری عمر زیادہ زور نہ ڈ... والے دماغ پہ آج بہت زور دے رہی تھیں کہ ... بیٹے کے لیے آس پاس کے دیکھیں، اڑوس پ... میں تو کوئی لڑکی بچی نہیں، وہ سوچ سوچ کر پریشا... رہی تھیں مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

ہوا سرد تھی مگر اتنی بھی نہ تھی، طبیعت اور ...

اچھے ہوں تو یہ ہوا بھی اچھی لگ رہی تھی۔ رحمت نے پانی کی موٹر بند کرکے پائپ لپیٹ کر رکھا، پانی، وقت بے وقت، جس وقت بھی آئے ایک نعمت ہی ہے۔ بغیر منہ بنائے وہ خوشی خوشی بھرتی تھی۔ سیڑھیوں سے کھٹ کھٹ کوئی اتر رہا تھا، جیسے ہی وہ نیچے اس کے سامنے آیا، عین اسی وقت گلی سے مونگ پھلی والے کی آواز آئی۔

''اف، اللہ میاں سے کچھ اور بھی مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔'' رحمت نے انتہائی مسرت اور جوش کے عالم میں حمزہ کو مخاطب کیا۔

''حمزہ! میرے پیارے بھائی، جلدی سے مونگ پھلی لا دو۔''

''بھائی؟'' حمزہ کی آنکھوں میں ٹوٹے ہوئے دل کی کرچیوں کا عکس تھا اور یہ عکس چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا، وہی بات جو حمزہ نے اپنی زبان سے کہی۔ ''کوئی بھی عقل مند لڑکی مجھ جیسے ہینڈسم بندے کو بھائی کہنے کا سوچ ہی کر بے ہوش ہو جائے۔''

''ہینڈسم؟'' رحمت نے اسے بغور دیکھا، پھر اطمینان سے بولی۔ ''ہو سکتا ہے تم ہینڈسم ہو مگر میں بالکل بھی عقل مند نہیں ہوں، اب جاؤ جلدی سے مونگ پھلی لا دو، پیسے دے دینا، میں تمہیں دے دوں گی۔''

حمزہ مونگ پھلی لینے باہر گیا، وہ پیسے لینے اندر آئی، چابی اور پیسے لے کر صحن میں گئی تو وہ مونگ پھلی لے کھڑا تھا۔

''کتنے کی ہیں؟''

''آج میری طرف سے.....''

''خیریت؟''

''دوستوں کی گیدرنگ ہے نئے سال کی خوشی میں۔''

''او تب ہی اتنے تیار ہو، تالا لگا جانا باہر۔ یہ چابی لے جانا، آدھی رات کو دروازہ مت بجانا، ابا تمہیں بجا دیں گے۔'' رحمت نے اسے تنبیہ کی۔

''جانتا ہوں، ذرا یہ پکڑو۔'' اس نے اندرونی جیب سے ایک سرخ گلاب نکال کر اور خود اپنی جیب میں نہ جانے کیا ٹٹول رہا تھا، ایک چھوٹی سی بوتل برآمد کر لی۔

''دادی کے لیے شہد لایا تھا، اصلی ہے، کھلا دینا۔''

''اور یہ؟'' رحمت نے پھول کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ایک خاص ہستی کے لیے ہے۔'' حمزہ نے اس کی دی ہوئی چابی جیب میں ڈالی، گیٹ کھول کر دوبارہ بند کیا۔ تالا لگانے کے لیے باہر نکلنے لگا۔

''سنو!'' رحمت نے اسے آواز دی۔

''یہ تو لے جاؤ، یہیں چھوڑے جا رہے ہو۔'' اس نے سرخ گلاب حمزہ کی طرف بڑھایا۔ حمزہ اس کے قریب آیا اور تھوڑا اور قریب۔

''چھوڑ کر نہیں جا رہا، دے کر جا رہا ہوں۔''

رحمت نے اس سے پہلے اسے اتنا قریب مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اس کی تو جان ہی نکل گئی۔ اوسان بحال ہوئے تو گیٹ بند تھا، وہ جا چکا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں مونگ پھلی دوسرے میں سرخ گلاب تھا جس میں چھوٹا سا کارڈ بھی لگا تھا اس نے کارڈ پڑھا۔

''تمہیں نیا سال مبارک ہو اور مجھے نئی محبت۔''

''نئی.....؟'' اس کی آنکھیں حیران ہو گئیں اور لب مسکرا اٹھے، ابھی ٹھیک سے دل دھڑ کنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کا جملہ یاد آ گیا۔

نئی محبت؟ تو کیا کوئی پرانی بھی تھی؟''

اس کا دل یک دم ڈوبا تھا، پھر دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا، پہلی محبت تو اسے حاصل ہو گئی تھی۔ باڈی بلڈنگ اور جم کا خواب جو اس کا جنون تھا اب مجسم ہو گیا تھا۔

''کھٹ کھٹ..... کھٹ کھٹ.....'' کمرے کی [illegible] کو چیرتی، نقاہت بھری آواز سنائی دی جیسے کسی اندھیرے کنوئیں کی سیاہ بھیانک دیواروں سے سر ٹکراتی آوازیں۔ کسی مددگار کو پکاریں مگر جواب موصول نہ ہونے پر اپنی گہرائیوں میں پھر سے معدوم ہو جائیں۔

حنا بشریٰ

آئینہ دل چھلک گیا



"کھوں کھوں..... کھڑ کھڑ....." نقاہت کا غلبہ اب آواز پر پوری طاقت کے ساتھ حاوی ہونے لگا تھا۔

ایسا نہیں تھا کہ آوازیں کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھیں یا پھر افراد خانہ قوت سماعت سے محروم تھے یا پھر دوری کی وجہ سے آواز کانوں تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ آواز سن کر بھی نظر انداز کی جا رہی تھی۔ تنفر کے مارے..... غصے کی وجہ سے..... لاپروائی اور لاتعلقی کی وجہ سے.....

"عا..... عائشہ....." نحیف زدہ آواز ابھری۔

اپنا نام سننے کی دیر تھی کہ صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر کے، جھاڑو لگاتی عائشہ نے انتہائی غصے سے جھاڑو اٹھا کر مارا کہ جھاڑو کا ہر تنکا بکھر گیا۔ عائشہ کا منہ سرخ انگارہ بنا ہوا تھا۔ زہر زبان، تڑپتے، مچلتے اول فول کو نا جانے کیسے روکا تھا۔

"عا..... عا..... عائشہ....." پھر سے مہین سی آواز ابھری۔

"اللہ کرے یا تو مجھے موت آ جائے تو پھر....."

عائشہ کی قوت برداشت تو پہلے ہی صفر تھی، اب تو بالکل ہی اس کا خاتمہ ہو رہا تھا کہ مرحومہ والدہ کی نصیحت نے دل و دماغ کو سرزنش کیا۔

"عائشہ..... اللہ سوچنے کو بالکل پسند نہیں کرتا کہ کوئی مشکلات سے گھبرا کر اپنے لیے موت مانگے یا پھر کسی کو مرنے کی بددعا دے۔ ایسا کرنے سے مشکلات ختم تو نہیں ہوتیں بلکہ اور بڑھ جاتی ہیں۔"

"آ رہی ہوں۔" عائشہ نے کمرے کی جانب آتے ہوئے صدا لگائی۔

دروازے کو زوردار آواز سے کھولتے ہوئے اس نے سوئچ بورڈ پر اندھوں کی طرح ہاتھ مارتے ہوئے لائٹ جلائی تو چہار سو پھیلتی روشنی میں ضعیف وجود واضح ہو گیا۔ جو درد و اذیت کے مارے سینے پر ہاتھ رکھے بری طرح سے کراہ رہا تھا۔

پاس ہی زمین پر شیشے کا گلاس گر کر کرچی کرچی ہوا پڑا تھا۔ وہ احتیاط سے بچتی ہوئی پلنگ کے قریب جا پہنچی۔

بے تاثر چہرہ..... ہر جذبات سے عاری..... نرمی اور ہمدردی سے محروم..... انتہائی ناگوار تاثرات لیے ہوئے۔

"کیا بات ہے؟" چاہتے ہوئے بھی وہ لہجے کی کرختگی چھپا نہ پائی۔

"اب بس بھی..... کیوں آوازیں دے رہی ہیں..... سو کام ہوتے ہیں گھر میں۔" الفاظ کے ساتھ وزنی سا ہتھوڑا جو مقابل کو بے دردی سے مار رہا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ تو پہلے ہی اذیت میں ہے۔

"پا..... پا....." سینے پر ہاتھ رکھے وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بولیں۔

"اب کیا ہے پا..... پا..... لگائی ہوئی ہے؟ ابھی کتنی دیر لگے۔ دروازے پر رکنا پڑتا ہے اور اونچا اور واضح تو بولیں۔ جب تک میرے پہنچنے میں کوڑے والے نے بڑی سخت گیری کی کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، میں کیا کروں گی۔" کوڑے والے نے عائشہ کا پارہ اور بلند کر دیا۔

"لعنت آپ" تو عائشہ نے نا جانے کس مجبوری کے تحت کہا تھا ورنہ انداز و اطوار سے بدلحاظی و بدتمیزی خوب جھلک رہی تھی۔ "اچھا۔" منہ کے زاویے ٹیڑھے میڑھے کرتے ہوئے وہ بامشکل ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"پانی....." کھانسی کو روکتے ہوئے بامشکل اپنی ضرورت بیان کر پائیں۔ دماغ تو پہلے ہی گھوما ہوا تھا، وہ غصہ پی گئی تھی۔ عائشہ نے ایک غصے بھری نگاہ کمرے پر ڈالی۔ ایک اکلوتا گلاس بھی گر کر ٹوٹ چکا تھا، یقیناً انہوں نے گلاس پکڑنے کی کوشش کی ہوگی اور تکلیف کے باعث وہ گلاس پکڑ نہ پائیں اور گلاس گر کر چکنا چور ہو گیا اب پیاس کی شدت سے وہ عائشہ کو پکارے جا رہی تھیں۔

سارا غصہ اس پر نکل جاتا مگر غلطی اپنی تھی سو خاموش ہی عائشہ کا بنتا تھا۔ وہ فجر کی نماز پڑھ کر رات بھر کا ڈنر سیٹ کر شاپر دروازے کے باہر رکھ دیا کہ کوڑے والا اٹھا تا۔ اور خاموشی سے لے کر بھاگ جاتا تھا۔ آج مصروفیت کی وجہ سے یہ بات ذہن سے محو ہو گئی۔ سو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معمولی سا کچرا اٹھانے والا بھی اسے باتیں سنا کر چلا گیا۔ ابھی ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ دوبارہ آواز آئی۔

"اچھا صبر کریں، لاتی ہوں پانی۔" عائشہ نے ایک کھا جانے والی نگاہ ان پر ڈالتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

"عائشہ..... بیٹی پانی تو لا دو۔" وہ پکار سن کر کمرے کی طرف بھاگی اور پانی کا گلاس بیمار عورت کو یوں تھمایا جیسے اسے کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں۔

"مفت کا مال ہاتھ آیا ہوا ہے ناجیسے بے دردی سے روز توڑتی رہتی ہیں۔ کبھی گلاس تو کبھی پلیٹیں..... میرے جہیز کا سارا ڈنر سیٹ برباد کر کے رکھ دیا ہے۔" شوکیس سے اسٹیل کا گلاس نکالتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"جب نازک قیمتی برتن استعمال کرنے کا سلیقہ ہی نہیں تو ضرورت کیا ہے شیشے کے برتن استعمال کرنے کی۔ پہ دن تو ان کو بھی پتا نہیں کب میری بات سمجھ میں آئے گی۔ پورا گلاس سیٹ برباد کر کے ہی دم لیں گی۔" عائشہ نے اسٹیل کے گلاس میں پانی بھرا، پھر کچن سے نکل ہی رہی تھی کہ دروازے کی جانب سے آتی آواز نے توجہ اپنی جانب کر لی۔

"دھڑ..... دھڑ....." دستک دینے والا گویا کہ دروازہ بجانا ہی بھول گیا تھا۔

"آ رہی ہوں بھئی۔" گلاس ایک طرف رکھتے ہوئے وہ بھاگی۔

"باجی..... کوڑے کا شاپر بنا کر صبح سویرے ہی رکھ دیا کریں۔ کتنی دیر سے مجھے دروازے پر رکنا پڑتا ہے اور آپ کو پروا ہی نہیں۔" کوڑے والے نے تفریحاً کہا تو عائشہ کا پارہ اور بلند کر دیا۔

"بیمار تو پہلے سے تھیں۔ اب دماغ بھی چل گیا ہے۔"

"توبہ ہے سارا دن تو آرام فرماتی رہتی ہیں اور کمرے کو ایسے گندا کر رکھا ہے کہ جیسے کوئی بچہ اودھم مچا کر گیا ہو۔" کمرے کی صفائی ستھرائی کرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی۔ دل کا زہر وہ با آسانی زبان سے نکال سکتی تھی مگر نہ جانے کس مقصد کے تحت زہر یلی سرگوشیوں کو دل کے قید خانے میں ہی رکھا۔

سارا کمرہ صاف ہو کر شیشے کی طرح چمکنے لگا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر سلیقے سے رکھی تھی، کمر پر باندھا دوپٹہ کھول کر اپنی عرق آلود پیشانی پونچھی اور ایک اطمینان بھری نگاہ ڈال کر باہر نکلنے لگی کہ اپنے نام کی پکار پر رک گئی۔

"عائشہ بیٹی ناشتا مل جائے گا۔ میں نے ابھی تک ناشتے کے انتظار میں دوا بھی نہیں کھائی۔" اس بات پر عائشہ کے چہرے کا اطمینان اڑن چھو ہو گیا۔ آنکھوں سے ناگواری کا اظہار کرتی کچن میں آ گئی۔ یہاں میدان خالی تھا، جی بھر کر بھڑاس نکالنے کا موقع میسر تھا۔ جتنی تیزی سے ہاتھ چل رہے تھے، اتنی ہی تیزی سے زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی۔

"کام کی نہ کاج کی..... دشمن اناج کی..... معمولی سی بیماری کو بہانہ بنا کر بستر پکڑ کر ہی بیٹھ گئی ہیں۔ لو بھلا دمہ بھی کوئی خطرناک بیماری ہے۔ پچاس ساٹھ سال کی عمر میں تو انسان اچھا خاصا صحت مند ہوتا ہے۔ اپنے سارے کام خود کر سکتا ہے بلکہ....." سوچ کا دھارا اپنی نکلی کے گھر کی جانب نکلا، جہاں اس کی ساس اس کی بھرپور مدد کرتی تھیں۔ سبزی بنا کر دیتیں، ناشتے کے برتن دھوتیں اور کتنے ہی چھوٹے کام نمٹا دیتیں اور ایک یہ ہیں..... اس نے سوچتے ہوئے نخوت سے دانت پیسے۔

"بس بیڈ پر بیٹھ کر حکم چلانا سیکھ لیا ہے محترمہ نے۔ عائشہ یہ لا دو، عائشہ وہ لا دو..... فرمائشی پروگرام ہی نہیں ختم ہوتا۔ بہو نہ ہوگی مفت کا نوکر ہی ہاتھ لگ گیا ہے۔ سسرال والوں کے عیش ہی ہو جاتے ہیں، بہو کو کولہو کے آگے باندھ کر خود آرام کرتے رہتے ہیں اور بہو نہ تھکے اور نہ ہی کرے۔" کپ میں چائے انڈیلی،

درست کیا، جھاڑو پونچھا لگایا، کھڑکی کے پردے ایک طرف کیے تازہ ہوا کے جھونکے کمرے میں داخل ہوئے تو اس بزرگ خاتون کے چہرے پر اطمینان بکھر گیا۔

عائشہ کو اس بات کی کوئی فکر نہ تھی، وہ ٹوٹے ہوئے گلاس کی کرچیاں سمیٹنے میں مگن ہو گئی۔ کمرے کی دیگر بکھری اشیا کو

سانس سینکنے، اللہ ابھی اتنی دیر میں اٹل چکا تھا۔
"کہنے کو بیمار ہیں، ناشتا ملاحظہ کرو پورے بیٹے کے انسانوں والا۔ اتنا کھا کر بھی ان کے منہ سے آواز نہیں نکلتی جیسے جسم میں جان ہی نہیں ہے۔ اوپر سے صاحب زادے آ کر اپنے حکم چلانا شروع کر دیں گے۔ امی کو وقت پر دوا دی؟ امی کو تینوں وقت کا کھانا دیا؟ بس بیٹے کا فرض پورا ہو گیا، اونہہ......" اس نے شوہر کو بھی ناشتا دیا اور ٹرے میں ناشتا رکھ کر ساس کو دے آئی۔

☆☆☆

عائشہ اپنے والدین کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹی دو ابھی زیر تعلیم تھیں۔ گریجویشن کے بعد وہ فارغ ہوئی تو عدنان کا رشتہ آ گیا۔ جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ گھر میں صرف ماں اور بیٹا تھا، نہ سسر اور نہ ہی نندوں کی کھپ کھپ...... عائشہ کی امی نے فوراً سے پہلے ہاں کر دی۔ عدنان کی بوڑھی، کھانستی، ہانپتی کانپتی ماں کو دیکھ کر سب کو اطمینان ہو چلا تھا کہ ساس کے نام کی یہ الجھن بس چند روزہ ہے۔ بیمار بوڑھا وجود کتنی دیر جی لے گا، پھر بس ہماری بیٹی شہزادیوں کی طرح راج کرے گی۔ ان سب حقائق کو سمجھتے ہوئے جٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ کیا گیا اور عائشہ کو رخصت کر دیا گیا۔ اسی دوران عائشہ کی والدہ کو معمولی سے بخار نے جکڑ لیا اور وہ ملک عدم سدھار گئیں۔ اب صرف والد ہی رہ گئے، جن کی طرف سے عائشہ کو خاص ہدایت کی گئی تھی کہ "عائشہ اب تمہارا جینا مرنا سسرال میں ہی ہے۔"
"قسمت سے تمہیں اچھا سسرال مل گیا ہے، بوڑھی بیمار ساس کو اپنی ماں کی جگہ سمجھنا اور ڈھیروں دعائیں لینا۔ یہ دعائیں ہی ہوتی ہیں جو انسان کے بھاگ جگا دیتی ہیں۔ بند قسمتوں کو کھول دیتی ہیں کیونکہ باادب...... بانصیب...... بے ادب تو بے نصیب ہی ہوتا ہے۔"

☆☆☆

شادی کو دو سال گزر گئے۔ ساس اور شوہر کی خدمتیں کرتے ہوئے، نہ اس بوڑھے وجود کو موت لینے آئی اور نہ ہی اس خدمت کے عوض عائشہ کے بھاگ جاگے۔ وہ بھی اولاد کی نعمت سے محروم تھی، وہ تو ساس اور شوہر کی جانب سے کوئی طعنہ نہ ملا تھا، اس لیے سکون تھا۔ دونوں کی طرف سے ذرا سی بھی درشتی کا سامنا ہوتا تو کہاں کی بدلحاظی اور بدتہذیبی، جو اکثر وہ عدنان سے چھپ چھپ کر ساس کے ساتھ کر جایا کرتی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ساس کی خاموشی نے اسے شیر کر دیا تھا۔ چاہے وہ کچھ بھی کرے، اس کی ساس بیٹے کے کان نہیں بھرے گی۔ اس کی چغلیاں لگا کر مرمت نہیں کروائیں گی۔ یہ اطمینان ہوا تو عائشہ نے مزید آزاد کر لیا، ذرا ذرا سی بات پر چیخ چلا کر بول کر جواب دیتی۔
ساس کی خاموشی پر بھی نادم نہ ہوتی بلکہ دل ہی دل میں خود کو بہت طاقت ور بہو گردانتی جس نے ساس پر کاٹھی ڈال لی تھی۔
"زمانے کو دیکھو، کیسے بہوئیں روتی پھرتی ہیں اور سسرال والوں کے ہاتھوں دن رات ذلیل ہوتی ہیں۔" وہ غرور سے سوچتی۔
"اچھا ہی ہے اس رشتے کو تو یوں ہی دبا کر رکھنا چاہیے۔" وہ خود کو ہر پل مطمئن کرتی رہتی۔
اپنے والد کی نصیحت تو وہ یکسر بھول چکی تھی کہ "اب یہی تمہاری ماں ہیں، ان کی خدمت میں کوتاہی نہ کرنا اور خوب دعائیں لینا۔"

☆☆☆

ساس کو دمے کے مرض نے آ لیا تو عائشہ چڑ کر رہ گئی۔ کاموں کا بوجھ، عدنان کی ذمہ داری اور بیمار وجود کی ہر وقت کی دیکھ بھال...... اس نے دبے لفظوں میں عدنان سے کہہ ڈالا۔
"امی کے لیے کوئی "نرس" رکھوا دیں تا کہ امی کے کام وقت پر ہو جایا کریں گے۔ میں کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے اکثر الجھ سی جاتی ہوں۔ ایک بیمار بندے کو فل ٹائم خدمت گزار چاہیے جو ہر وقت ان کے پاس ہو۔" عائشہ نے اپنی طرف سے تو بڑی سلیقے سے بات کی تھی مگر شوہر نامدار بالکل متاثر نہ ہوئے نہ ہی قائل ہوئے۔ بلکہ عائشہ کی اچھی بھلی طبیعت صاف کر ڈالی، کہ کئی دن تک عائشہ بھڑ کی طرح منہ پھلائے پھرتی رہی۔
"گھر میں تین لوگ ہیں، کتنا کام ہوتا ہے جو تم ہر وقت مصروف رہتی ہو۔ میں سارا دن باہر ہوتا ہوں، ایک ہفتہ بیاہا ہوا تو وہ دو دن تمہارے نکل جاتے ہیں اور میں بھی تم سے نت نئے کھانوں کی فرمائش نہیں کرتا اور مجھے گھر کے دیگر کام تو گھر میں کون سا ابھی بچے ہیں جو اتنا گند پھیلا دیتا ہے کہ تم سمیٹتے ہوئے ہلکان ہو جاتی ہو۔ ابھی تو ہماری کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔"
عدنان نے یہ سب دھیمے انداز میں کہا تھا مگر عائشہ نے اس بات کو طعنہ قرار دیا۔
"عدنان...... ساری زندگی میرے دل سے اب یہ بات نہیں نکلے گی کہ آپ نے مجھے بے اولادی کا طعنہ دیا تھا۔ اولاد عورت نہیں مرد کی قسمت سے ہوتی ہے مگر طعنے ہمیشہ عورت کے نصیب میں ہی آتے ہیں۔" عائشہ نے بات کو اپنے معنی پہنا کر اسے انتہائی بڑھایا تو ہلکی پھلکی بحث اچھے خاصے معرکے میں تبدیل ہو گئی۔ سامان سمیٹا اور روتی دھوتی اپنے میکے جا پہنچی...... لیکن وہاں بھی والد محترم نے عائشہ کی ہی غلطی نکالی اور دوبارہ سے سسرال روانہ کر دیا گیا۔
اس سارے قصے کی خبر بیمار ساس کو بھی ہوئی تو انہوں نے بہو کی حمایت کی اور عدنان کو معافی مانگنے کے لیے کہا مگر عائشہ کے دل سے بدگمانی ختم نہ ہوئی اور جہاں تک ساس کی حمایت کی بات تھی تو اس کو بھی عائشہ نے منفی سوچوں کے جالے میں لپیٹ دیا۔
"اونہہ...... حمایت تو کرنی تھی بہو کی، مفت کی نوکرانی جو ہاتھ سے نکل رہی تھی۔ اب خدمت کرنے والا میرے علاوہ ہے بھی تو کوئی نہیں۔"

☆☆☆

اس معرکے کے بعد تو عائشہ کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔ دماغ توپ خانہ بن گیا۔ توپ کے دہانے پر جہاں ہر دم گولے تیار رہتے گولہ باری کرنے کے لیے۔ اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ سارے فساد کی جڑ صرف اور صرف "ساس" نام کی مخلوق ہے اور جب تک یہ حیات ہے زندگی میں یوں ہی بے سکونی رہے گی۔ وہ عدنان سے نظر بچا کر چھوٹی چھوٹی انتقامی کارروائیاں کرنے لگی۔ ان کی آواز سن کر خود کو بہرہ بنا لیتی، ٹی وی کا والیم اونچا کر دیتی، فون پر بات چیت کرتی تو گفتگو کو مزید طویل کر لیتی کہ "ساس" کی آوازیں اس کے پردۂ سماعت تک پہنچنے سے پہلے راستے میں ہی دم توڑ جائیں۔
"عائشہ...... کھانا تیار کر لیا ہے تو بیٹا لا دو۔ مجھے دوا بھی کھانی ہے۔" کمزور ضعیف آواز دن میں کتنی بار ہی مچلتی مگر عائشہ کا دل موم نہ ہوتا۔ اگر ضمیر جھنجوڑنے کی کوشش کرتا تو وہ خود اپنا وکیل بن کر میدان میں نکل آتی۔
"آخر کو میں بھی انسان ہوں۔ میری بھی کوئی زندگی ہے، اگر یہی خدمتیں اور تیمارداریاں ہی کروانی تھیں تو سرخ جوڑے میں بیاہ کر لانے کی کیا ضرورت تھی۔ سفید وردی دے کر کہتے "چلو بی بی! یہ زیب تن کر لو اور نرس کے فرائض سرانجام دینے کے لیے ہمارے گھر چلو۔" وہ تنفر سے سوچتے ہوئے سر جھٹکتی۔
آواز دے کر وہ بیمار اور ناتواں وجود جب تھک جاتا تو تھک کر بنا کھائے پیے ہی کڑوی گولیاں حلق سے اتار لیتا یا پھر خود ہی گرتے پڑتے کچن میں جا کر پیٹ کا دوزخ بھر لیتا۔
"عائشہ...... بیٹا ذرا میری ٹانگیں تو دبا دو۔"
کاموں کی بھرمار سے ستائی عائشہ جو پہلے ہی چڑچڑاہٹ کا شکار ہوئی بیٹھی تھی اس حکم پر تو دماغ ماؤف ہو گیا۔ دل کا سارا غبار جو کتنے مہینوں سے بھرا ہوا تھا، چند منٹوں میں نکال دیا۔ اتنے سخت اور کرخت انداز و الفاظ کا استعمال کیا کہ وہ حیرت سے اسے یوں بولتا دیکھتی رہ گئیں۔
"خود تو بیماری کا بہانہ بنا کر بیڈ پر چڑھ کر آرام فرمایا جاتا ہے اور ٹانگیں بھی آپ کی ہی درد کرتی ہیں۔ آپ کی تو ٹانگیں میں دبا دوں گی اور میری ٹوٹی ہوئی ٹانگوں کو کیسے سکون ملے گا۔" عائشہ نے بدلحاظی

یہ کہتے ہوئے ہر حد پار کر ڈالی تھی۔ وہ بوڑھا وجود نم آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔ پل بھر کے لیے یہ بھی نہ سوچا کہ بے بسی و مجبوری کا وقت تو کسی پر بھی آجاتا ہے، چاہے جوان ہو یا بوڑھا۔

☆☆☆

عائشہ کافی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی کہ عدنان راتوں کو دیر سے گھر آنے لگا ہے، پوچھتی تو ٹال مٹول سے کام لیتا۔ زیادہ کریدتی تو چلانے لگتا۔ آئے روز لڑائی جھگڑے ہوتے کہ بات مار پیٹ تک پہنچ جاتی مگر عدنان پھر بھی نہ اکتا۔ معاملات زیادہ سنگینی کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ عدنان اب راتوں کو بھی باہر رہنے لگا۔ عائشہ رات بھر انتظار کرتی سحر پھیل جاتی مگر عدنان پھر بھی نہ آتا۔ فون کرتی تو کال ریسیو نہ کرتا۔ عدنان کی غیر حاضری کو ماں نے بھی محسوس کر کے باز پرس کی مگر عدنان نے ماں کو بھی صحیح جواب نہ دیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی معاملہ زیادہ خرابی کی طرف چل پڑے تو پھر اس کے نتائج غلط ہی نکلتے ہیں۔ چاہے جتنے حیلے بہانے بنالو، سات پردوں میں چھپالو، بالآخر حقیقت سب کے سامنے آ ہی جاتی ہے۔

"عائشہ میں دوسری شادی کر چکا ہوں، اپنی آفس کولیگ سے۔ تم ابھی تک مجھے اولاد کی خوشی نہیں دے سکیں، کب تک انتظار کرتا۔ میں تمہیں طلاق دے کر بے گھر نہیں کروں گا۔ میں تمہارے حقوق کا بھی خیال رکھوں گا مگر......" اس کے آگے کہنے سننے کو بچا ہی کیا تھا۔

وہ خوب روئی چیخی...... چیخی چلائی مگر تیر چل چکا تھا جس نے عائشہ کا دل تھا جو بری طرح سے لہولہو تھا۔

عدنان تو مرد تھا اور مرد کو عورت کے جذبات و احساسات کا اندازہ ہی کہاں ہوتا ہے۔ گھر کے کونے میں پڑی بیمار ماں جو عائشہ کے لیے بوجھ اور قابل نفرت تھی۔ عائشہ کی تکلیف پر تڑپ اٹھیں کہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"عدنان...... میری بہو صرف اور صرف عائشہ ہے یاد رکھنا۔ عائشہ کے علاوہ میرے دل میں اور اس گھر میں کسی دوسری عورت کی گنجائش نہیں ہے۔" ماں نے فیصلہ سنایا۔

"امی! آپ اس عورت کی حمایت کر رہی ہیں جو آپ کی خدمت تک دل سے نہیں کرتی۔ آپ کو بوجھ سمجھتی ہے۔ جس کے دل میں آپ کے لیے ذرا سی جگہ تک نہیں ہے اور نہ ہی زبان میں مٹھاس...... اس نے کبھی آپ کو ماں نہیں سمجھا۔ وہ دھوکرتی ہے آپ کا کام تو ایسے، جیسے کسی عذاب میں ہو۔ امی! وہ اس گھر میں ایسی ہے جیسے بے پھول کا پودا اور بے پھل کا درخت۔ آپ اس کی حمایت کر رہی ہیں۔" عدنان نے غصے سے کہتے ہوئے بے اولادی کا بھی ذکر کر ڈالا۔

الفاظ تھے کہ سنگ، دل میں سوراخ کر گئے۔ برف پگھلنے لگی اور دل میں نفرت کے منصوبے تو اناورخت کو آرے کی طرح چیر گئے۔

"یہ میرا اور میری بہو کا معاملہ ہے۔ عدنان تم اپنی کوتاہیوں پر غور کرو، جو وہ کرتی ہے یہ اس کا ظرف ہے اور جو میں کرتی ہوں وہ میرا ظرف ہے۔" کمرے کے باہر کھڑی اپنے نصیبوں کو روتی عائشہ نے اپنی ساس کی اپنے حق میں حمایت سن لی تھی۔ وہ عورت عائشہ جیسی بے اولاد عورت کی حمایت کر رہی تھی جس کا بیمار وجود عائشہ کے لیے صرف بوجھ تھا۔ جس سے ہمیشہ کراہیت کھائی، خدمت سے جی چرایا، جو اسے پکارتی رہتی اور عائشہ بہری بنی اپنے کاموں میں مگن رہتی۔ اگر کبھی وہ پرہیزی کھانے کا ذکر کرتیں تو کورا کرارا جواب ان کو خاموش کر دیتا۔

جاڑے کے دنوں میں وہ بوڑھا بیمار وجود ساری رات کھوں کھوں...... کھانستا رہتا۔ تو عائشہ کانوں پر تکیہ رکھے سونے کی سعی کرتی رہتی اور دل ہی دل میں انہیں کوستی بھی رہتی۔

"خود کو نیند نہیں آ رہی، تو دوسروں کی بھی نیند حرام کر دی ہے۔ یہ بڑھاپے اور بیماری کا مجھ پر کیا عذاب نازل ہو گیا ہے۔" اپنے کہے الفاظ اسے شرمندہ کر گئے۔ آنکھوں سے ندامت کا پانی گرنے لگا۔ وہ سر تا پا اس میں ڈوب گئی۔

اندر اس کی ساس کھانستے ہوئے بامشکل اپنی بات کر رہی تھیں۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے تمہارے جیسے نافرمان بیٹے کی، جو ماں کی بہو اور بیوی کا نہ بن سکا، وہ کسی کا کیا بنے گا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ، ہم جی لیں گے تمہارے بغیر۔" یہ الفاظ ان کے فیصلہ برحق ہونے کا عکاس تھے۔ الفاظ کی گہرائی نے عائشہ کو ندامت و پچھتاوے کی زمین میں گاڑ دیا، پشیمانی حد سے سوا تھی۔ قدموں نے وجود کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ وہ بامشکل اپنے کمرے تک پہنچی۔

☆☆☆

اپنی سفاکی اور لاپروائیوں کا رجسٹر اس کے سامنے کھلا ہوا تھا اور وہ وا آنکھیں چشم نم دیکھ رہی تھی۔ آج اس کو پتہ چلا کہ اس کی ساس جانتی تھیں تو اس سے اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کر لیتیں مگر انہوں نے اعلاظرفی کی انتہا کر دی۔ عائشہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔ عدنان کی بے وفائی نے اتنا گہرا زخم دیا تھا کہ عقل کی یہ بات تسلیم کر رہی تھی۔ اس کا ضمیر غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح پکار رہا تھا اور وہ شدید انداز میں اعتراف کے ایسے مرحلوں کو پار کرتی جا رہی تھی۔

"کھوں...... کھوں......" نقاہت بھری آواز کانوں میں پڑی تو ہمیشہ کی طرح اس نے بے نیازی کی روا نہیں اوڑھی تھی بلکہ برق رفتاری سے آواز کی جانب لپکی۔ انداز میں خوف اور دماغ میں ایک ہی سوچ حاوی ہو گئی تھی کہ "کہیں دیر نہ ہو جائے...... وقت ہاتھ سے نکل جائے اور وہ کف دست ملتی رہ جائے۔"

وقت نے اسے ایسی چوٹ لگائی تھی کہ وہ سنبھل گئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ چوٹ تو پھر ٹھیک ہو جاتی ہے، زخم کب تک ہرا رہے گا، آخر بھر ہی جائے گا مگر پچھتاوے ساری زندگی تعاقب کرتے رہتے ہیں مگر گزرا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا۔

وہ بے اولاد تھی مگر وقت اور حالات نے اس کے اندر شفقت کے جذبات جگا دیے تھے۔ اب وہ اپنی ماں جیسی ساس کی خدمت دل و جان سے کرنے لگی تھی۔ ان کی ایک پکار پر ہر کام بالائے طاق رکھتے ہوئے دوڑی چلی آتی تھی۔

اب راتوں کو کھوں کھوں کی آواز زچ نہیں کیا کرتی تھی بلکہ وہ تڑپ کر اٹھتی اور ان کو دوا پلاتی۔ یوں جیسے ماں اپنے شیرخوار کی تکلیف پر راتوں کو اٹھتی ہے۔

جب خدمتوں میں خلوص و محبت کا رنگ نمایاں ہوا تو دعائیں بھی عرش تک جا پہنچیں اور عرش کی بلندیوں کو چھوتے ہی مقبول ہونے لگیں۔ عائشہ کا سویا مقدر بھی جاگ اٹھا، اس کی "گود ہری" ہو گئی۔ وہ اپنے رب کے حضور سربسجود تھی کہ اس نے صحیح وقت پر ہدایت نصیب فرما کر اسے پچھتاوے سے بچا لیا ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جاتا تو بہت دیر ہو جاتی۔ آنسوؤں کو آنچل میں جذب کرتے ہوئے تصور میں عدنان کا چہرہ بھی ابھر آیا۔

"آپ بھی واپسی کے لیے قدم اٹھالیں عدنان! وقت ہاتھ سے نکل گیا تو دیر ہو جائے گی اور پھر سوائے افسوس کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ دوسروں کا دل دکھا کر کبھی بھی خوشیاں نہیں ملتیں۔" عائشہ کی گود ہری ہو گئی تھی مگر دوسری بیوی جس کے لیے عدنان عائشہ کو بھلا بیٹھا تھا ابھی تک بے اولاد تھی۔

"عائشہ بیٹی! آج ذرا دلیہ تو بنا دو، بہت دل کر رہا ہے۔" ساس کی مہربان آواز سماعت سے ٹکرائی۔ وہ جو جائے نماز لپیٹ کر رکھ رہی تھی، ان کی آواز پر محبت سے مسکرائی۔

"دلیہ تو آج میں نے صبح ہی کا بنا کر رکھ دیا تھا، میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج میری امی کا دلیہ کھانے کا موڈ ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی، ان پر ایک پیار بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

اس کے انداز و اطوار میں محبت، تابعداری کے ان گنت رنگ تھے کہ اس کی ساس نے دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا اور چہرے پر اطمینان بھرا تبسم پھیل گیا۔



مکمل ناول

اں بھی میاں صاحب زادے پھر کیا سوچا
ے
ں کاؤنٹر کے ساتھ رکھے اسٹول پر بیٹھے کبیر
بیٹھا تھا۔ وہ سامنے رکھے جوس سے بھرے
ا دیر سے گھور رہا تھا۔ ہنوز اسی شغل کو جاری
نے اچکا دے۔
یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ یہاں تم اتنے لاپروا
عمر کا وہ عالم ہے کہ اسے تو آج کل اپنی
بھول گئی ہے۔ اس کے پاس تو اور کوئی
یں رہا بات کرنے کے لئے۔ وہ تو اپنے
معاملات طے کیے ہوئے ہے۔ اس کا
تم اسے انکار نہیں کرو گے اور خیال تو میرا
ے کہ تمہیں یہ گولڈن چانس مس نہیں کرنا

چاہیے۔" کندھوں پر ڈالے تولیے سے چہرہ تھپتھپاتے وہ بول رہے تھے۔ اس نے آخری فقرے پر آنکھیں چندھیا کر انہیں دیکھا۔

"ہاں تو گولڈن چانس ہی ہوا نا بیٹا جی۔ مز حبیب کی نظر انتخاب تم پر ٹھہری ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ یہاں کی مسلم کمیونٹی کے بے شمار لوگ ہیں جو اس سے امید لگائے بیٹھے تھے اور اس نے سب کو چھوڑ کر تمہیں اہمیت دی ہے۔ تو جان لو کہ خوش نصیبی خود چل کر تمہارے دروازے تک آگئی ہے اور پھر تم بھی کسی سے کم تھوڑی ہو، کبیر ہاشمی کے بھانجے ہو۔"

ان کے انداز میں تفاخر تھا۔ آملیٹ کے بے پیاز کا قتلہ فوزیہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس نے بھی نظر اٹھائی اور دونوں بے اختیار مسکرا دیے۔ ان کی زبان

صدف ریحان

گماں سے یقین تک



میں کھلی ہوئی تھی۔

''واہ جی، آپ تو بڑے سیانے ہیں۔ سارا کریڈٹ خود ہی رکھ لیا۔ جبکہ عمر بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ ہمارا شہزادہ انہیں پہلی نظر میں ہی بہت اچھا لگا تھا اور پورے ڈیڑھ سال وہ اسے جانچتے رہے ہیں اور انہیں اطمینان ہے کہ نہ صرف صورت بلکہ سیرت میں بھی ضومیر ہاشمی کو انہوں نے بے مثال پایا ہے۔ خوش قسمت ضومیر ہی نہیں بلکہ عمر بھائی بھی تو نصیب والے ہیں۔ ایسا پلا پلایا خوبیوں والا بیٹا بھلا ملتا ہے آج کے دور میں؟'' انہوں نے اک پیار بھری نظر اس پر ڈالی تھی۔

''ہاں یہ تو ہے۔ ایویں ہی تو نہیں وہ طلب گار بن گئے۔ کیوں بھئی شہزادے۔'' کبیر ہاشمی بیوی کے ہم نوا ہوئے تھے۔ اسے دیکھا۔ وہ گردن نیہوڑائے گلاس کے کناروں پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔

''یہ لو بھئی ایک ہم ہیں جو سارا قصہ سمیٹے بیٹھے ہیں اور ادھر یہ موصوف گیان سے ہی باہر نہیں آ پا رہے۔ ارے میاں، میں پوچھتا ہوں اب کن سوچوں میں پڑے ہو۔ تمہیں تو اللہ پاک کا شکر گزار ہونا چاہیے جو ایسے بے دید لوگوں کے دیس میں تمہارے لیے وسیلہ پیدا کر رہا ہے۔ گزشتہ تین سال سے تم یہاں دھکے کھا رہے ہو۔ معمولی نوکریاں کرنے پر مجبور ہو۔ رہنے کے لیے دس بائے بارہ کے کمرے میں ایک بیڈ کی ہی جگہ ہے تمہارے پاس۔ جہاں تمہارے ساتھ چار لوگ اور کمرہ شیئر کرتے ہیں۔ جن میں سے دو انڈین ہیں۔ جو آئے دن تمہارے ساتھ کوئی نہ کوئی پنگا ڈالے رکھتے ہیں۔ ایک فلپائنی ہے جو رات بھر نیند میں بڑبڑاتا رہتا ہے۔

اور ایک تمہارا ہم وطن ہے جو تمہاری ہی طرح دن بھر کی کڑی مشقت کے بعد جب اپنے میٹرس پر گرتا ہے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر اونچے اونچے خراٹے لیتا ہے۔ اب ایسی صورت حال میں پوری نیند بھی میسر نہیں ہے وہاں۔ پھر جو بھی کماتے ہو سب کا سب گھر بھیج دیتے ہو اور خود چند پاؤنڈز میں گھسٹ گھسٹ کر پورا مہینہ گزارا کرتے ہو۔ کتنی ذمہ داریاں ہیں تمہارے سر پر۔ خاندان کی کفالت' بھائی کی تعلیم بہنوں کی شادیاں اور پھر سب سے بڑھ کر اپنے باپ کی حق حلال کی کمائی واپس لینے کے لیے اس خبیث شخص پر مقدمہ کرتا ہے تم نے۔

اور وہاں کی عدالتوں کے حالات تو کسی سے بھی ڈھکے چھپے نہیں۔ ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے بھی تم سوچنے کا تکلف کرو تو مجھے حیرت ہے تم پر۔ جینی اکلوتی بیٹی ہے عمر حبیب کی۔ اس کا تمام بزنس، گھر، کل کو اس کی بیٹی کا ہی ہوگا۔ اس میں سراسر تمہارا ہی فائدہ۔''

''اوہو! مجھے ان کی کسی چیز سے کیا لینا دینا۔ لیکن۔'' وہ جس تیزی سے بولا۔ اسی طرح یک لخت چپ ہو گیا۔

''کیا لیکن۔'' کبیر ہاشمی بے قراری سے مستفسر ہوئے۔ اس نے گلاس اٹھا کر ایک گھونٹ لیا۔ واپس رکھا۔ کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور اک گہرا سانس لیتے پھر سے گویا ہوا۔

''لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ عمر صاحب نے بیٹی سے بھی رائے لی ہے یا خود سے ہی فیصلہ کیے بیٹھے ہیں۔ ابھی ماں نے بتایا کہ وہ عرصہ ڈیڑھ سال سے مجھے جانچ رہے تھے۔ تو تقریباً اتنے ہی ٹائم سے میں بھی دیکھ رہا ہوں جینی اور ہری کی دوستی کو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ۔''

''ارے میرے بچے یہ انگلینڈ ہے۔ دنیا کا وہ عظیم ترقی یافتہ خطہ جہاں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ جینی اور ہری کی دوستی کوئی آج کی نہیں۔ یہ تو ان کی عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھی ہے اور پھر تم جانتے ہو، وہ دونوں کون ہیں۔ جینی، عمر حبیب کی بیٹی ہے اور ہری' منوہر سدھو ہے۔ ان کی دوستی تو ہو سکتی ہے مگر شادی ہرگز نہیں۔ ان کے درمیان مذہب کی بہت بڑی دیوار حائل ہے اور عمر

حبیب کے لیے تو ذاتی تجربہ ہی کافی ہے۔ وہ بیٹی کو کسی اندھے کنویں میں کبھی بھی گرنے نہیں دے گا۔

اور مجھے جینی کے مزاج کا بھی اندازہ ہے۔ وہ بے شک یہاں کے ماحول میں پلی بڑھی ہے۔ لیکن باپ سے محبت اور احترام اس کے خون میں رچا بسا ہے۔ وہ کبھی اس کے کسی فیصلے سے انحراف نہیں کرے گی۔ اس طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ تم اور ہاں اگر تم یہ کہو کہ تم نے اب تک آپا سے کوئی بات نہیں کی تو یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں۔ میں جانوں اور میرا کام۔ میں بہتر سمجھ سکتا ہوں تمہارے لیے کیا اچھا ہے۔ میں خود عمر حبیب سے بات کراؤں گا اور فوزیہ! تم آج ناشتا بنا رہی ہو کہ پائے گا رہی ہو۔ اللہ کی بندی اب ناشتا لے بھی آؤ۔ لیٹ ہو رہے ہیں ہم دونوں۔

انہوں نے تو اسے ہر طرح کی فکر سے آزاد کر کے فیصلہ ہی سنا دیا تھا۔ وہ مہر بہ لب اب بھی سامنے رکھے گلاس کو گھور رہا تھا۔

☆☆☆

آج اس کا موڈ صبح سے ہی کچھ بدلا ہوا ہے۔ یہ تو اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ کلاس میں ہمیشہ حاضر دماغ اور حاضر جواب رہنے والی نے سر اسمتھ کے لیکچر کے دوران آج جس بے توجہی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے تو اسے نہ صرف حیران بلکہ کافی حد تک پریشان ہی کر دیا تھا۔ اگلی کلاس کے لیے انہیں بیسمنٹ کی طرف جانا تھا۔ لیکن وہ ناک کی سیدھ میں چلتی لان میں نکل آئی تھی۔

وہ اسے وہیں سنگ مرمر کی بینچ پر بیٹھا چھوڑ کر کینٹے ٹیریا کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں کافی کے دو مگ اور سینڈوچز کے ساتھ اس کی واپسی ہوئی تھی۔

''لگدا ہے آج تہانوں اپنا ڈریس آپ پریس کرنا پڑا اے۔ فیر بعدوں باپو جی نے ناشتا بنا کر دینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اودے بعد جدوں تسی بیگ لے کے نکلے تے تہاڈی نوٹ بک کتھیں مس ہو گئی۔ ہور تے ہور تہاڈا ڈرائیور بھی اج پورے دو منٹ وچ سیکنڈ لیٹ پہنچیا سی۔ حسب معمول راہ وچ ٹریفک بہت سی۔ چار منٹ ہور ضائع ہو گئے اور اس دے بعد جدوں تسی کلاس وچ آئے تو۔''

''شٹ یور ماؤتھ پلیز۔ اب تم بولے نا تو۔ آئی ول کل یو۔'' آنکھیں نکالتے' دانت پیستے وہ کچھ اس ادا سے بولی کہ وہ یک لخت یوں چپ ہوا کہ جیسے کوئی چابی والا کھلونا۔

برسوں پرانے ساتھ میں اتنا تو وہ اسے جانتا ہی تھا کہ اس وقت اسے چھیڑنا کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔ سو چپ چاپ کافی کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ دوستی اپنی جگہ مگر وہ کافی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ہاتھ میں سینڈوچ اور دوسرے میں کافی لیے وہ مزے سے چسکیاں بھر رہا تھا۔ اس نے شرربار نظروں سے یہ منظر دیکھا اور پھر سے رخ پھیر لیا۔

''ڈیڈ بھی کبھی وہ کیا جملہ بولتے ہیں۔ سوچ رہی تھی۔ ''جس تن لاگے سو تن جانے اور نہ جانے کوئی۔''

اس وقت وہ بھی اسی دکھ سے گزر رہی تھی۔ اس کے اندر بھانبڑ جل رہے تھے۔ غضب بے بسی رنج' کیا کیا نہ تھا۔ یعنی ہر ہر کام سے پہلے اس سے پوچھنے والے ڈیڈ نے اس کی زندگی کے سب سے اہم معاملے ہی میں اس سے نہیں پوچھا تھا۔ اور رات کھڑے کھڑے بس فیصلہ سنا کر چلتے بنے۔ وہ تو اسی وقت ان سے سوال جواب کرتی اگر جو ڈاکٹر رچرڈ کی ہدایات ذہن نشین نہ ہوتیں۔

ڈیڈ کی سائڈ ٹیبل پر دھرا وہ میڈیسنز کا انبار اس کے سینے پر سل کی طرح آ پڑا تھا۔ ہونٹوں پر تالا لگ گیا۔ وہ جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔ اک طوفان تھا۔ جو اندر سر پٹخ رہا تھا۔ کون تھا جو درد بانٹتا؟ ایک یہ اس کا دوست جسے اس وقت کھانے پینے سے فرصت نہ تھی۔ بے طرح تملاتے اس کے ہاتھ سے مگ چھین کر پرے اچھال دیا۔

"ہائیں۔ ہائیں اے کی کردتا؟ اڈے مزے دی کافی رول دتی۔ دسو بھلا۔ میری کافی کا کیا قصور تھا؟" ہری پنجابی سے اردو پر اتر آیا۔ وہ تیکھے چتونوں سے گھور رہی تھی۔

"مرو نہیں۔ یہ لو یہ پی لو۔" اس نے جس انداز سے دوسرا مگ پکڑا تھا۔ اگر وہ اس کا ارادہ بھانپ کر جگہ نہ چھوڑتا تو اب تک اس کی وائٹ شرٹ ضرور براؤن ہو چکی ہوتی۔ اس نے وہ مگ بھی فضا میں اچھال دیا تھا۔

"اوہ۔ ہویا کی اے کڑیے۔ اج سویرے ناشتے وچ کی کھادا سی۔ کچھ بتاؤ کی تجھی ہوا کیا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا اور وہ اسی انتظار میں ہی تو تھی کہ کوئی تو ہو دکھ سننے والا۔ جی چاہ رہا تھا، پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ نیلی جھیلوں سے چشمے نکل پڑے تھے۔ وہ بوکھلا کر پاس آبیٹھا۔

"جینی۔ جینی۔ وائے آر یو کرائنگ مائے ڈیئر۔ واٹ ہیپنڈ؟" جینی کسی معمولی بات پر رونے والی نہیں تھی۔ وہ تو بہت مضبوط اعصاب رکھنے والی لڑکی تھی۔ کم سنی میں ہی زندگی کے اتنے روپ دیکھ چکی تھی کہ ضبط، حوصلہ اور برداشت تو جیسے ساتھی بن گئے تھے اس کے۔ ہر سخت موسم کو لب دبا کر جھیلا تھا اس نے۔ نہ آنسو وہ تو پلک کا کونا تک بھیگنے نہیں دیتی تھی۔ لیکن آج ایسا کیا ہوا تھا۔ ہری کا تشویش زدہ ہونا بنتا تھا اور وہ ہوا بھی۔ شانے پر بازو پھیلا کر ساتھ لگالیا۔ سر سہلانا چاہا لیکن ہاتھ جھٹک دیا گیا۔

"ہری۔ ہری میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ڈیڈ میرے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ زندگی کے تیس سال اس ملک میں گزارنے کے باوجود وہ آج بھی اندر سے اپنی مٹی سے ہی جڑے ہیں۔ وہ ویسے ہی کنزرویٹو ہیں۔ جیسا میں سمجھتی آئی ہوں۔

وہ مجھے کوئی مظلوم سی ویسٹرن لڑکی سمجھتے ہیں جس سے وہ اپنا کوئی بھی فیصلہ آرام سے منوالیں گے اور میں چپ رہوں گی۔ تو۔ نو۔ مجھے شور مچا... ہے۔ بہت سارا۔ مجھے چلانا ہے۔ آآآ" چھم روتے' کانوں پر ہاتھ رکھتے بلاتوقف وہ چیختی گئی۔

آس پاس سے گزرتے کئی اسٹوڈنٹس نے رک کر ایک نظر دیکھا ضرور، مگر کسی نے بھی ماجرا پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ایسے بہت سے تماشے روزانہ دیکھنے کے عادی تھے۔ پھر ہری تھا نا اس کے قریب۔ جس کے اپنے چھکے چھوٹ گئے تھے۔

"جینی۔ جینی۔ پلیز کول ڈاؤن۔۔ ہوا کیا ہے؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔" وہ جھنجلایا [illegible] اور اتنی طاقت لگا کر چلانے کے بعد جینی [illegible] قرار تو آ ہی گیا تھا۔ سوں سوں کرتے' آستین سے آنکھیں رگڑتے جو اس نے کہا اسے سن کر تو اب [illegible] کا بھی جی چاہا تھا بالکل اسی کی طرح چلانے کو۔

"کک۔۔ کیا کہا تم نے۔ انکل نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے وہ بھی تمہاری مرضی کے بغیر۔ آخر ایسی بھی کیا ایمرجنسی آن پڑی ہے انہیں اور پھر میں جو ہوں، میرا کیا بنے گا؟" اور جینی نے اسے یوں دیکھا گویا اس کا دماغ چل گیا ہو۔ وہ اپنا رونا دھونا بھول گئی تھی اور وہ تھا کہ اپنا سیاپا ڈال کر بیٹھ گیا تھا۔

"آر یو میڈ؟ کہنا کیا چاہ رہے ہو تم۔" وہ غرائی تھی اور شکر ہے کہ ہری کو بروقت احساس ہو گیا۔ وہ اسی کی بات کی طرف دوبارہ سے آتے ہوئے بولا۔

"لیکن انکل تمہارا بیاہ کر کس سے رہے ہیں؟" اور یہی انتہائی نامعقول بات کے بعد سوال پھر بھی معقول تھا۔ جینی نے برا سا منہ بناتے جو نام لیا اس پر سے تو ہری کا اپنا منہ کھل گیا۔ پھر شاید ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے وہ ہنس پڑا اور ہنستا چلا گیا۔ جینی کڑے تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"واہ۔ واہ۔ انکل نے کی شہزادہ لبھیا اے تہاڈے لیے۔ کی اعلا پسند اے اوہناں دی۔ اناں توں اس پورے انگلینڈ وچ ہور کوئی نئیں سی ملیا؟ کوئی وی اس لئی نظر نئیں آیا جو تہاڈے قابل ہوندا؟ اس بھی اداناں داہم وطن جو ہویا۔ بھاویں اس اتھے دے لوک اس نوں روبوٹ ہی کیوں نا آکھدے ہون۔ ہاہاہا۔" وہ ایک بار پھر بے ہنگم طریقے سے ہنس رہا تھا۔ جینی نے اکتا کر ایک زوردار ہاتھ گھٹنے پر جڑ دیا۔

"شٹ اپ۔ اسٹوپڈ۔ اِل مینرڈ۔" مغلظات کا ایک طوفان تھا جو پھوٹ پڑا۔ ہری کو منہ بند کرتے ہی بنی۔ ورنہ کچھ بعید نہ تھا جینی ہاتھوں کا استعمال شروع کر دیتی۔

"تمہیں ہنسی کے دورے پڑ رہے ہیں اور میرا سوسائیڈ کرنے کا دل چاہ رہا ہے۔ بجائے میرا دکھ بانٹنے کے تم دانت نکال رہے ہو۔ یاد رکھو۔ میں تمہارے بھی دانت توڑ کر ہتھیلی پر رکھ دوں گی۔ کوئی نہیں ہے میرا اس پوری دنیا میں۔ بالکل اکیلی ہوں میں۔ ڈیڈ نے بھی ثابت کر دیا انہیں بھی کوئی پروا نہیں ہے میری۔ ماں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اب ڈیڈ چاہتے ہیں، میں انہیں چھوڑ کر اس روبوٹ کے ساتھ ان کے اس تھرڈ ورلڈ کنٹری چلی جاؤں۔ تم یہ بتاؤ کیا یہ میرے ساتھ انصاف ہے۔" اور ہری کا سر آپوں آپ نفی میں ہل گیا۔

"ڈیڈ کہتے ہیں۔ وہ ایک سیلف میڈ انسان ہے۔ اس نے بڑے سخت حالات دیکھے ہیں۔ وہ اپنی محنت سے یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ ایک دن بہت ترقی کرے گا۔ تو کرے۔ مجھے میں نے روکا ہے کیا۔ وہ میرے لیے مصیبت کیوں بن رہا ہے۔ میں نے ابھی اپنی اسٹڈیز مکمل کرنی ہیں۔ اپنا کیریئر بنانا ہے۔ شادی تو میری ترجیحات میں کہیں شامل ہی نہیں ہے۔ نہیں کرنی مجھے کبھی شادی۔ ڈیڈ نے خود بڑے دکھ دیکھے ہیں نا۔ جواب مجھے بھی اس جہنم میں جھونکنا چاہتے ہیں۔ اوہ گاڈ۔ کیا کروں میں؟" وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ ہری نے دلاسا دیتے ہاتھ شانے پر رکھا۔

"بہت آسان اور سادہ حل ہے جینی۔ انکل نوں انکار کر دو۔" اور جینی نے شام کی گلابیاں گھلی نیلگوں جھیل سی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تم کیا سمجھ رہے ہو۔ میں نے ایسا نہیں کیا ہو گا۔ میں بہت غصے کے ساتھ گئی تھی ان کے روم میں۔ ارادہ بھی تھا کہ بالکل صاف انکار کر دوں گی۔ لیکن وہاں انہیں میڈیسنز کا ڈھیر کھاتے دیکھ کر بے قدموں واپس لوٹ آئی۔ میری ہمت ہی نہیں ہوئی ان سے کچھ کہنے کی۔ میں کیا کروں ہری! مجھے کوئی حل بتاؤ اس مسئلے کا۔"

"ہوں۔ ویسے مجھے انکل ورگے سمجھ دار شخص توں ایسے کسی بھی بیوقوفانہ فیصلے دی توقع نہیں سی۔ تم بالکل ٹھیک ورئیڈ ہو۔ تمہیں اندازہ بھی ہے یہ شادی تمہیں کتنے مسائل سے دوچار کر سکتی ہے۔ وہ ضمیر ہاشمی جس کی صرف بوتھی ہی تو منہ متھے لگتی ہے۔ بس اور بھلا ایسا کیا چنگا ہے اس میں جو تمہارا پاپا اسے سوچنے

پر تیار ہو گئے ہیں۔ ارے کل کلاں کو وہ بوریا بستر باندھ کر تم کو پاکستان گھسیٹ کر لے گیا تو۔ تو کی ہوئے گا تمہارا؟ وائے گرو کی قسم یہ قوم ایسی ہی جنونی ہے۔ کوئی پتا نہیں چلتا ان کا کس وقت کیا کر گزریں۔ اب تم اپنے ڈیڈ کو ہی دیکھ لو۔ چنگے بھلے بائی (آدمی) تھے کل تک اور آج ان کے دماغ الٹنے کی خبریں سن رہا ہوں، اپنے ان گناہگار کنوں (کانوں) سے۔ تیس ورے (برس) بیت گئے ان کو اپنے دیش سے ادھر آئے۔ وہ بھی پلٹ کر نہیں گئے۔ وہ بھلا کیا جانیں وہاں کیا حالات بن چکے ہیں۔ اوہ جس ملک میں کئی کئی گھنٹے لوڈ شیڈنگ ہوتی ہو۔ جہاں جنتا کی جان مال ہی محفوظ نہ ہو۔ وہ وہاں اپنی کلی کلوتی دھی کو کیسے بھیج سکتے ہیں؟ وہ بھی ایک سراسر انجان شخص کے حوالے کر کے۔ سچ پوچھو جینی تو میتوں بالکل یقین نہیں ہو رہا۔" ہری کا بولنا بتا رہا تھا کہ وہ غصے میں آچکا ہے۔

اور یقین تو اسے خود بھی اب تک نہیں آیا تھا۔ یہ سب باتیں تو وہ بھی جانتی تھی۔

"میں نے تم سے کوئی حل پوچھا ہے اور تم ہو کہ اور تنگ چھیڑ کرنے لگے۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے۔ میں خود ہی دیکھ لوں گی اب کیا کرنا ہے مجھے۔" اور اس کے دفع ہونے کا انتظار کیے بنا ہی وہ بیگ شانے پر ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہری نے اسے بازو سے تھام کر روکا۔

"اوہ۔ جینی حوصلہ کرو۔ ایسے مت گھبراؤ۔ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے۔ یہ مصیبت بھی ٹل جائے گی۔ بیٹھ جاؤ۔ مل کر سوچتے ہیں کچھ۔"

بلاشبہ ہری نے زندگی کے بہت سے کٹھن مقامات پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ اب بھی وہ اسی امید کے سہارے پھر آ بیٹھی اور گرم کافی کے ساتھ تازہ سینڈوچ کھاتے ہوئے آخرکار انہیں اس "سمسیا" (مسئلہ) سے نپٹنے کا سرا مل گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے دروازہ نہایت آ سے بند کیا۔ مگر

فوراً ملنے کی ہمت نہ کر سکا۔ اسے لگ رہا تھا سے مل نہیں سکے گا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا اس کے دونوں شانوں پر اب بھی عمر بھر دھرے ہیں۔ بھاری اور شفقت اور ان ہاتھوں بھرا لمس بول رہا ہے۔

وہ کس قدر خوش تھے اور کتنے بے فکر عرصے میں اس نے بھی ان کے چہرے مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی جس نے آج ان کا جگمگا ڈالا تھا۔

اس نے تو چاہا تھا کہ پوری دیانت دار اس نئے تعلق کو نہ صرف بنائے گا بلکہ نبھائے مگر وہ تو بھلا ہو ان کی صاحبزادی کا جس نے ارادوں پر پانی ہی پھیر ڈالا تھا۔

اس روز ویک اینڈ تھا اور وہ اپنے پورے ہفتے کا حساب کتاب کرنے میں بری مصروف تھا۔ جب اس کے کیبن کا دروازہ بجا "یس۔" یونہی سر جھکائے اس نے کہا تب جب اک دل فریب مہک کیبن میں پھیلی اس نے بے اختیار جھکا سر اٹھایا اور اس کے تصدیق بنفس نفیس کھڑی تھی۔

جنت عمر۔ عرف جینی۔ کیبن میں پھیلی خوشبو اس کے مخصوص پرفیوم کی ہی تھی۔ گھنگھریالی بالوں کے ہالے میں اس کا چہرہ سے سجا گلابی خوب صورت چہرہ ہمیشہ کی طرح بھی بے تاثر تھا۔ ہاں البتہ کاجل کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ مگر کیا؟ یہ وہ سمجھنے سے قاصر بلیک لانگ اسکرٹ کے ساتھ پنک چیک کی شرٹ زیب تن کیے گلے میں لاپروائی اک رومال ڈالے کسی بھی جیولری یا میک اپ بے نیاز وہ اس کے سامنے آ بیٹھی تھی اور اس ہی ہری بھی چلا آیا تھا۔ بڑے تھمے سے پائے کے وہ آ کر اس کے ساتھ رکھی کرسی پر ہو گیا اور وہ تو اسے پہلے ہی کچھ خاص پسند تھا۔ اس حرکت کے بعد تو گویا ناپسندیدگی پر

کیا۔ "تم بزی تو نہیں تھے مسٹر روبوٹ۔ اوہ سوری مطلب ہے مسٹر ضومیر ہاشمی؟" اپنی چنی چنی آنکھوں کو گھماتے ہوئے جس خباثت سے وہ بولا اس کا بے اختیار جی چاہا۔ گھما کر ایک چپت اس کی پر دے مارے۔ مگر زبردستی کی مسکان ہونٹوں پر لاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"اوہ گڈ۔ دیکھا جینی! میں تاں پہلے ہی کہا ضومیر نوں بھلا کیا کام ہونا ہے اس وقت۔ بلکہ کسی بھی وقت۔ سارا کام تے ورکرز کردے نیں۔ صرف سپروائزنگ ہی کرواندا اے۔ خیر ہن او کل کو اسی کرن آئے آں۔" اس ضمونے کے پہلے لیے کیا کم تپایا تھا کہ اس بات نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ضومیر کا دل جل کر خاک ہوا۔ ہتھیلی پر اک بار پھر کھجلی ہوئی تھی۔ لیکن کمال ضبط تھا اس میں کہ چہرے پر بھی برہمی کی اک لہر نہ آنے پائی۔ اس نے سامنے کھلا لیپ ٹاپ بند کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ان کی سننے کے لیے تیار ہے۔ اور سمجھدار تو خیر سے وہ دونوں ہی تھے۔ لیے تو ہلکا سا گلا کھنکارتے ہوئے جینی اس کی متوجہ ہوئی اور جو کچھ اس نے کہا وہ دم سادھے سنتا رہا۔ اس نے صفائی سے بتایا تھا کہ وہ اس شادی میں قطعاً دلچسپی نہیں رکھتی ہے۔

"تو کیا آپ کا انٹرسٹ کہیں اور ہے؟" اس نے یونہی معلومات میں اضافے کے لیے پوچھ لیا

"اوہ نن آف یور بزنس۔" جواباً وہ کچھ یوں چبا کر بولی کہ وہ بھی بھنا کر رہ گیا۔

"میں یہ سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ یہ سب مجھے کیوں بتانے آئی ہیں۔ آپ کو یہ سب عمر صاحب سے کہنا چاہیے اور میں یہ بھی کلیئر کر دوں کہ میں نے ان کے سامنے ایسی کوئی تجویز نہیں رکھی تھی۔ یہ ان کی اپنی خواہش تھی جو میں صرف ان کے احترام میں قبول کر بیٹھا ہوں۔" اور یہ وہ جوتا تھا جو اس نے بھگو کر مارا تھا۔ جینی مارے طیش کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ۔ جینی پلیز سٹ ڈاؤن سویٹی۔ اینڈلی کول یہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ یہ تمہارے ڈیڈ کا ہی چھوڑا ہوا شوشا ہے۔ اناں نے تے کجھ زیادہ ہی سر تے سوار کر لتا اے اپنی بیماری نوں۔ اب ایسا بھی خطرناک مرض نہیں لگ گیا ان کو کہ وہ اس طرح کے بے وقوفانہ فیصلے کرتے پھریں۔ مگر یہ کر ہی چکے ہیں تو اسے اب بھگتنا نہیں ہے بلکہ اس سے نپٹنا ہے اور وہ اسی صورت ممکن ہے کہ ان کی نظر میں یہ شادی تو ہو لیکن اصل میں ہو صرف پیپر میرج۔"

ہری کے فیصلے نے آخر کار بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی تھی۔ وہ ہکا بکا ان دونوں کی صورت دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ معروف شاہراہ پر واقع ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا کمرہ تھا۔ دروازے سے لے کر در و دیوار اور فرش سے لے کے چھت تک تازہ مہکتے پھولوں سے کچھ یوں سجاوٹ کی گئی تھی کہ کمرہ گل گلزار ہو گیا تھا۔ پورے بیڈ پر بھی پھول ہی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو نے فضا معطر کر رکھی تھی۔ اس پر آرائشی لائٹیں اتنی ترتیب اور نفاست سے لگائی گئی تھیں کہ رات کے اس پہر دن کا گمان ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی کمرہ نہیں بلکہ جنت کا ایک ٹکڑا ہے جو آج کی رات زمین پر اتر آیا ہے۔

ایک لمحے کو تو وہ بھی مبہوت رہ گئی تھی۔ یہ سب اس کے ڈیڈی کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا اور وہ آج کس قدر مطمئن تھے۔ اس کی آنکھوں نے یہ بھی دیکھا تھا۔ ایک لمحے کو اسے خود پر شرم آئی تھی۔ اس نے یقینی طور پر انہیں دھوکا دیا تھا۔ مگر یہ احساس ایک پل کا تھا۔ گردن جھٹک کر سر میں چبھتی پنیں نکالنے کو ہاتھ بڑھایا۔ اسے لگ رہا تھا، منوں بوجھ اٹھا رکھا ہے۔

زندگی میں آج پہلی بار اتنا بھاری بھرکم لباس پہنا تھا۔ اب دم گھٹ رہا تھا۔ اسے فوری نجات

چاہیے تھی۔ مگر وہ کمرے میں اکیلی نہیں تھی۔ اس خیال کے آتے ہی جھنجھلا کر ہاتھ میں تھاما سنہری اور سرخ موتیوں سے جگمگاتا کلچ سائڈ ٹیبل پر اچھال دیا جو بیڈ کے کونے سے ٹکرا کر نیچے جا گرا۔

قبل اس کے کہ ضومیر ہاشمی پلٹ کر دیکھتا۔ دروازہ کھلا اور ہری کا سر اندر آیا اور پھر وہ خود پورے کا پورا۔ ضومیر کو تو غصہ ہی آ گیا۔ ایک تو کم بخت کی شکل نامعقول تھی اس پر حرکتیں بھی ناقابل برداشت کرتا تھا۔

"واؤ۔ روم تو بڑا کلاسک ڈیکور کروایا ہے انکل نے۔ اناں تے دل دے سارے ارمان ہی کڈ چھڈے۔ ویسے اناں دی چوائس تو ہمیشہ ہی بہترین رہی ہے مگر۔"

وہ جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ضومیر کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ یہ موقع نہیں تھا۔ ورنہ وہ ضرور اس کا جبڑا ہاتھ پر رکھ دیتا۔ وہ صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ دونوں اسی طرح اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔

"اوہ بھئی مہمان ہوں میں یہاں۔ ایک کپ چائے تو پلواؤ کم از کم۔" اس کی ڈھٹائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جینی نے اسے گھورا اور بولی۔

"ہری! میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہے۔ تم مزید درد سر مت بنو۔ سیدھے سیدھے کام کی بات بتاؤ۔"

"کام کی بات۔ اوہ ہاں یہ لو روم نمبر 243 کی چابی۔ یہ تو گرو کی کرپا ہے جو اسی ہوٹل میں روم مل گیا۔ صرف تمہاری خاطر آج کا سارا دن جان لڑا کر مشن پاسیبل کر پایا ہوں۔ احسان سمجھو میرا احسان۔" وہ سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے پیار سے کہہ رہا تھا۔

اک گہری سانس لیتے جینی نے اسے دیکھا پھر ضومیر کو اور اس نے بھی اسی پل اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پھر وہ تو لاپروائی سے نظر کسی اور رخ کو پھیر گئی۔ مگر وہ دیکھتا کا دیکھتا ساکت رہ گیا تھا۔ مشرقی دلہنیں تو بے شمار دیکھی تھیں۔ مگر مشرق اور مغرب کا حسین امتزاج لیے ہوئے تھی۔ جسے وہ دیکھ رہا تھا۔

مونگیا اور سرخ کے امتزاج کے ڈریس میں جینی کا دراز قد کچھ اور نمایاں لگ رہا تھا۔ اس لباس کی دلکشی کا حصہ تو تھا ہی مگر اس روپ کو جس مہارت سے بیوٹیشن کے مشاق ہاتھوں نے سنوارا تھا۔ وہ اس جیسے بے زار شخص کو بھی ... کو ساکت کر گیا تھا۔ وہ تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

یہ وہ جینی تو نہیں تھی۔ یہ تو کسی دور دیس کی پری تھی۔ جو اس کے حواس چھین رہی تھی۔ ... سے لوگوں کے درمیان اس نے ایک ... تھا۔ جن کی رو سے وہ سر تا پاؤں اس کی ملکیت بنی تھی۔ وہ اس کی تھی۔ صرف اس کی۔ ... گمانی چند لمحوں کی تھی۔ کیونکہ اگلا خیال جسم سے ... کھینچنے والا تھا۔ کیونکہ وہ دن پہلے بھی وہ ایک ... چکا تھا اور وہ دستخط بہت سے لوگوں کے درمیان ... بلکہ صرف اس کے سامنے ہی کیے تھے اور جن ... سے وہ اس پر اپنے سب حقوق کھو چکا تھا۔ خواہ ... یوں لگ رہا تھا وہ کھڑے کھڑے ہوا میں ... ہے۔ اوپر اور اوپر۔ وہ خلا میں تیر رہا ہے۔

"اوہ یہ تم دونوں کیا الگ الگ منہ کیے کھڑے ہو۔ چلو چھیتی نال ایدھر میرے سامنے آ جاؤ۔ ... چنگیاں چنگیاں فوٹو آں بنا کر انکل نوں سینڈ کر... وال۔ سمجھا کرو نا۔ خوش ہو جان گے او۔ اوہ ... شک معاملہ کوئی اور ہے مگر انکل کو "سب اچھا" کے ایکسپریشن دو نا بھئی۔ چیئر اپ یار۔ ... پلیز۔"

ہری کے سیل فون کا رخ ان کی طرف تو ... دونوں کو ہی نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانا پڑا تھا۔ ... کی مسکراہٹ میں جھنجھلاہٹ تھی اور دوسرے ... یہ تو اس وقت وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جس سے اس کے ہونٹ پھیلے ہوئے ہیں، کیا واقعی مسکرانا کہا جاتا ہے؟

☆☆☆

لکڑی کی سال خوردہ الماری کے کھلے ہوئے پٹ کو احتیاط سے کھولے وہ سارے خانے چھان چکا تھا۔ مطلوبہ شرٹ کہیں ہوتی تو ملتی۔ کپڑے تھے ہی گنتی کے بس تین۔ سب کو جھٹک جھٹک کر رکھ دیا۔ اس چکر میں الماری میں کپڑوں کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں باہر آ گری تھیں۔ اس نے تو سارا کمرہ ہی تلپٹ کر ڈالا تھا۔ ثریا خاتون ناشتے کی ٹرے لیے کمرے میں آئیں تو وہاں کی حالت نے انہیں حیران کر دیا۔

"ارے میرے چاند۔ کیا ڈھونڈ رہے ہو بیٹا۔ تمہاری سب چیزیں، سارے کاغذات میں نے ... کر کے اس ٹیبل پر رکھ دیے تھے۔ جو بھی دیکھنا ہے۔ یہ رہا دیکھ لو۔"

"وہ سب چیزیں تو وہیں ہوں گی اماں جی۔ میں تو اپنی نیلے رنگ کی شرٹ ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ جو ... دھلوائی تھی آپ نے۔ میں نے خود ٹانگ کر ... کپڑوں کے ساتھ رکھی تھی اب مل نہیں رہی۔ ... دیر بھی ہو رہی ہے۔ انٹرویو کے لیے نکلنا ... کا ٹائم ہے اور نو بج گئے ہیں۔"

"کیا کہا وہ شرٹ۔" ثریا خاتون چپ ... ہو گئیں۔

"وہ شرٹ۔ ارے وہ تو کل تارے کو پہنے ... دیکھی تھی میں نے۔ بڑا تیار شیار ہو کر گیا تھا۔ ماشاء اللہ بڑی ہی اٹھ رہی تھی اس پر وہ شرٹ۔ کہہ رہا تھا۔ ... دوستوں نے مل کر کوئی پارٹی شارٹی رکھی ہے وہاں جا ... رہا ہوں اور...."

وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں کہ وہ ماتھے کی ... پیچھے کرتا ایک جھٹکے سے اٹھا تھا۔ کپڑوں کے ڈھیر میں ہاتھ مار کر اک شرٹ گھسیٹی اور باہر نکل گیا۔

"اوہو۔ چاند۔ بیٹا ناشتا تو کر لو، شرٹ میں استری کر دیتی ہوں۔" وہ اس کے پیچھے آئی تھیں۔

"رہنے دیں، خود کر لوں گا میں۔ حد ہو گئی۔ وہ میری شرٹ آپ کے سامنے پہن کر چلا گیا اور آپ نے اسے روکا بھی نہیں۔ آپ کا وہ شہزادہ بھی اپنی کسی چیز کو ہاتھ بھی لگانے دیتا ہے مجھے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اماں جی! آپ ہمیشہ ناانصافی کرتی ہیں میرے ساتھ۔"

اسے غصہ آیا تھا۔ تارے اگر اس وقت سامنے ہوتا تو وہ ضرور اس کی گردن دبوچ لیتا۔ پرانی عادت تھی اس کی، اپنی کسی چیز کو چھونے بھی نہیں دیتا تھا اور اس کی ہر چیز بنا اجازت استعمال کر لیتا اور اگر باز پرس کی جاتی تو بدتمیزی پر اتر آتا۔ شروع سے دونوں بھائیوں میں یہی لڑائی چلتی آ رہی تھی۔ ثریا خاتون بھی اس نالائق کو سمجھا سمجھا کر اور اسے صفائیاں دے دے کر تھک چکی تھیں اور رہی کل کی بات تو اب وہ عمر کے اس حصے میں تھیں۔ جہاں ایک منٹ پہلے کی بات بھول جاتی ہے۔

انہیں بھی بالکل یاد نہیں رہا تھا کہ ان کا تارا جس شرٹ میں اتراتا سنور کر جا رہا ہے۔ وہ شرٹ اس کی نہیں ہے بلکہ ان کے چاند کی ہے۔ جس نے دھلی ہوئی شرٹ کو دوبارہ اس لیے دھلوایا تھا کہ اسے انٹرویو کے لیے پہن کر جانا تھا اور وہ اب ایک دوسری شرٹ جو کہ کثرت دھلائی سے اپنا اصل رنگ گنوا چکی تھی، کو الٹے سیدھے ہاتھ مار کر یوں استری کر رہا تھا کہ جیسے اس کی رنگت واپس لا کر ہی چھوڑے گا۔ وہ سر جھٹک کر کچن کی جانب ہو لیں۔ ان کے ہاتھوں تارے کی آج پھر شامت آئی تھی۔ یہ تو طے تھا۔

☆☆☆

ایک کمرہ، ایک بیڈ، دیوار گیر الماری، دیوان اور ایک ٹیبل کرسی، عمر حبیب کے خوبصورت کاٹیج میں یہ تھی اس کی کل "جنت" اور یہ جنت اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھی۔ جب سے وہ اس دیس میں آیا تھا۔ بھول ہی گیا تھا کہ چین کی نیند کسے کہتے ہیں۔ مگر اس رات ہر فکر بھلا کر بہت عرصے بعد وہ خوب سویا تھا۔ ایک تسلسل کے ساتھ۔ کسی کی بک بک نہیں تھی۔ نہ کسی کے بے ہنگم خراٹے۔ اسی لیے تو صبح جب روم سے باہر آیا تو بہت فریش لگ رہا تھا۔

بلو پینٹ کوٹ کے ساتھ میچنگ ٹائی لگائے

بکھرے دلکش چہرے پر اک دلفریب سی مسکان لیے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے ماتھے پر گرے بال سنوارتا جب وہ ڈائننگ ٹیبل تک آیا تو عمر حبیب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھتے بے اختیار "ماشاءاللہ" کہا تھا۔ وہ سلام کرتا ان کے برابر والی کرسی پر ٹک گیا۔

"جیتے رہو۔ جینی بیٹا، ضومیر کے لیے بھی ناشتا لے آؤ۔" اس کا شانہ تھپکتے انہوں نے بیٹی کو آواز دی تھی۔ جس نے پلٹ کر اس کی سجائی "صورت" کو نخوت سے دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے پر کھنچ جانے والی لکیر کو ضومیر نے پورے دھیان سے دیکھا۔ ابھی کل ہی تو اس نے محترم ضومیر ہاشمی کو اچھے سے بریف کیا تھا۔ کہ اسے "عمر کاٹیج" میں کس طرح سے رہنا ہے۔

سب سے پہلے تو وہ اس گمان سے باہر ہی رہے کہ "جنت عمر" اس کی بیوی ہے اور جب وہ اس کی بیوی نہیں ہے تو وہ اس کے کسی بھی کام کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔ وہ صبح اٹھ کر پہلے اپنا کمرہ صاف کرے گا۔ کیونکہ گھر میں پھیلاوا اسے قطعاً پسند نہیں۔ اپنا ناشتا بھی وہ خود بنائے گا اور ساتھ ہی کچن کی صفائی اور شام واپسی پر بھی اسی طرح سارے کام۔ حتیٰ کہ ہفتہ وار اپنے کپڑوں کی دھلائی بھی اسے خود کرنا ہوگی۔ (اور یہ سارے کام تو وہ پچھلے تین سالوں سے کر رہا تھا۔ یہ سب کرنا اس کے لیے قطعاً مشکل نہ تھا۔ اگر مشکل ہوگی تو صرف) اور اس نے آگے کچھ سوچنے ہی کب دیا تھا۔

وہ کہہ رہی تھی کہ اگر بالفرض کبھی عمر حبیب اس کے کسی کام کے لیے جینی کو آواز دیں تو وہ اس کے کچھ کہنے سے پہلے خود ہی انہیں سمجھا دے اور اس پل وہ یقیناً اس کے بولنے کی منتظر ہوگی اور یہ تو اسے علم ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا بھی تابع دار نہیں ہے اور پھر انسان اکثر باتیں بھول بھی تو جاتا ہے۔ اب وہ ان سے گپ شپ لگانا چھوڑ کر اپنا ناشتا بنانے اٹھ جاتا تو کتنی بری بات ہوتی۔

وہ مزے سے ڈیڈ سے۔ ہاں جی "ڈیڈ" سے محو گفتگو رہا۔ بیٹی نے تو رشتہ بنا کر بھی نہیں بنایا تھا۔ مگر انہوں نے اسے "بیٹا" بنایا ہی نہیں تھا بلکہ داماد بھی لیا تھا اور وہ ان کی محبتوں کے ہاتھوں ہار گیا تھا کہ کم از کم اس کی وجہ سے ان کا دل نہ دکھے۔ کچن کاؤنٹر کے پاس کھڑی ایک اور انڈا [illegible] عمر کا جو دل دکھا تھا وہ؟ خیر دکھتا رہے۔ اس [illegible] سے۔ وہ اس کے "دل" کا ذمہ دار نہیں تھا۔

وہ ناشتا بنا کر لے آئی تھی۔ مگر جس انداز سے رکھی اور جس نظر سے اسے نوازا، وہ بے [illegible] گردن کھجا کر رہ گیا۔ مگر ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ "شکریہ" کہنا ہرگز نہیں بھولا تھا۔ وہ بھی [illegible] گئی تھی۔

"ارے میرے بچے! اب ساتھ ہی کاؤنٹر صفائی کرنے مت لگ جانا۔ آ جاؤ پہلے ناشتا کر لو۔" وہ بیٹی کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ اسے [illegible] قدم اٹھانے سے روکا۔

"سوری ڈیڈ۔ آئی ایم گیٹنگ لیٹ۔ مجھے یونی پہنچنا ہے۔ ہرکولیس آتا ہی ہوگا۔" وہ [illegible] اپنے کمرے میں جا چکی تھی اور کچھ منٹ بعد واپس ہوئی تو اونچی پونی میں بندھے سنہری بال اب کھل کر شانوں پر لہرا رہے تھے۔ دلکش چہرے کی ضیا ہلکی سی لپ اسٹک نے ہی بڑھا دی تھی۔ بلیک ٹائٹس کے ساتھ پنک ٹاپ پہنے ایک ہاتھ میں نوٹ بک تھامے دوسرے کندھے پر بیگ ڈال رہی تھی۔

"آرام سے ناشتا کرو ادھر آ کر اور اب ہری کی ضرورت نہیں ہے۔ ضومیر جو ہے۔ جہاں اس نے تمہاری باقی ذمہ داریاں اٹھائی ہیں، وہاں پک اینڈ ڈراپ بھی اب اسی کے ذمے ہے۔ لو ضومیر بیٹا۔" انہوں نے گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھائی "آج سے میری یہ فکر بھی دور ہوئی۔ اب تم جانو اور تمہاری بیوی۔ ہاں بس یہ دھیان رکھنا کہ میری بیٹی مجھ سے کسی بھی طرح کی شکایت نہ کرے۔"

وہ مسکرا رہے تھے۔ ضومیر بھی مسکرا دیا۔

"آپ اس بات کی فکر مت کریں۔ آپ کی بیٹی بالکل بھی شکایت نہیں کرے گی ڈیڈ۔ کیونکہ میں

اسے کبھی موقع ہی نہیں دوں گا۔ کیوں جنت ٹھیک ہے؟"

وہ اس سے تائید چاہ رہا تھا اور اتنی اجازت تو آج تک اس نے ہری کو بھی نہیں دی تھی کہ اسے اس کے اصلی نام سے پکارے۔ اس نام سے تو بس ڈیڈ ہی پکارتے تھے اور اب ان موصوف نے [illegible] وقت کر ڈالی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو ہاتھ میں تھامی ساری کتابیں اس کے سر پر دے مارتی مگر اس وقت صرف ایک شعلہ بار نظر پر ہی گزارا کرتے اس نے کہا۔

"اوہ ڈیڈ۔ اتنا عرصہ ہو گیا ہے اسے مجھے پک اینڈ ڈراپ دیتے اب ایک دم سے منع کروں گی تو وہ مائنڈ کرے گا اور پھر ضومیر کو ریسٹورنٹ پہنچنا ہے۔ مجھے یونی تک ڈراپ کرتے پھر واپس آتے بہت وقت ضائع ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں ضومیر ریسٹورنٹ ٹائم سے پہنچ جائے گا۔ ایک دو منٹ اوپر نیچے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور ہری کچھ بھی مائنڈ نہیں کرے گا۔ وہ جانتا ہے تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ ضومیر تمہارا ہزبینڈ ہے اور اب تم اس کے ساتھ جانا۔"

"اف ڈیڈ! آپ پہلے تو ایسی باتیں نہیں کرتے تھے۔" وہ زچ ہوتی صرف یہی کہہ سکی۔

"پہلے کبھی ایسی باتوں کی ضرورت جو نہیں پڑی میری جان اور کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اتنے آرگیومنٹ کیوں کر رہی ہو؟"

وہ حقیقتاً حیران ہو رہے تھے۔ وہ ان سے بحث کر رہی تھی وہ بھی ضومیر کے سامنے اور کس بات پر اور شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا اس لیے تو پھر چپ چاپ چل پڑی تھی۔ وہ اس کے پیچھے ہو لیا۔ عمر حبیب دونوں کو نثار ہوتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"ماشاءاللہ۔ ماشاءاللہ۔ اللہ نظر بد سے بچائے بہت پیارے لگ رہے ہو تم دونوں۔ چاند سورج کی جوڑی ہے میرے بچوں کی۔ اللہ نصیب اچھے کرے۔ سدا خوش و آباد رہو۔ مجھے رات ہی کبیر نے ساری تصویریں سینڈ کی ہیں اور ہم سب ہی مارے خوشی کے رات بھر جاگتے رہے۔ ساری رات تم لوگوں کی باتیں کرتے ہی گزر گئی۔ آج میں نے پوری پچاس کلو مٹھائی منگوائی ہے اور سارے محلے اور رشتے داروں میں بانٹی ہے۔ اللہ نے ایسی ہیرا سی بہو دی ہے مجھے۔ جو بھی دیکھے گا بس دیکھتا ہی رہ جائے گا۔

ارے رشتے داروں نے تو دانتوں میں انگلیاں داب لی ہیں قسم سے۔ کسی کی بہو ایسی خوب صورت جو نہیں۔ سچ پوچھو تو ضومیر بیٹا آج میں اتنی خوش ہوں نا کہ تمہیں بتا نہیں سکتی۔"

محبت اپنی ہی رو میں بولے چلی جا رہی تھیں۔ بہت عرصے بعد آج وہ حقیقتاً دل سے خوشی محسوس کر رہی تھیں۔

بہت ساری کٹھنائیوں کے بعد انہیں لگ رہا تھا کہ اب زندگی قدرے آسان ہوگی۔ شوہر کی اچانک موت کے بعد حالات کے ایک دم پلٹا کھانے سے وہ تو عرش سے فرش پر ہی آ پڑی تھیں۔ دوستی کے لبادے میں چھپے دشمن نے ایسی گھات لگائی تھی کہ وہ ششدر رہ گئی تھیں۔ ان کا سارا مال اسباب صرف ایک کاغذ کے ٹکڑے کے بل بوتے پر ان سے چھین لیا گیا تھا اور وہ چوٹ اتنی گہری تھی کہ پور پور زخمی ہو گئی تھی۔

بیوگی چار بچوں کی یتیمی اور اس پر سب چھوٹ جانے کا وار ایسا کاری تھا کہ انہیں لگتا تھا وہ اس دکھ سے مر ہی جائیں گی۔ مگر بے شک اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس کڑے وقت میں بھی ان کا آسرا پیدا کر دیا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی کبیر ہاشمی کو اللہ نے اس وقت فرشتہ بنا کر بھیجا۔ جس نے جوڑ توڑ کر کے کسی نہ کسی طرح ضومیر کو اپنے پاس انگلینڈ بلا لیا۔ یوں کچھ جینے کے اسباب نظر آنے لگے۔ زندگی کی گاڑی سبک خرامی سے کھنچنے لگی۔

چھوٹی موٹی نوکریاں کر کے ضومیر ان سب کی ضروریات کو پورا کر رہا تھا۔ مگر ابھی بہت سی ضرورتیں ایسی تھیں جو پس پشت پڑی تھیں اور جن کا پورا ہونا بھی بے حد ضروری تھا۔ وہ دن رات اللہ کے آگے دعا گو رہتی تھیں اور جس نے یقیناً ان کی دعائیں سن لی تھیں۔ ان کی خوشی بے کنار تھی۔

"اب تو تمہیں وہاں کی نیشنلٹی آسانی سے مل جائے گی نا ضومیر بیٹا؟ اور پھر اچھی جاب بھی اور پھر تم ہمارے پاس بھی آسکو گے نا۔" ان کے لہجے میں امیدیں بھری تھیں۔ ایک گہری سانس لیتے وہ گویا ہوا۔

"جی امی! ان شاء اللہ۔ آپ دعاؤں میں یاد رکھیں بس۔"

"ارے میرے بچے! دل سے ہر سانس کے ساتھ دعا نکلتی ہے تمہارے لیے۔ وہ تو تم فکر ہی نہ کرو۔ اچھا یہ بتاؤ بہو کو سارے کام تو آتے ہیں ناں۔ سنا ہے کہ باہر رہنے والے لوگ سارے کام۔"

"اوہو امی! بھلا یہ بھی کوئی بات ہے پوچھنے والی۔ اگر بھابھی کو کام کرنا نہیں بھی آتے ہوئے تو بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ وہاں بے شمار مشینیں بھی ہوتی ہیں کام کرنے کے لیے اور مزے کی بات وہاں آپ جیسی بہو میں صرف کام کا ہنر ڈھونڈنے والی ساسیں بھی نہیں ہوتیں اور اب۔ کوئی دو چار باتیں ہمیں بھی اپنے بھائی سے کر لینے دیا کریں۔"

ماں کے پیچھے سے ملیحہ نے سر نکالا تھا۔ وہ اس کی بات پر بے اختیار مسکرا دیا۔ نگہت نے بھی ہنستے ہوئے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"اوہ! کر لو تم لوگ بھائی سے باتیں۔ شبینہ اور معیز آجاؤ تم بھی۔" ان کے کہتے ہی وہ دونوں بھی آگے کھسک آئے تھے۔

"اللہ بھائی۔ کتنی پیاری ہے نا بھابھی اور دلہن بن کر تو کتنا روپ آیا ہے ان پہ۔ میرا تو تصویریں دیکھ دیکھ کر دل ہی نہیں بھر رہا۔ اب کل ڈھیر ساری مٹھائی لے کر جاؤں گی کالج اور اپنی سب سہیلیوں پر خوب دھاک جماؤں گی۔ بھلا کسی کی بھابھی ہوگی ایسی صورت۔"

ملیحہ جگمگاتے چہرے کے ساتھ اسے اپنا ... رہی تھی۔ پھر شبینہ اور معیز بھی شروع ہو گئے ... کی کوئی بات پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ مسکرا ... سے انہیں سن کم اور دیکھ زیادہ رہا تھا۔

☆☆☆

ریسٹورنٹ سے نکلنے میں اسے دیر ہو گئی ... اس پر ستم یہ کہ مزید چند منٹ ٹریفک کے اژدہام ... نکل لیے۔ اللہ اللہ کر کے وہ یونی تک پہنچا ... کہیں وہ نخریلی محترمہ انتظار سے اکتا کر خود ... پڑی ہوں۔ مگر تھوڑی سی تلاش کے بعد ہی اسے ... اور ہری ایک ساتھ ایک بینچ پر بیٹھے نظر آ گئے ... کے آگے ایک کتاب کھلی تھی۔ جس پر جھکے ... رہے تھے۔ جنتی کے سنہری بال ہری کے چہرے ... آگے جھول رہے تھے۔ جنہیں اس نے بڑی احتیاط ... سے پکڑ کر اس کے کان کے پیچھے اڑس دیا۔ جنتی ... مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ ہری نے بھی مسکراہٹ ... کی اور پھر دونوں کتاب پر جھک گئے۔

لمحے بھر کی بات تھی۔ مگر جانے اسے کیوں لگا ... جیسے یہ منظر زمانوں پر پھیل گیا ہے۔ اک بگولا سا ... جس نے سر سے لے کے پیر تک چکر کاٹا۔ اندر کو ... انگیٹھی سی جلی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ گرم ہوتا محسوس کیا۔ تن فن کرتا وہ ان کے عین سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہری کی گردن اٹھی تھی۔

"اے لو جی آگئے تمہارے شوفر صاحب۔"

اسے دیکھتے ہی اس نے جس لہجے میں کہا تھا۔ ضومیر کو تو اور آگ لگ گئی۔ مگر اس کے منہ لگنے ... جنتی ... دیکھا۔

"اگر آپ کی بہت ضروری پڑھائی ختم ہو گئی ہو تو چلیں؟" اس نے سر اٹھایا۔ اس کے تیور نا قابل ... تھے۔ گندمی رنگ حد درجے سرخ ہو چلا تھا۔ ... نقوش قدرے بگڑے ہوئے سے تھے۔ آنکھوں میں خشونت بھرے وہ ان دونوں کو گھور رہا تھا اور یہ حالت ... کیوں؟ بلکہ یہ انداز تو اسی وقت اس کا ہوتا ... پھر بھی اس نے بڑے تحمل کا مظاہرہ کرتے ... کلائی پہ بندھی گھڑی اپنے سامنے کی۔ پھر اس کے ...

"اسے واچ کہتے ہیں اور یہ صرف فیشن کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال بھی کیا جاتا ہے اور ... کیا جاتا ہے؟ کیا جانتے ہیں آپ۔"

"اوہ۔ چھڈو جی۔ یہ کیا جانے بھلا واچ وا استعمال۔ اساں دے نزدیک تے واچ دا مطلب صرف ویکھنا ای ہوئے گا اور اس وقت ہمیں خوب ... نے ویکھی ای تو رہے ہیں۔" اک نہایت فضول سا ... کر کے پھر اس پر خود ہی قہقہہ لگاتے ہری اسے زہر لگا تھا اور اب کی بار تو وہ کسی طور بھی خود پر قابو نہ پا سکا تو تلملا کر کہا۔

"... مسٹر منوہر ... سدھو۔ کچھ دیر کے لیے آپ اپنا ... اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ میں جنت سے بات کر رہا ... جی میم تو چلیں اب۔"

ہری بے چارے کا تو منہ کیا بند ہوتا وہ تو کھلے کا کھلا ہی رہ گیا تھا مارے خفت کے۔ جنتی کے لب بھی بمشکل وا ہو گئے تھے۔ وہ اکڑفوں تو اسے چلنے کا کہہ کر اس کی کچھ سننے سے پہلے ہی واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔ اس نے ہری کے چہرے کی جانب دیکھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ لپک جھپک کتابیں سمیٹ کر بیگ شانے پر ڈالتی اس کے پیچھے آئی تھی۔

"ہاؤ ڈیئر یو۔ تم نے کیا سوچ کر ہری کے ساتھ ایسی بدتمیزی کی۔ وہ فرینڈ ہے میرا۔ جانتے ہو نا۔ تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟ میں نے تمہاری منت نہیں کی تھی کہ تم روز میرے لیے اپنے کام چھوڑ کر آؤ۔ یہ ڈیوٹی تمہارے باپ نے تمہیں سونپی ہے۔ تم چاہو تو ... سے ایکسکیوز بھی کر سکتے ہو اور اگر تم میں اتنی جرات نہیں ہے تو میں خود ڈیڈی کو منع کر دوں گی اور آج کے بعد مجھے یہ اپنی ایٹیٹیوڈ مت دکھانا۔ انڈر اسٹینڈ۔"

وہ غضب میں بولتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس نے اطمینان سے کار کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ وہ پھر سے شروع ہوئی تھی۔

"اور میں نے تمہیں اس روز بھی منع کیا تھا کہ مجھے بالکل نہیں پسند کہ کوئی ایکس وائی زیڈ مجھے جنت کہے۔ تمہیں ایک بار کی بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔"

ابھی اندر جس الاؤ پر ہری کے چہرے پر چھائے تاثرات نے اک کمینی سی ٹھنڈک اتار دی تھی۔ اس پر اس بے پرواہ کے "ایکس وائی زیڈ" نے تو گویا تیل ہی چھڑک ڈالا۔ ایک سلگتی نگاہ اس پر ڈال کر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ کچھ اور بھی کہتی جا رہی تھی۔ مگر وہ سن ہی کب رہا تھا۔ جو سن چکا تھا وہی بہت تھا۔

☆☆☆

آج کی ڈاک سے آنے والے لفافے نے تو گویا اس کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وہ اس قدر خوش تھا کہ حد نہیں۔ اس دن کا کتنی شدت سے انتظار تھا اسے۔ لگ رہا تھا مٹھی میں اک کاغذ کا ٹکڑا نہیں بلکہ پورا جہان سما گیا ہے۔ ایک خواب کی تکمیل سارے خوابوں کا عنوان بن گئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اماں جی کو یہ خوشی کی خبر دی۔ وہ تو سنتے ہی سجدے میں گر گئیں۔ ڈھیروں ڈھیر دعاؤں سے نوازا۔

"جا میرا چاند! اب جلدی سے مٹھائی لے کر اپنے چاچا کے گھر جا۔ اس خوشی کی خبر پر دوسرا حق میری آصفہ کا ہے۔ ابھی پچھلے ہی مہینے ایک وظیفہ بتا کر آئی تھی اسے۔ پنج وقتہ نماز پڑھتی ہے ماشاء اللہ۔ ضرور باقاعدگی سے وظیفہ پڑھا ہو گا اس نے۔ یہ سب اسی کی دعاؤں کا ثمر ہے۔"

کتنی سادہ طبیعت اور فراخ دل تھی اس کی ماں۔ اپنی محنتیں بھی ہونے والی بہو کے کھاتے میں ڈال رہی تھی۔ وہ بے اختیار ہنستے ہوئے ان سے لپٹ گیا۔

"اوہ اماں جی! آپ کی باتیں بھی نا آپ کی طرح ہی خوب صورت ہیں۔ میری یہ خوشی تو صرف آپ کی بدولت ہے۔ آصفہ کی دعاؤں کو تو میں تب مانوں گا جب وہ اس گھر میں آئے گی۔"

"بڑا چالاک ہے۔ دوسرے لفظوں میں تو اب مجھے اپنی شادی کا کہہ رہا ہے۔" اماں جی نے ایک چپت شانے پر دھری۔ وہ جی کھول کر ہنسا۔

"تو کیا اب بھی نہیں کہہ سکتا؟" اس نے جگمگاتی نظریں ماں کے چہرے پر ٹکا دیں۔

"بالکل کہہ سکتے ہو۔ بلکہ اب تمہیں کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ کے کرم سے اب ہاتھ کھلا ہو گیا ہے تو دو ماہ میں ہی تیاری کر کے بہو گھر لے آؤں گی۔ گھر گرہستی کر کر کے اب تو میری ہڈیاں بھی تھک گئی ہیں۔ اب تمہاری گھر والی گھر آئے تو میں بھی کچھ آرام کروں۔"

"ان شاء اللہ۔ ضرور۔ بس کچھ ہی دن کی بات ہے پھر آپ ملکہ بن کر اس تخت پر بیٹھا کیجیے گا اور آپ کا ہر حکم بجا لانے کے لیے یہاں ایک کنیز ہو گی۔" وہ انہیں حسین خواب دکھا رہا تھا۔

"بچے! اپنی بات پر قائم رہنا۔ اب یہ نہ ہو کہ کل کلاں کو تم اس کنیز کے بے دام غلام بن جاؤ۔" وہ اس سے عہد لے رہی تھیں۔

"ارے اماں جی! کیا آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے۔ میں تو اس باپ کا بیٹا ہوں۔ جس نے ساری زندگی اپنی بیوی کی ایک نہیں مانی تھی۔ کبھی خیال نہیں رکھا تھا اس کا۔ ہمیشہ ہر چیز کے لیے ترسا کر رکھا اسے۔ تمام عمر بیوی کا جینا دوبھر کیے رکھا۔ میں بھی ان کے ہی نقش قدم پر چلوں گا۔ آپ کی بہو کو ایسا تیر کی طرح سیدھا رکھوں گا کہ وہ بھی۔"

"ہائیں ہائیں۔ کیوں باپ کی بدخوئی کر رہا ہے بے ادب۔ اللہ درجات بلند کرے۔ وہ تو ایسے سادہ منش آدمی تھے۔ کبھی کوئی سختی نہیں کی تھی مجھ پر۔ ہمیشہ ہر بات میں میری خوشی کا خیال رہتا تھا انہیں۔ ساری زندگی میری صلاح کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھایا تھا انہوں نے اور ترسایا کب مجھے۔ ادھر میرے منہ سے کوئی فرمائش نکلتی تھی۔ ادھر وہ جھٹ پوری کر دیتے تھے۔ جب تک جیے پھولوں کی سیج پر بٹھا کر رکھا مجھے اور تو کہہ رہا ہے کہ......"

انہوں نے اسے کڑے تیور [illegible] ان کی آنکھوں میں مچلتی شرارت [illegible] گئیں۔ جھک کر جوتی اٹھائی۔ چاند [illegible] بچائی۔ وہ ہنس ہنس کر دہرا ہو رہا تھا۔

"ماں کے ساتھ ٹھٹھول کرتا [illegible] ذرا۔" وہ بھی ہنس رہی تھیں اور [illegible] سے ماں بیٹے کے لاڈ دیکھتا [illegible] تھا۔

☆☆☆

چھٹی کے مزے صرف قسمت والے [illegible] لوٹ سکتے ہیں۔ جن کی قسمت میں کام [illegible] لکھا ہو، ان کے لیے ہر دن برابر [illegible] تو ریسٹورنٹ کی جانب گئی۔ [illegible] وہ کچھ گھنٹوں کا آف لے لیتا تھا [illegible] دے دیتے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ وقت وہ [illegible] ساتھ گزارتے ہیں اور ان کی اس خوش [illegible] دونوں نے ہی باہمی اتحاد سے اب تک [illegible] تھا۔

جبکہ یہاں کہانی کچھ یوں ہوتی کہ [illegible] ہفتے بھر کے رکے کام انجام دیتا۔ اب آج [illegible] سب سے پہلے لانڈری کا کام شروع کیا [illegible] تک کپڑے دھل کر باہر آتے، اسے رات [illegible] کارگزاری یاد آ گئی تھی۔ جب کھانے کے [illegible] اٹھا کر اوون میں چھپا دیے تھے۔ تھکاوٹ [illegible] اس وقت برتن دھونے کا قطعاً دل نہ تھا۔ اب [illegible] ہی سرپٹ کچن کی جانب دوڑ لگائی۔ مگر [illegible] چھاپہ مار کا جو اس سے پہلے ہی مال مسروقہ [illegible] کھڑی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے مسٹر ضومیر۔" اس [illegible] کڑے تھے اور لہجہ اس سے بھی سوا۔ وہ [illegible] کھجانے کے اور کچھ نہ کر سکا۔

"ویسے تو آپ نے خود کو دنیا کے سامنے [illegible] رکھا ہے جیسے آپ بہت مجبور ہیں۔ ریسٹورنٹ [illegible] سب نے آپ کو روبوٹ کا نام دے رکھا [illegible]

[illegible] بھی کہتے ہیں۔ مگر اچھے بچی [illegible]

[illegible] اس کے ہاتھ سے برتن لے کر [illegible] سنک میں ڈالتے اس کی بات قطع کی۔

[illegible] مجھے روبوٹ کا نام دینے والے لوگ مجھ سے [illegible] وہ میری خامیوں کے بجائے [illegible] کو سمجھتے ہیں۔ آپ بھی محبت کی نگاہ [illegible] آپ پر آشکار ہو کر......"

"اور میں آپ کو محبت کی نگاہ سے کیوں [illegible] خدانخواستہ۔" جس تیزی سے وہ بولی [illegible] کے ہاتھ ایک پل کو ساکت ہی ہو گئے۔ [illegible] بے نیاز ہوتے ہیں۔ سنا تھا۔ مگر اس [illegible] بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے [illegible] تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے اچھے موڈ میں بات کرتا [illegible] تھی۔ ہر بار ایسا کرارا جواب دیتی [illegible] سامنے آ کر رہ جاتا۔

[illegible] اور تعلق کو جانے دو۔ وہ اس کے ساتھ [illegible] تو رہا تھا۔ اس کے ڈیڈ کا خیال رکھ [illegible] ان کا ریسٹورنٹ سنبھال رہا تھا اور تو اور بلا [illegible] اس کے "شوفر" کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا [illegible] رکھے لے بھی۔ لیکن اس سے تو شاید [illegible] توقع ہی عبث تھی۔

وہ منہ پھیرے برتنوں پر فوم رگڑتا [illegible] اور "مرے پر سو درے" اسی کو کہتے ہیں [illegible] اس کا سیل فون گنگنا اٹھا تھا۔ اس نے [illegible] ہاتھ سے فون کان کو لگایا۔ دوسرے ہاتھ میں [illegible] جوس کا گلاس پکڑے وہ وہیں قریبی کاؤنٹر [illegible] گئی۔

[illegible] دوسری طرف ہری تھا۔ جو اسے آج کا دن [illegible] ساتھ گزارنے کی دعوت دے رہا تھا۔

"اوہ سوری ڈیئر۔ آج تو بالکل بھی فراغت [illegible] بہت کام ہیں مجھے۔ اتنی لمبی لسٹ ہے ناں۔ [illegible] سنانے لگی تو یہیں شام ہو جائے گی۔ تم یہ [illegible] پروگرام نیکسٹ ہولی ڈے پر رکھو۔ تب تارمن اور جولی کو بھی ساتھ لے لیں گے۔"

وہ اس سے کہہ رہی تھی اور وہ یقیناً اس کی ایک بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ تھوڑی تکرار کے بعد اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوکے سویٹ ہارٹ۔ آئی ایم ویٹنگ۔ تم جلدی سے پہنچو۔ میرے ساتھ کام کرواؤ۔ پھر جہاں کہو گے چلوں گی۔" وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب جا چکی تھی اور ضومیر کا شدت سے دل چاہا تھا، سارے دھلے برتنوں کو فرش پر پٹخ دے۔

"مگر کیوں۔" اگر یہی دو لفظ اس نے آ کر پوچھ لیے تو کیا جواب دے گا۔ بس اسی خیال نے روک دیا تھا۔

☆☆☆

ابا نے اچھے وقتوں میں موٹر سائیکل لی تھی۔ کبھی یہ ان کا ہوائی جہاز ہوا کرتی تھی۔ دس سال استعمال کیا تھا انہوں نے اسے اور بڑی محبت کے ساتھ۔ پھر یہ اس کے ہاتھ آ گئی اور تبھی بے چاری کے برے دن شروع ہو گئے۔ اب تو دیکھنے والے آرام سے کھٹارا کہہ دیتے تھے اور اس پل وہ اپنی اسی شاہی سواری کی پشت پر اکڑ کر بیٹھا ہواؤں میں اڑتا جا رہا تھا۔

چار دن پہلے ایک دوست سے پورے ہزار روپے ادھار پکڑ کر تین شرٹس اور ایک پینٹ خریدی تھی اور آج ان ہی شرٹس میں سے سی گرین کلر کی شرٹ کے ساتھ نئی پینٹ پہن کر وہ آفس گیا تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتے ہی اس نے واپسی کی راہ لی تھی اور یہ راہ سیدھی در محبوب تک جا رہی تھی۔ سال خوردہ سا دروازہ تھا۔ جس پر گھنٹی غیر موجود تھی۔ لیکن اندر والوں کے لیے اس کی کھٹارا کی پھٹ پھٹ نے کسی گھنٹی سے کم کا کام نہیں کیا تھا۔ صحن میں شور مچ گیا تھا۔

"چاند بھیا آ گئے۔ چاند بھیا آ گئے۔" منی اور گڈو کا مسرت بھرا اعلان اگلے پچھلے تمام محلے تک تو ضرور ہی سنا گیا ہو گا۔ شام کے لیے دال چنتی اپنے

کسی دھیان میں گم آصف نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ گڈو نے بھاگ کر دروازہ کھولا۔ وہ ہینڈل پر لٹکا لفافہ اتار رہا تھا۔ جو اس سے وہیں جھپٹ لیا گیا۔

"آئے ہائے۔ ندیدو! بھیا کو اندر تو آ لینے دو اور یہ ادھر دو مجھے۔ چلو پہلے اسکول کا کام مکمل کرو پھر کھانے کی چیز۔"

فرحانہ چاچی نے دونوں بچوں کو ایک ایک لگا کر لفافہ لے لیا۔ اس نے انہیں سلام کرتے سامنے ہی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھی مقصودِ نظر کو بچی نگاہ سے دیکھا تھا۔ جو اب جلدی سے اٹھتی دوپٹا درست کرتی کچن کی جانب ہولی تھی۔ فرحانہ چاچی نے خوش دلی سے خیر مقدم کرتے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ وہ اسی چارپائی پر جا بیٹھا تھا۔ منی اور گڈو اچک اچک کر لفافے کے اندر جھانک رہے تھے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو دو روپے کے کڑکتے نوٹ نکال کر ان کو دیے۔

"ارے اس فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے اب۔" چاچی نے فوراً ٹوکا تھا۔ جبکہ ان دونوں کے منہ لٹک گئے تھے۔ صاف گو منی نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

"کیسی فضول خرچی امی۔ نئی نئی نوکری لگی ہے چاند بھیا کی اور دیکھیں کنجوس کتنے ہیں۔ ہمیں صرف دو روپے دے رہے ہیں۔ ایک وہ تارے بھیا ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتے اور جب بھی آتے ہیں۔ پورے پانچ روپے دیتے ہیں ہمیں۔ آج بھی دے کر گئے ہیں۔ یہ دیکھیں۔" آٹھ سالہ معصوم سی منی نے چنری کے پلو میں بندھا پانچ کا نوٹ نکال کر ان کے سامنے لہرا لیا۔ جبکہ چالاک سے گڈو نے اوپری جیب سے نوٹ نکال کر کرتے کی نچلی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں ہمیشہ کی طرح امی آج بھی چھین نہ لیں۔ ادھر منی کی پشت پر ایک کرارا سا دھموکا پڑا تھا۔

"اری کم بخت! یہ آج پھر تم نے بھیا سے پیسے پکڑ لیے۔ میں نے پچھلی بار بھی منع کیا تھا کہ وہ دے بھی تو آئندہ مت لینا۔ ارے وہ کچھ کماتا ہو نہیں۔ بے چاری بھابھی بیگم کی ہی محنت کے روپے ہوتے ہیں اس کی جیب میں۔ وہ جب چکر لگاتا ہے تم لوگوں پر لٹا جاتا ہے۔ کبھی کوئی کھانے کو چیز لے آتا ہے۔ خبردار جو دونوں نے یہ کمینی حرکت کی اور تو ادھر آ..." انہوں نے گڈو کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ چاند نے بازو پھیلا کر دونوں کو قریب کر لیا۔

"ارے کیا ہو گیا چچی جان! مت ماریں انہیں۔ بچے ہیں اور کوئی بات نہیں اگر تارا انہیں دیتا بھی ہے تو۔ ارے یہ تو بڑے خوش قسمت ہیں جن پر وہ کچھ خرچ کر دیتا ہے۔ ورنہ اس کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔"

"پتا ہے۔ اسی لیے تو سمجھاتی ہوں ان نادانوں کو کہ اس سے کچھ مت لیا کریں اور میں نے تو اسے بھی سمجھایا تھا کہ جو پیسے ملتے ہیں ادھر ادھر خرچ کرنے کے بجائے سنبھالے اب۔ کہہ رہا تھا کہ میں نے دوبارہ سے بی اے کے پرچے دینے ہیں پھر امتحان پاس کر کے اچھی سی نوکری ڈھونڈوں گا۔"

"کیا۔ سچ چچی جان۔ کیا تارا نے ایسا کہا؟" اسے تو اپنے کانوں پر یقین نہ ہوا۔ کیا اس نے سچ میں سنا تھا۔ فرحانہ چچی کہہ رہی تھیں۔

"بڑا پریشان رہتی ہیں بھابھی اس کی وجہ سے۔ دو سال ضائع کر دیے اس نے اپنی نادانی میں۔ تب سب نے کتنا سمجھایا تھا۔ پر اس نے اپنی ضد میں کسی کی ایک نہ سنی۔ شکر ہے خدا کا، اب کچھ عقل آئی ہے۔ کتابیں لے کر آیا تھا آصف سے کہہ رہا تھا انگریزی پڑھا دیا کرے اسے۔"

"ارے واہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ نے تو بڑی اچھی خبر دی ہے مجھے۔ ورنہ میں اور اماں جی تو اس کی طرف سے مایوس ہی ہو چلے تھے۔ اب میں جاتے ہی انہیں خوش خبری سناؤں گا کہ ان کا منڈا سدھر گیا ہے۔ شکر ہے اللہ کا۔ کیوں بھئی آصف پھر تیاری کروا دو گی نا تارا کو؟"

وہ اس کے لیے چائے بنا کر لائی تھی۔ ... کے گلابی دوپٹے میں مقید اس کا چہرہ بھی ... رنگ میں رنگ گیا تھا۔ بھاری خم دار پلکوں کو اٹھا کر اس نے دیکھا اور سنجیدگی سے بولی۔

"منع کر دیا ہے میں نے تارا کو۔ ٹیوشن کے بچے ہی اتنا سر کھپاتے ہیں کہ مزید سر کھپائی کی ہمت نہیں ہے۔ پھر مجھے اپنے امتحان کی تیاری بھی تو کرنا ہے۔ وقت ہی نہیں ہے میرے پاس۔"

"ارے ایسے کیسے منع کر دیا تم نے۔ تمہاری باتیں ٹھیک ہیں۔ مگر یہ اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ اب اگر اس کم عقل کو عقل آ ہی رہی ہے تو پلیز تم کوئی بے وقوفی مت کرو۔ وہ خود تمہارے پاس کتابیں لے کر آیا ہے۔ بہت زیادہ نہیں تو بس ایک گھنٹے کا ٹائم دے دو۔ لیکن خدا کے لیے اسے انکار مت کرنا۔ تمہیں پتا ہے نا اس کی عادت کا۔ اور دیکھو اماں بھی تمہیں بہت دعائیں دیں گی اور مجھ سے تم جتنی چاہے ٹیوشن فیس لے لینا۔"

وہ اس کے دلربا سے مکھڑے کو نظروں میں سموئے مسکرایا تھا۔ آصف نے ایک ابرو اچکاتے اسے دیکھا۔

"ہاں، جانتی ہوں۔ آج دفتر میں پہلا دن تھا آپ کا۔ اپنی اماں جی کے کماؤ پوت ہو گئے ہیں۔ ٹیوشن فیس دے سکتے ہیں۔ تو چلیں پھر ٹھیک ہے۔ میری فیس آپ کی پوری سیلری ہو گی۔ بولیں منظور ہے؟"

"ارے باپ رے۔ تم تو بہت مہنگی استانی ہو بھئی۔ ایک گھنٹے کی ٹیوشن کی اتنی زیادہ فیس۔ ارے ابھی تو پورے ایک ماہ بعد مجھے خود اس سیلری کا دیدار نصیب ہو گا۔ جس کی طالب تم ہو رہی ہو۔ دیکھ رہی ہیں چچی جان! اپنی لاڈلی کے نخرے۔ میرے بھائی نے ذرا اہمیت کیا دے دی۔ یہ تو پہاڑی پر ہی چڑھ گئی۔ ارے بابا نیچے اتر آؤ جلدی سے اور کچھ کم کرو۔" چاند کا لہجہ منت بھرا تھا۔

"واہ بھئی، آپ کو تو بہت پیار ہے نا اپنے بھائی سے۔۔۔ تو کیا اس کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔"

اس کے انداز میں وہی روکھا پن اور غیر معمولی سنجیدگی پنہاں تھی۔ جسے دیکھتے چاند کا دل چاہا تھا، بے دھڑک کہہ دے۔

"پیار تو مجھے تم سے بھی بہت ہے اور تم پر میری کمائی تو کیا میرے دل و جان بھی قربان ہیں۔ میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ بس کچھ دن ٹھہر جاؤ پھر بن مانگے ہی سب تمہارے ہاتھ پر رکھ دیا کروں گا۔"

مگر کیا کرتا کہ اس پل بس مسکرا کر کپ ہونٹوں سے جوڑ لیا۔ وہ سر جھکائے چائے کی چسکیاں بھر رہا تھا۔ دوپٹے کا پلو بے چینی سے مروڑتی آصف کسی سوچ میں گم نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

"تم ٹھیک تو ہو نا میرے بچے۔ خوش ہو نا؟"

محبت کا پہلا سوال ہی یہی تھا۔ اس کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ یہ مائیں بھی نا کمال ہستیاں ہوتی ہیں۔ کیسے بن کہے اولاد کے اندر تک کا حال جان لیتی ہیں۔ اس نے ابھی اپنی خوب مسکراتی ہوئی تصویر فارورڈ کی تھی انہیں اور وہ پھر بھی پوچھ رہی تھیں۔

اچھی بھلی زندگی گزار رہا تھا وہ۔ اپنی نیند اور اپنے خواب تھے۔ دن بھی اپنا اور شام بھی اپنی تھی۔ مگر اب حالت یہ تھی کہ کچھ بھی اپنا نہ رہا تھا۔ خوابوں پر کسی اور کا بسیرا تھا تو دن اور رات کے سب پہر بھی اسی نے اپنے پاس گروی رکھ لیے تھے۔ وہ تو خالی ہاتھ اور خالی وجود سا ہو گیا تھا۔

اس جیسی مصیبت بھی کبھی ہو گی کسی نے۔ دریا پورے کا پورا نام لکھا ہو اور وہ اک بوند کو بھی ترسے۔ وہ لاکھ کوشش کرتا تھا صرفِ نظر کرنے کی۔ مگر جب وہ آنکھوں کے سامنے اس رقیبِ روسیاہ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کیے جاتی تو اسے لگتا وہ خود پر سے اختیار کھو دے گا۔ بہت ہی کٹھن ہونے لگے تھے اب تو ایسے لمحات۔ وہ ہمیشہ ہی بہت ٹھنڈے اور نرم مزاج کا رہا تھا۔ مگر اب تو اکثر ہی کسٹمرز کو اس سے شکایت ہونے لگی تھی۔ وہ اب روڈ ہوتا جا رہا تھا۔

"ضومیر۔ میری جان، میرے بچے۔ تم میری آواز سن رہے ہو؟" اس کی خاموشی نے تہمت کو بے قرار کر دیا تھا۔

"جی۔ جی امی! میں سن رہا ہوں۔ آپ بتائیں سب ٹھیک ہے نا۔ معیز کالج تو جا رہا ہے نا باقاعدگی سے۔ بی اور شبی بھی ٹھیک ہیں نا؟"

"سب ٹھیک ہیں۔ بڑا کرم ہے میرے مولا کا۔ معیز اور شبینہ دونوں ہی کالج جا رہے ہیں اور اکیڈمی بھی۔ شکر ہے دل لگا کر پڑھ رہے ہیں دونوں۔ تم نے پچھلی بار جو آئی پیڈ کا لالچ دیا تھا نا انہیں۔ بڑا کام آ رہا ہے وہ اور سنو بیٹا ایک بڑی اچھی خبر ہے میرے پاس۔ ماشاءاللہ اپنی ملیحہ کا رشتہ آیا ہے۔ تم ابھی فون نہ بھی کرتے تو میں خود کرنے والی تھی۔ لگتا ہے میرے دل کی خبر ہو گئی تمہیں۔"

خوشی ان کی آواز سے چھلک رہی تھی۔ وہ اب اسے ملیحہ کے لیے آنے والے رشتے کی تفصیل بتا رہی تھیں۔ پورے انہماک سے سنتے اسے بھی اپنا سب غم بھول گیا۔ وہ ان سے یوں چہک چہک کر باتیں کر رہا تھا۔ جیسے اس سے بڑھ کر اس زمانے میں کوئی بے فکر نہیں اور گلاس وال کے پار سے اسے دیکھتے عمر حبیب اپنا نسخہ کارگر ہونے پر مطمئن سے مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ دن بھی اک عام دن تھا۔ صبح اٹھتے ہی روٹین کا کام شروع ہو گیا تھا۔ "عمر کاٹیج" کے تینوں نفوس حسب معمول اپنی اپنی تیاری میں مگن تھے۔ اس نے کسی سگھڑ بی بی کی طرح پہلے اپنا کمرہ سمیٹا تھا۔ پھر تیار ہو کر کچن کی راہ لی تھی۔ جہاں ٹک ٹک سے تیار محترمہ لیک بھجک ناشتے کی ٹیبل لگا رہی تھیں۔

حلیہ وہی روز کا سا تھا۔ وہی مغربی اور جسے دیکھ کر اسے اب کوفت ہونے لگی تھی۔ صرف ایک بار اسے مشرقی حلیے میں دیکھا تھا اور وہ نقش دل و دماغ پر کچھ ایسا کندہ تھا کہ کسی پل بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوتا۔

دن کے کئی کئی پہر اسے وہ تصویر نظر آتی۔ آنکھیں کھلی ہوں یا بند۔ اس سے کوئی [illegible] تھا۔ وہ جب بھی چاہتا دیدار کر لیتا اور اپنے من پسند رنگوں میں بھی ڈھال لیتا۔ [illegible] محض تصویر نہ رہتی بلکہ اس کی مرضی کے [illegible] بھی ہو جاتی اور یہ اس قدر دل فریب مشغلہ [illegible] شدید تھکان کے وقت اس طرح کی سرگرمی [illegible] کر وہ ساری فکریں بھول جاتا۔

اگر اس نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی [illegible] ہوتی تو کب کا پورے استحقاق سے اس [illegible] اس مغربی پہناوے سے منع کر دیتا اور اسے [illegible] مشرقی لباس میں کتنی حسین لگتی ہے۔ مگر اب [illegible] "آئیں" بھرنے کے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ [illegible] قدموں سے چلتا کچن کاؤنٹر تک آیا تھا۔ اس نے [illegible] اٹھا کر دیکھا مگر وہی روز کی طرح ان دیکھا کیے [illegible] کام میں مشغول رہی۔ اسے ہی ڈھیٹ بن کر کہنا [illegible]

"گڈ مارننگ۔"

"ڈیڈ آ جائیں ناشتا تیار ہے۔" بد اخلاقی [illegible] اس لڑکی پر ختم تھی۔ مجال ہے جو کبھی بھولے سے دل رکھنے کو ہی مسکرا کر دیکھ لے۔ اس کا جلا ہوا مزید کوئلہ ہوا جب وہ ڈیڈ کے "گڈ مارننگ" کے جواب میں ان سے جا لپٹی اور یقینی طور پر اگلا جملہ اسے بھی لگا تھا۔ جب انہوں نے دوسرا بازو بڑھا [illegible] اسے اپنے قریب کر لیا۔ جینی نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی پچی روح پر تو جیسے ٹھنڈی پھوار پڑی تھی۔ وہ ان کے بازو سے نکل گئی۔

"ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے ڈیڈ۔ آ جائیں اب۔"

اس کی دودھیا رنگت میں سرخی گھل گئی تھی اور یہ لالی ہرگز وہ نہ تھی جسے عموماً حیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی صورت کو بغور دیکھتے ضومیر کے اندر سے اک "آہ" نکلی تھی۔

"بھئی واہ۔ ناشتا تو بہت زبردست بنایا ہے میری بیٹی نے۔ صبح صبح دل خوش کر دیا۔" پہلا نوالہ منہ میں رکھتے ہی عمر حبیب نے نثار ہوتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"[illegible] یو ڈیڈ۔" وہ مسکرائی تھی۔ وہ سر [illegible] درمیان سے اپنے ناشتے سے انصاف [illegible] اور عمر حبیب کہہ رہے تھے۔

"اس مزیدار ناشتے کے بعد میرا دل چاہ رہا [illegible] بیٹا کہ میں تمہیں انعام دوں۔ بولو کیا [illegible] دوں۔" وہ گال پر انگلی رکھے کچھ سوچ [illegible]

"او جینی! تم نے تو سوچنے میں ہی اتنا وقت [illegible] بہتر ہے میں اپنے بیٹے سے مشورہ کرتا [illegible] ہاں تو ضومیر بیٹا! آپ بتاؤ کیا گفٹ ہونا [illegible]" وہ اس سے مخاطب تھے۔ اس نے سر [illegible]

"سوری ڈیڈ یہ آپ کا اور آپ کی بیٹی کا معاملہ [illegible] آپ جانیں اور وہ۔" وہ مسکرا کر کہتا پھر سے [illegible] پر جھک گیا۔

"ارے بھئی، یہ کیا بات کی۔ تم کیا ہم دونوں سے الگ ہو۔ اب یہ معاملہ ہم دونوں کا نہیں بلکہ ہم تینوں کا ہے۔ ویسے اگر تم مشورہ نہیں دینا چاہتے تو اور لفظوں میں اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ تم شوہروں کی اس قسم میں سے ہو جو بیوی پر اپنی مرضی لاگو نہیں کرتے بلکہ ہر جگہ اس کی رائے کو اہمیت دیتے ہیں۔ گڈ ویری گڈ۔" انہوں نے اس کے انداز پر گویا اسے کیا کمال کا نقطہ نکالا تھا۔ اسے [illegible] لگ رہی تھی ان کی آنکھوں میں اور جو اس کے چہرے پر بھی روشنی بن کر بکھر گیا۔ جبکہ جینی لگتا تھا کہ غصے سے منہ میں کونین ڈال کر بیٹھی ہے۔

"میں کچھ دنوں سے سوچ رہا تھا کہ [illegible] گئی ہے۔ ایک کو کام سے فرصت نہیں اور ایک کو اسٹڈیز سے۔ اتنی ٹف روٹین نے تم دونوں کے مزاج بھی ویسے ہی کر دیے ہیں۔ میں نے کبھی تم دونوں کو ایک دوسرے سے ہنس کر بات تک کرتے نہیں دیکھا۔ اسی لیے میں نے تم دونوں کے لیے ایک سرپرائز ٹرپ ارینج کیا ہے۔ ناشتے کے بعد تم لوگ جا کر پیکنگ کرو اور شام کی فلائٹ ہے۔"

"مگر ڈیڈ! آپ اچانک سے ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔ آپ کو پتا ہے میری اسٹڈیز۔" ضومیر کو تو ان کی بات نے حیرت کا ایک جھٹکا لگایا تھا۔ لیکن اسے تو جیسے کئی والٹ کا کرنٹ۔ وہ ان کی پوری بات سنے بنا ہی تڑپ کر بولی۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مزید کچھ کہنے سے روکا۔

"مائے پریٹی ڈاٹر، آئی نو کہ آپ کی اسٹڈیز کا حرج ہو گا اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ ضومیر کی ریسٹورنٹ سے ایک گھنٹے کی غیر حاضری مجھے بوکھلا کر رکھ دیتی ہے لیکن ان سب باتوں سے زیادہ میرے بچوں کی خوشی اہم ہے۔ ابھی میں ریسٹورنٹ جا رہا ہوں۔ دونوں فٹافٹ اپنی تیاری مکمل کر لو۔ او کے مائے سویٹ چائلڈ۔" وہ شفقت سے اس کا سر تھپتھپا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ بت بنی سامنے پڑی پلیٹ کو گھور رہی تھی اور ضومیر نے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

ڈیڈ کی جانب سے دیے جانے والے اس سرپرائز پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو عجب سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ مزے سے چائے کی چسکیاں لیتا وہ اس کے جھکے چہرے پر نظر جمائے ہوئے تھا۔

عمر حبیب باہر کی جانب بڑھے تھے اور دروازہ کھولتے ہی جیسے پتھر کے ہو گئے۔ دستک کے لیے ہاتھ اٹھائے وہ ادھیڑ عمر عورت بھی اپنی جگہ جم سی گئی تھی۔ ابھی تو اس نے دستک بھی نہیں دی تھی اور وہ یوں کھل گیا تھا کہ جیسے برسوں سے اس کے انتظار میں ہو۔

کیا یہ ایک اچھا شگون تھا؟ وہ تو بہت ڈرتے ڈرتے یہاں تک آئی تھی۔ جانے کیسا رویہ سہنا پڑے۔ مگر پہلے ہی قدم پر دکھائی دے جانے والا چہرہ۔ جسے وہ یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ زرد رنگ کی ٹیکسی میں اس کا رنگ بھی زرد لگ رہا تھا۔ وہ جہاز

جھنکار بال چہرے کی جھریاں اور آنکھوں سے چھلکتا حزن طویل مسافت کی داستان بیان کر رہا تھا۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح اس کا ہاتھ نیچے گرا تھا۔

"تت...... تم......" عمر حبیب کے لب نیم وا ہوئے۔ عورت کی آنکھیں یک دم چمکیں۔ گلابی لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں سے یقیناً مسکرانے کی کوشش کی گئی تھی۔

"ہاں میں۔ عومر (عمر) حبیب۔ کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے؟"

یہ آواز کئی برسوں بعد سنائی دی اس آواز نے جینی کو ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ مگر بائیں طرف کھڑی اس عورت کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور جو اس کے لیے ہرگز بھی انجان نہ تھا۔ مگر جس سے اسے اتنی ہی نفرت تھی جتنا کبھی محبت ہوا کرتی تھی۔ وہ تڑپ کر آگے آئی تھی۔

"یو...... یو......" مارے غصے کے اس سے اور کوئی لفظ ادا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ زبان ہی ساتھ چھوڑ گئی ہو جیسے۔

"جینی۔" اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ یوں پکار اٹھی ... صدیوں کا پیاسا پانی کو دیکھ کر لپکتا ہے اور اس کی ...وں سے شعلے سے لپکے تھے۔

"ہاؤ ڈیئر یو۔ تم ہوتی کون ہو میرا نام لینے ... کچھ نہیں لگتی میں تمہاری۔ ہمارا سب سکون چھین لے گئی تھیں۔ اب کیا لینے آئی ہو یہاں۔ چلی ... یہاں سے۔" وہ یک دم ہی چلانے لگی تھی۔ ... پریشان اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس عورت نے کرب سے آنکھیں میچ کر ... یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ یقیناً اس سے زیادہ ...دار تھی۔ اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر اس نے ... کو دیکھا۔

"تقدیر نے بہت کچھ دیا تھا مجھے۔ مگر میں ہی ... سنبھال ہی نہ سکی۔ سب اپنے ہاتھوں اجاڑ ... دنیا کے پیچھے بھاگی، وہ بھی میرے پاس نہ رہی۔ اب اس تار تار دامن میں کیا آئے ... لینے نہیں آئی یہاں۔ میرے پاس ایک ... تمہاری عومر حبیب۔ جسے میں نے ہمیشہ ... کر رکھا۔ مگر اب جس کا بار اٹھانا میرے ... رہا تھا۔ بس وہی لوٹانے آئی ہوں۔" ... کہتے اس نے ذرا سا رخ پھیرا تھا اور اس کے ... نظر آیا، اسے دیکھ کر وہ تو ساکت ہوتے ہی ... جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔

☆☆☆

چاند شام کو تھکا ہارا گھر آیا تھا۔ دروازہ ... ملا۔ صحن میں بندھی تاروں پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کپڑے ہی کپڑے لٹک رہے تھے۔ وہ اپنی ہی دھن میں گنگناتے ہوئے سائیکل کھڑی کرتا اندر کی جانب آیا تو دالان میں بچھے تخت پر ثریا خاتون کو بے وقت لیٹے دیکھ کر چونک کر پوچھنے لگا۔

"مغرب ہونے والی ہے اماں جی! آج بے وقت کیوں لیٹی ہیں۔ خیر تو ہے نا؟" اس کی آواز سن کر انہوں نے منہ پر ڈالا دوپٹہ ہٹایا۔

"آ گیا میرا چاند۔" چاند نے دیکھا ان کا چہرہ تپ کر سرخ ہو رہا تھا۔ لہجے سے نقاہت ٹپک رہی تھی۔

"کیا بات ہے اماں جی! طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے بڑھ کر ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور لگا جیسے کوئی انگارہ چھو لیا ہو۔ انہیں بہت تیز بخار تھا۔

"آپ نے یہ سارے کپڑے کیوں دھوئے۔ جبکہ میں نے ابھی دو دن پہلے آپ کو منع کیا تھا کہ بس تھوڑا صبر کر لیں، اس ماہ تنخواہ ملتے ہی میں واشنگ مشین لے آؤں گا۔ لیکن نہیں رہا گیا نا آپ سے۔ کر لی نا اپنی مرضی۔ میری کوئی بات آپ مانتی ہی کب ہیں۔" وہ یک لخت چراغ پا ہوا تھا۔ ان کے سوکھے لبوں پر ہلکی سی مسکان چمکی۔

"میں نے بھلا کب کوئی بات ٹالی ہے تیری؟ آصفہ کے لیے تو نے خود کہا تھا مجھ سے اور میں نے

... لیا تھا۔ اسی شام جا کر تیرے نام کا ... کر آئی تھی۔"

"... ہاں جی واہ۔" وہ تو ان کی بات پر اش ... بے اختیار داد دینے کو دونوں ہاتھوں سے ...

"کیا خوب مثال نکالی ہے آپ نے۔ بہت ... اس نوازش کے لیے۔ میں تو تمام عمر ممنون رہوں گا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اسی ... میری ہر بات مان لیا کریں۔ کیا ہو جاتا اگر ... ہو جاتے۔"

"... تو پھر کیا کرتی۔ تارے کا کوئی ایک ... جوڑا نہیں بچا تھا پہننے کے لیے۔ دو دن سے ... رہا تھا اور آج تو اس نے اتنا شور ڈالا کہ محلے ... آ کر پوچھنے لگے کہ کیا ہوا ہے۔ بس پھر میں ..."

"تو کیا آپ کے اس شہزادے کے اپنے ہاتھ ... ٹوٹے ہوئے تھے۔ خود دھو لیتا نا۔ اگر ایسی ہی کوئی ... پڑی تھی تو۔ غضب خدا کا، جانے کب عقل ... آپ کو چاہیے تھا ایسی بدتمیزی پر رکھ کے دو ... لگاتیں اسے۔ اب پتا نہیں بھلا کیا سوچتے ہوں گے محلے والے بھی۔"

"میں نے محلے والوں کی کسی لڑکی کا رشتہ نہیں ... لیا۔ جو کوئی سوچتا ہے سوچتا رہے۔ میری جوتی کو بھی پروا نہیں اور میں نے کیا بدتمیزی کر لی بھئی۔ ... ساری حیاتی میں ایک ہی بیاہ کیا تھا۔ ... ایک اکلوتی ماں ہے میری اور اسی نے کرنے ہیں سارے کام۔ اپنے یہ سیدھے الٹے مشورے اپنے پاس رکھا کرو اور ... ہاتھ میرے سلامت ہیں۔ یہ دیکھو۔" تارا باہر سے آ رہا تھا۔ چاند کی آواز سن کر ادھر ہی آ گیا۔ اس کا انداز وہی ہمیشہ کی طرح منہ پھٹ اور بے دھڑک تھا۔ پوری ڈھٹائی سے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ دکھائے۔

"ہاں تو کیا کروں ان ہاتھوں کا۔ چوم کر آنکھوں سے لگاؤں؟ یا کاٹ کر کسی میوزیم میں رکھوا دوں؟ یہ ہاتھ صرف دکھانے کے لیے نہیں ہوتے بھائی میرے۔ ان سے کام بھی لیا جاتا ہے۔"

"فارغ نہیں ہوتا سارا دن۔" گردن کھجاتے لاپروائی سے کہتا وہ تخت کے کنارے بیٹھ گیا۔

"اچھا جی۔ ماشاءاللہ۔ سارا دن کون سے ہل جوتتے ہیں آپ۔ ذرا مجھے ... بتانا پسند فرمائیں گے جناب۔" چاند کا لہجہ تمسخر اڑاتا ہوا تھا۔

"میں نے دو جوڑے کیا دھلوا لیے، آپ نے تو سارا شہر میرے پیچھے لگا دیا۔ خود کام نہیں کر سکتیں میرے تو پھر کام کرنے والی لے آئیں آپ۔"

"ارے میرے بچے! تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ میں تو خود یہی چاہتی ہوں۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب وہ دم خم نہیں رہا۔ ذرا سا کام کرتی ہوں تو سانس پھولنے لگتی ہے۔ جوڑ الگ درد کرتے ہیں۔ میں کل ہی جاتی ہوں فرحانہ اور تمہارے چچا کے پاس۔"

"کیا کرنے جائیں گی آپ وہاں؟" اس نے پوچھا تھا۔ وہ ہنس پڑیں۔

"لے لو پوچھ رہا ہے کیا کرنے جائیں گی۔ ارے اپنے چاند اور ان کی آصفہ کے بیاہ کی تاریخ پکی کرنے جاؤں گی اور کس لیے مجھے جانا ہے وہاں۔"

تارے نے ایک نظر ماں پر ڈالی اور اگلی بھائی پر جس کا چہرہ اندرونی خوشی کے باعث اس پل واقعی جگمگ چاند دمک رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر گردن کھجا رہا تھا۔

"ہاں آپ چچا اور چاچی کے پاس جائیں ضرور۔ لیکن چاند اور آصفہ کے بیاہ کی تاریخ لینے نہیں بلکہ آصفہ اور میرے رشتے کی بات کرنے۔"

"تارے! یہ کیا بک رہا ہے تو۔" اس کے منہ سے نکلے الفاظ نے جہاں چاند کو آگ لگائی تھی۔ وہیں ثریا خاتون بھی سب درد بھول بھال ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھیں۔ کس فراٹے سے اتنی بڑی بکواس کر گیا تھا وہ۔ مجال ہے جو ذرا بھی لڑکھڑایا ہو اور اس

کی اسی بے غیرتی نے چاند کو مارے غصے کے کھولا ڈالا۔

"تم اپنے حواسوں میں تو ہو؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی اتنی گری ہوئی بات کرنے کی۔"

"میں پورے ہوش وحواس میں ہوں۔ نشہ نہیں کرتا میں اور جو میں نے کہہ دیا ہے۔ آپ نے وہی کرنا ہے۔" اس کی ڈھٹائی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"خبردار جو پھر بھی تم نے اپنی گندی زبان سے آصفہ کا نام بھی لیا۔ اس کا اور تمہارا رشتہ کیا ہے، بالکل ہی بھول چکے ہو تم۔ تف ہے تم پر۔ دیدوں کا پانی مر گیا ہے تمہارے۔ شرم حیا سب بیچ آئے ہو۔ میں اس وقت صرف اماں کا لحاظ کر گیا ہوں۔ ورنہ دل تو چاہ رہا ہے تمہارا جبڑا توڑ کر ہاتھ پر رکھ دوں۔"

"میں تو جو بھول گیا سو بھول گیا۔ لیکن بڑے بھیا! آپ بھی بھول گئے ہو ابھی اپنے ہاتھ دکھائے تھے تمہیں۔" وہ در پردہ کیا دھمکی دے رہا تھا۔ چاند کا دماغ ایک دم ہی گھوما تھا اور ساتھ ہی دایاں ہاتھ بھی … اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا تھا اور وہ تو ضبط چھوڑ بیٹھا تھا۔

تارا بھی اپنی اصلیت پر اتر آیا۔ اس نے ہر لحاظ … تمیز، ادب، احترام کو پیروں تلے روند ڈالا۔ ثریا خاتون پتھرائی آنکھوں سے دونوں بیٹوں کو دست و گریباں ہوئے دیکھتی رہیں۔

انہوں نے تو دونوں کی ہی ایک جیسی تربیت کی … بھی ان میں فرق نہیں رکھا تھا۔ ایک برتن میں … کہ آپس میں ہمیشہ محبت اور میل جول سے … اتنا کچھ کر کے بھی آخر کہاں کمی رہ گئی تھی۔ جو انہیں یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ صدمہ اتنا شدید تھا کہ … نہ پائیں۔ وہیں تخت پر لڑھک گئیں۔

"اماں جی۔" چاند نے انہیں گرتے دیکھا تو … ان تک آیا۔ تارے نے بھی یہ منظر دیکھا تھا … سے سر جھٹکتا کمرے سے نکل گیا۔

کچھ دیر بعد انہیں ہوش آ گیا تھا۔ وہ ہچکیوں … رہی تھیں۔ وہ سخت شرمندہ ہو رہا تھا۔ ان سے نظریں چراتا وہ دوڑ کر ان کے لیے پانی … جو انہوں نے ہاتھ مار کر پرے کر دیا۔

"نہیں پینا میں نے پانی۔ ارے زہر … تو۔ بڑے بڑے صدمے جھیلے ہیں اس دل … کرچی کرچی ہوں میں تو پہلے ہی اندر سے … دن بھی دیکھنا تھے مجھے۔ میں تو مطمئن تھی کہ … بازو ہیں۔ زندگی آرام سے کٹ جائے گی۔ مگر … پتا تھا کہ میرے ہی بازو میری گردن کے گرد … کس دیں گے۔ مجھ جیسی بد نصیب ماں کو تو … چاہیے۔" وہ اپنا سر پیٹ رہی تھیں۔

"آپ کیوں مریں گی۔ آپ جئیں … زندگی۔ ہاں اگر میری بات نہ مانی گئی تو میں … پٹڑی پر لیٹ کر خودکشی کر لوں گا۔" … سرخ انگارہ آنکھیں لیے تارا ایک بار پھر سامنے … تھا۔ انہوں نے چاند کے ہاتھ سے اسٹیل کا گلاس … کر اسے کھینچ مارا۔

"مر جا۔ جا ابھی جا کے لیٹ جا کم بخت۔ تو … جیسی اولاد مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ تجھے ایسی بکواس کرتے میرے چٹے چونڈے کا بھی لحاظ نہ آیا … میرے سر میں خاک ڈلوائے گا نامراد۔ کیا کہے گی دنیا؟ بھائی نے ہی بھائی کی عزت پہ ہاتھ صاف کر لیا۔ دور ہو جا میری نظروں کے سامنے سے۔"

"تو بھلا میں نے ایسی بھی کیا ناممکن بات کر دی ہے جو اتنا فساد کھڑا کر دیا ہے۔ اپنی مرضی کی زندگی جینے کا حق مجھے بھی ہے۔" وہ پھر اپنی ازلی ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا۔ وہ اسے مارنے کے لیے کوئی چیز تلاش رہی تھیں۔

"اچھا ٹھیک ہے، ابھی تو چلا جاتا ہوں۔ جب دونوں ماں بیٹے کا دماغ ٹھنڈا ہو جائے تو آرام سے غور کرنا میری بات پر۔" وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ جاتے جاتے بھی باز نہیں آیا تھا۔ ثریا خاتون نے روتے روتے چاند کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"اس کی تربیت میں مجھ جنم جلی سے ہی کہیں کوئی کوتاہی رہ گئی ہے۔ مجھے معاف کر دینا میرے

… پانو نے گھبرا کر ان کے چہرے سے ہاتھ کھول … آنکھوں سے لگا لیے۔ دل پگھل پگھل کر آنسوؤں کی صورت بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

دور افق پر چھائی بدلیوں کے پیچھے سے سورج طلوع ہو رہا تھا۔ بے شمار پرندے آب و دانہ کی تلاش میں اپنے آشیانوں سے نکلتے فضاؤں کا حصہ بن رہے تھے۔ جینی نے کچن کی کھڑکی سے قطار در قطار … اس قافلے کو دور تک جاتے دیکھا۔ کیسی عجب حسرت سی تھی اس کی جھیل سی آنکھوں میں۔ کبھی تو بے صورت اور آسمان سی زندگی تھی ان کی … دنوں کی تلخیاں نہ آنے والے کل کی بے … کاش وہ بھی ایک پرندہ ہوتی۔ ایک مزے کی زندگی جیتی۔ جس کی ہر صبح اور شام بس اپنی ہوتی …

"واؤ۔ امپریسو۔ مجھے بھی یہ منظر ہمیشہ فیسی نیٹ کرتا ہے۔ ان پرندوں کو ہوا میں تیرتے دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے ان کے سنگ آسمان کا حصہ بن جاؤں۔ کیا آپ کا دل بھی ایسا ہی؟"

وہ تو خیالوں کے دھارے میں بہتی بہت دور نکل گئی تھی کہ وہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا اور بتانا شروع ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر کچھ ایسی نظر سے گھورا کہ اس نے گڑبڑا کر بات ہی ادھوری چھوڑ دی۔ لیکن چہرے پر ایک دوستانہ سی مسکان در آئی تھی۔

"اوہ سوری۔ لگتا ہے میرا مخل ہونا اچھا نہیں لگا۔ ویسے اب آپ کو عادت ڈالنا پڑے گی کیونکہ میں تو......"

"گیٹ آؤٹ فرام ہیئر۔" اس کا لہجہ کچھ ایسی … لیے ہوئے تھا کہ وہ چپ کا چپ ہی رہ گیا۔ اس نے کافی میکر کا سوئچ آف کیا۔ مگ میں کافی ڈالی۔ ٹوسٹر میں سے توس نکالے اور ٹرے لے کر کمرے کی جانب چلی گئی۔ وہ ابھی تک بت بنا ہوا تھا۔

وہ ناشتا لے کر آئی تھی۔ ضومیر نے ان کا منہ ہاتھ دھلوایا تھا۔ اب وہ تاول لیے بڑی نرمی اور نفاست کے ساتھ ان کا چہرہ اور ہاتھ خشک کر رہا تھا۔ عمر حبیب نے ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی اور کہا۔

"تھینک یو بیٹا۔"

"تھینک یو بھی اور بیٹا بھی۔ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی سر۔" وہ شکوہ کناں نظر سے دیکھتا کہہ رہا تھا۔

"یہ سر کیا ہوتا ہے؟" انہوں نے فوراً نوٹس لیا تھا۔

"وہی جو تھینک یو ہوتا ہے۔" ادھر سے ترنت جواب آیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیے۔ زرد رو چہرے پر تھکان بھری مسکراہٹ۔ جو ان کے اندرونی خلفشار کا پتا دے رہی تھی۔

"بہت تیز ہو بھئی۔ ادھار نہیں رکھتے۔"

"کیا رکھنا چاہیے، تم بتاؤ جینی؟" اس نے یک دم مڑ کر جینی سے پوچھا۔

وہ جو ابھی تک ٹرے ہاتھوں میں لیے کھڑی ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ جلدی سے آگے بڑھی۔

"میں آپ کا ناشتا لائی ہوں ڈیڈ۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ انہیں اس کا ضومیر سے یوں کترا جانا بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ سو فوراً ٹوکا۔

"ضومیر نے تم سے کچھ پوچھا ہے بیٹا۔ پہلے اسے تو بتاؤ اپنی رائے۔"

"جو بھی ہے ٹھیک ہی ہو گا۔ آپ جلدی سے ناشتا کریں۔ پھر آپ کو میڈیسن لینی ہے اور اس کے بعد چیک اپ کے لیے بھی جانا ہے۔ ڈاکٹر رچرڈ سے آج کی اپائنٹمنٹ ہے یاد ہے آپ کو۔" اس کا دھیان کسی اور بات پر اس لیے نہیں تھا کہ وہ ان کے لیے فکرمند تھی۔ انہیں اس پر پیار آیا تھا۔ ہاتھ تھپتھپا کر تسلی دی۔

"مجھے یاد رکھنے کی کیا ضرورت ہے جب سب کچھ میری بیٹی کو یاد ہے اور وہ جیسا کہے گی میں ویسا

ہی کروں گا۔ ہاں تو سب سے پہلے ناشتا وہ ہم ابھی کرتے ہیں۔ لیکن یہ کیا؟ یہ ناشتا تو صرف ایک فرد کے لیے ہے جبکہ میرے ساتھ میرا بیٹا بھی تو ناشتا کرے گا نا۔ اس کا ناشتا؟'' انہوں نے ضومیر پر اک نظر ڈالتے اسے دیکھا تھا اور وہ ان کا مطلب سمجھتے ہوئے اک گہری سانس بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں ابھی لے کر آتی ہوں۔''

''گڈ گرل۔'' وہ مسکرائے تھے اور جس انداز سے وہ اٹھ کر گئی تھی۔ اس کی بے بسی پر اسے تو ہنسی آئی تھی مگر جسے مسکراہٹ تک ہی بمشکل روک کے وہ ان کے پاس آبیٹھا اور اپنے ہاتھ سے کھلانے لگا۔ اسی اثناء میں دروازے پر دستک ہوئی تھی اور کسی نے ذرا سی جھری میں سے منہ اندر ڈال کر پوچھا تھا۔

''مے آئی کم ان ڈیڈ؟'' اور اس من موہنے سے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ نوالہ چبانا بھول گئے۔ ان کی ایک اولاد ہے جنت۔ پچھلے بیس سالوں سے وہ یہی جانتے تھے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا ایک بیٹا بھی ہے۔ میکائیل۔

''میرے پاس تمہاری ایک امانت تھی عومر حبیب۔ جسے میں نے ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھا۔ لیکن اب جس کا بار اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ وہی لوٹانے آئی ہوں۔''

اور ماریانہ کے ذرا سا رخ پھیرتے ہی جو چہرہ انہیں نظر آیا تھا۔ انہیں لگا وہ ان کے لیے قطعاً انجان نہیں ہے۔ ذرا سا غور کرنے پر لگا انہوں نے یہ چہرہ کہیں دیکھ رکھا ہے مگر کہاں۔۔۔۔؟ وہ حیران تھے۔

''کیا ہوا عومر حبیب؟ ذرا غور سے دیکھو یہ تمہارا ہی چہرہ ہے۔ یہ بیٹا ہے تمہارا۔'' اس حقیقت سے آگاہی نے تو ان کی روح تک کو ہلا ڈالا تھا۔ پندرہ سال۔ زندگی کا ایک طویل حصہ۔ جو اس بچے نے کسی باپ کو باپ سمجھے گزارا اور انہوں نے اس کے وجود سے بے خبر رہ کر۔ کیا اس سب کا ازالہ ممکن ہے۔

''او میرے خدا۔'' ان کا جی چاہا تھا اس عورت کا منہ نوچ لیں۔ دکھ اور غصہ اتنا شدید تھا کہ وہ اسے جان سے ہی مار نے کو لپکے تھے۔ مگر۔۔۔۔ افسوس کے پاؤں جنبش بھی نہ کر سکے تھے کہ وہیں لڑکھڑا گئے۔ ضومیر نے فوراً بڑھ کر انہیں سنبھالا تھا۔ اب بھی اس نے ان کا شانہ ہلایا۔

''ڈیڈا میک کچھ پوچھ رہا ہے آپ سے۔'' کیا وہ اس کے کسی بھی سوال کا جواب دے پائیں گے؟ ان کا سر جھک گیا تھا۔

ضومیر نے ان کا گم صم انداز دیکھا تو اسے سر ہلا کر اجازت دینا پڑی۔ وہ بچہ تکے قدموں سے چلتا بیڈ کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ پیچھے باندھ رکھے تھے۔ سنہری پلکیں جھپکتا کر اس نے ضومیر کو دیکھا پھر انہیں۔

''وہ۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے ڈیڈ۔'' وہ جھجکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ضومیر خاموشی سے ناشتے کے برتن اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس نے ایک ممنون نگاہ دروازے کی جانب ڈالی پھر باپ کی طرف پیچھے کیے باندھے ہاتھ آگے کر دیے۔ اس کی گلابی انگلیوں میں اک تہ کیا کاغذ دبا تھا۔ انہوں نے کاغذ کھولا۔ صاف ستھری ہینڈ رائٹنگ میں چند سطریں درج تھیں۔ ان کی نظروں نے حرف حرف ان سطروں کو پڑھا۔

میک کی نگاہ ایک پل کے لیے بھی ان سے نہ ہٹی۔ ان کی آنکھیں کاغذ پر تھیں اور اس کی ان پر۔ جیسے کسی ماہر قیافہ شناس کی طرح ان کے اندر کا حال ہی جان لینا چاہتا تھا۔ وہ کاغذ دوبارہ تہ کر چکے تھے۔ کہا کچھ نہیں۔ وہ کیا کہتے بھلا۔ جبکہ اس نے اپنا مطلب کا نتیجہ اخذ کرتے بھاگ کر دروازہ کھولا تھا۔

کبھی اس باپ پر نام محبت لکھا تھا انہوں نے۔ لیکن اب وہاں سوائے نفرت کے کچھ باقی نہ رہا تھا۔ وہ اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ سو منہ پھیر لیا۔ وہ چلتی ہوئی عین ان کے سامنے رکھے کاؤچ پر آ بیٹھی۔ وہ اگر اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے تو اس میں کب ہمت تھی ان سے نظریں چار کرنے کی۔

وہ سر جھکائے بہت دھیمے سروں میں بول رہی تھی۔ یوں گویا خود سے ہی سرگوشیاں کر رہی ہو۔۔۔

اپنے تمام گناہوں پر شرمسار معافی کی خواستگار تھی اور وہ اس کی معافیوں کا کیا کرتے۔ کیا ان کے سارے درد اس معافی سے ختم ہو سکتے تھے؟ نہیں نا۔ تو پھر ان کی بلا سے وہ معافی مانگے یا کہیں جا کر جان دے دے۔ وہ زندگی کے زہر بھرے دن انہیں بھرے یاد آرہے تھے۔ دکھ' اذیت' درد' تکلیف' ان رسوائیاں سب ایک مٹی بھرے بگولے کی طرح ان کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ ان کا وجود اس گرد میں چھپتا۔ جا رہا تھا۔ وہ خود کو بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے مگر۔

''ڈیڈا مام چلی گئی ہیں۔ آپ نے انہیں روکا کیوں نہیں؟'' میک پریشان سا کہہ رہا تھا۔ اسے ان سے یقیناً یہ امید نہیں تھی۔ دونوں ہتھیلیوں سے گال صاف کرتے وہ ٹی میں سر ہلا رہے تھے۔

''کیوں ڈیڈ۔ میں نے اس پیپر پر سب لکھا تو ہے اور آپ نے پڑھ بھی لیا۔ مام بیمار ہیں۔ ان کے پاس اپنے علاج کے پیسے نہیں ہیں اور ہمارا ہاؤس بھی انکل اسٹیفن نے ہم سے چھین لیا۔ مام کے پاس اب رہنے کی کوئی جگہ نہیں۔ وہ کہاں جائیں گی؟'' وہ ماں کے لیے سخت متفکر تھا اور ان کا مسلسل انکار میں ہلتا سر۔ میک نے جیسے کھڑے کھڑے فیصلہ کیا تھا۔

''اوکے ڈیڈا میں مام کو اس حالت میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کے گھر میں اگر کچھ وقت کے لیے ان کی جگہ نہیں تو میں بھی یہاں نہیں رہ سکوں گا۔ میں ان کے ساتھ ہی جا رہا ہوں۔ اگر آپ بھی چاہیں تو مجھ سے مل سکتے ہیں۔ گڈ بائے ڈیڈ۔'' اس نے واپسی کے لیے قدم موڑ لیے تھے۔ انہوں نے اسے جاتے دیکھا۔ آخر تھا تو ماں کی طرح جلد باز۔

''رک جاؤ میک! میرے بیٹے، یہ صرف میرا گھر نہیں ہے۔ اب یہ تمہارا بھی گھر ہے۔ تم جتنے دن چاہو اپنی ماں کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو۔'' ان کی آواز نے میک کے قدموں کو وہیں روک لیا۔

''رئیلی۔'' وہ جگمگاتی آنکھوں سے تصدیق چاہ رہا تھا اور ان کا اثبات میں ہلتا سر۔

''اوہ۔ مائے سویٹ ڈیڈ۔'' وہ دوڑتا ہوا آکر ان سے لپٹ گیا۔ گو کہ ایسا کوئی بھی فیصلہ بہت کٹھن تھا ان کے لیے۔ مگر کیا کرتے۔ پہلی بار بیٹا کچھ مانگ رہا تھا اور کیا وہ پہلی بار ہی اس کا دل توڑ دیتے۔

☆☆☆

چھت پہ جاتی لکڑی کی گول سیڑھیوں کے پانچویں قد مچے پر وہ یوں گم صم بیٹھا تھا۔ گویا وہاں کسی نے کوئی مجسمہ ایستادہ کر دیا ہو اور اس بت پر صدیوں کی دھول آپڑی ہو۔ گرد آلود بال۔ ستا چہرہ' سوجی آنکھیں' بڑھی شیو۔ ملگجے کپڑے۔ اس کا حلیہ نہایت ہی قابل رحم ہو رہا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے بہت صاف ستھرا رہنے کا عادی تھا۔ گو کہ کپڑے قیمتی نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اس کی شخصیت تھی ہی ایسی کہ معمولی کپڑا بھی سج جاتا۔ جبکہ تارے کا معاملہ یکسر الٹ تھا اور بچپن میں تو اکثر ایسا ہوتا کہ کئی بے تکلف مامیاں، چاچیاں اماں کے منہ پر ہی کہہ جاتیں۔

''اے بھابھی! تمہارا بڑا بیٹا تو ماشاءاللہ سے شہزادہ ہے بالکل۔ مگر یہ چھوٹا کس پر چلا گیا ہے۔'' اور پھر وہ منہ دبا کر ہنستا۔ اماں تو غصے سے ''اے پرے ہٹو'' کہہ کر ادھر ادھر ہو جاتیں۔ لیکن تارے کا جو حال ہوتا، وہ بس وہی جانتا تھا۔

وہ قدرت کی تقسیم میں تو کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا تھا لیکن باقی ہر معاملے میں اس کی کوشش رہتی کہ کسی طرح بھی کسی بڑے بھائی کو پچھاڑ دے اور اس بار تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔ ایسا طریقہ نکالا تھا اسے ہرانے کا کہ وہ ہارنے سے پہلے ہی منہ کے بل آ گرا تھا۔ ابھی کل ہی کا تو قصہ ہے۔ جب اس نے اپنی دھمکی پر عمل کر ڈالا تھا۔ وہ تو ابھی زندگی باقی تھی جو محلے کے لوگوں نے اسے پٹڑی پر لیٹا دیکھ لیا تھا اور اسے زبردستی پکڑ کر گھر چھوڑ گئے تھے۔

''یہ روز اتنا چیختا چلاتا ہے۔ کیا فرمائش ہے اس کی؟ دیکھو بہن! اگر اس کا کوئی مطالبہ ہے تو اللہ کے

واسطے مان ہی لو۔ کیوں جوان جہان بیٹے سے ہاتھ دھونا چاہتی ہو۔ کیا تمہیں باقی چیزیں اپنی اولاد سے بڑھ کر ہیں۔'' اک بزرگوار تو ثریا خاتون کو ہی سنا گئے۔ وہ فکر و کرب کا منہ دیکھ رہی تھیں۔ اب کسی کو کیا بتاتیں کہ یہ ناہنجار اولاد کیا مانگ رہی ہے۔ وہ کیا کرنے لگا تھا۔ ان کا تو اس خیال سے ہی دل بیٹھ گیا تھا۔ مختصر سا تو مال متاع تھا ان کے پاس اگر یہ بھی لٹ گیا تو...... پھر وہ کیا کرتیں چاند کے آتے ہی فیصلہ سنا دیا۔

''میں اپنی آنکھوں کے سامنے اسے مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں مجبور ہوں۔ تو اپنا دل برا مت کر میرے بچے! تیرے لیے لڑکیاں بہت۔ دیکھنا میں تیرے لیے کیسی شان دار دلہن ڈھونڈ کر لاؤں گی۔ ارے یہ تارا لوکی تو اتنا شور نہیں مچا رہا تھا۔ پڑھنے جاتا رہا ہے اس صفو کے پاس۔ ہو سکتا ہے دونوں میں کوئی بات ہو۔''

''بس اماں! اس سے زیادہ نہیں۔'' وہ ایک دم ہی ہوش میں آیا تھا۔ وہ سب برداشت کر لیتا مگر آصفہ کے کردار پر انگلی اٹھائی جائے یہ وہ نہیں سہہ سکتا تھا۔

وہ اسے جلتے کوئلوں پر کھڑا کر دیتیں۔ کوڑوں سے پیٹ لیتیں مگر ایسا تو نہ کرتیں۔ دل آج دل نہیں رہا تھا بلکہ خونم خون ہو گیا تھا۔ وہ کچھ لفظ ہی تو تھے جو اماں نے کہے تھے۔ لیکن کیا چند لفظ ایسے کاری بھی ہو سکتے ہیں کہ روح کو ہی کاٹ ڈالیں۔ وہ تو مر ہی گیا تھا جیسے۔ رات کیسے کٹی۔ دن کب چڑھا۔ آفس میں کیا کارکردگی دکھائی۔ کچھ خبر نہیں۔ ہاں واپسی پر وہ اس کے روبرو جا بیٹھا تھا۔ جس نے ایسی تیغ صفت نظر سے نوازا کہ پہلے سے زخمی دل پارہ پارہ ہو گیا۔ مرد ہو کر اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ تو اس پر کیا بیتی ہو گی۔ جو بتا رہی تھی۔

''تائی اماں آئی تھیں آج اور کس لیے؟ یقیناً جانتے ہوں گے آپ؟'' اور اس کا سر جھکا اور جھک گیا تھا۔

''اس کا مطلب آپ کو ان کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں؟'' اس نے جھٹ نتیجہ نکال لیا۔

''صفی! میں کیا کروں میں۔'' اور اس... اٹھا کر وہیں روک دیا۔

''میں نے کوئی صفائی نہیں مانگی۔ مجھے... میں جواب دیں۔'' اس کا لہجہ دو ٹوک تھا۔

''ہاں تو کیا کروں میں؟ اس کم بخت... دوں؟ بھائی ہے وہ میرا۔ اسے کچھ ہو گیا تو... اف میرا تو جی چاہتا ہے میں ہی مر جاؤں... تمام ہو جائے۔'' وہ مارے بے بسی کے اپنے... نوچ رہا تھا۔

''واہ بہت خوب۔ پہلے وہ تارے... مرنے چلے گئے تھے اور آپ چاہتے... اب آپ انجام دیں اور جب آپ دونوں... جائیں تو مجھے قربان کا مرحلہ دیا جائے۔... میں اتنی ہی ارزاں ہوں؟ میری کوئی قیمت... وقعت نہیں۔

جب میں نے منع کیا تھا کہ میرے پاس... کو دینے کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔ جب... نے ہی اصرار کیا تھا نا اور جب میں نے ٹیوشن فیس... میں آپ کی سیلری مانگی تھی تو آپ نے کیسی رد... تھی۔ یاد ہے نا آپ کو؟ اور آج یہ دن ہے کہ مجھے... اٹھا کر آپ کے اس بھائی کو دان کرنے کی باتیں... رہی ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں کیا کروں۔ آپ... کوئی بات نہیں کریں گے آپ۔ کوئی شور، کوئی احتجاج... نہیں۔... آپ کی میرے لیے محبت؟ میری قدر... آپ کی ایک ادنیٰ خواہش جتنی بھی نہیں۔

آپ کے تو ایک ہی فقرے نے مجھ پر میری اوقات عیاں کر دی۔ بس اب اس سے زیادہ کچھ مت کہیے گا اور اب میری سن لیں۔ آصفہ مراد ایک جیتی جاگتی انسان ہے۔ کوئی بے جان مورت نہیں کہ کوئی جہاں چاہے سجا دے اور نہ ہی کوئی کھلونا ہوں کہ کوئی بھی کھیلنے کو مانگ لے اور اس کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔

میں ایسی زندگی پر ہی لعنت بھیجتی ہوں جو مجھے

... ہوئے گزارنا پڑے۔ میرے لیے تو... دعا فرمائیے کہ میری باقی عمر ایسے گھر... جہاں میں کھل کر سانس بھی نہ لے... مشکوک ماحول میرے لیے تو موت کے... مجھے بچانا ہے اپنی ذات کے مکمل وقار کے... آپ مجبور ہو چکے ہیں مگر میری کوئی مجبوری... میں نے ابا کو اپنا فیصلہ سنا دیا ہے اور وہ پوری... متفق ہیں۔ جا کے تائی جان کو بھی بتا دیجیے گا۔... اپنے بیٹوں کے لیے کوئی ان جیسی ہی ڈھونڈ...''

وہ جو گیلی سیڑھی پر بیٹھی تھی۔ اعتماد سے کہتی... ایک آخری نظر اس پر ڈالی اور مڑ کر اندر کو چل... روک بھی نہ سکا۔ بس لب دم پڑے... طرح بھیگی آنکھوں سے جاتا دیکھتا رہا۔

یوں زندگی کا اک باب تمام ہوا۔

☆☆☆

''بہت بہت مبارک ہو بیٹا! اللہ کی رحمت... سے سب بہت اچھا ہو گیا۔ منگنی کا فنکشن بہت ہی... رہا تھا... ماشاء اللہ اتنی پیاری لگ رہی تھی... نے تو کئی بار نظر اتاری۔ تمہیں یاد ہے نا... بچپن میں بھی اسے کتنی جلدی نظر لگ جاتی تھی اور جب تمہارے قاری صاحب آتے تھے تو تم فوراً اسے لیے دوڑے جاتے اور پہلے پوری ذمہ داری سے دم کرواتے تھے۔ اللہ سلامت رکھے۔ بہت دعائیں... لیے۔''

... میں بیٹے کے لیے ڈھیروں محبتیں... بول رہی تھیں۔ صفو میری کی پلکیں بھی نم تھیں۔ لیکن وہ... ان کو مزید اداس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے بشاشت سے بولا۔

''اور مجھے ہمیشہ آپ کی دعائیں ہی درکار... میری پیاری امی جان! ابو کی کمی تو میں پوری نہیں کر سکتا۔ مگر اپنی ہر ذمہ داری کو پوری طرح نبھاؤں گا یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

''جیتے رہو میرے لعل۔ تمہاری یہی باتیں دل کو پرسکون رکھتی ہیں۔ کوئی فکر اب فکر نہیں لگتی۔ بس اب ایک آس ہے۔ اللہ میرے بچوں کا حق انہیں دلا دے۔ تمہارے کہنے پر میں گئی تھی نجیبی بھائی کے پاس۔ سب ضروری کاغذات جو جو انہوں نے کہے تھے وہ سب بھی انہیں دے دیے تھے۔ بہت امید دلائی ہے انہوں نے۔ کہہ رہے تھے۔ کیس فائل کرتے ہی ایک ہفتے کے اندر پہلا نوٹس بھی بھیج دیا جائے گا۔ لیکن ایک بات ہے بیٹا! کیا بہتر نہیں ہو گا کہ پہلے ہم علیمہ کی شادی سے فارغ ہو جائیں۔ دیکھو نا اس میں ہی سو طرح کے خرچے ہوں گے اور اگر ساتھ ہی مقدمے کی طرف بھی الجھ گئے تو بہت خرچا۔''

''خرچے کی آپ کوئی فکر نہ کریں امی۔ میں اب اس کام کو مزید ڈیلے نہیں کر سکتا۔ آپ ٹینشن مت لیں۔ جہاں اللہ نے ہمارے اتنے کام آسان کیے ہیں وہاں اب یہ بھی مشکل نہیں۔ تسلی رکھیں میں ہوں نا۔'' نگہت کے چہرے پر طمانیت بھری مسکان در آئی۔

''خوش و آباد رہو میرے بچے۔ تم سے بات کر کے سب تھکن اتر جاتی ہے۔ دل شاد کام ہو جاتا ہے اور سنو میری بہورانی کیسی ہے؟ ارے کبھی آواز ہی سنوا دو اس کی۔ کیا اس کا دل نہیں کرتا ہم سب سے بات کرنے کو؟'' وہ استفسار کر رہی تھیں۔

''اوہ ہاں امی! وہ ڈیڈ کی طبیعت کافی ناساز رہی ہے۔ آپ ان کی خیریت بھی پوچھ لیں۔ جسٹ اے منٹ۔ میں آپ کی ان سے بات کرواتا ہوں۔'' ان کا سوال گیم ہی گول کر گیا تھا۔ اگلی فکر ڈال دی۔ سادہ سی نگہت کو پتا بھی نہیں چلا۔

وہ اب عمر حبیب کے لیے پریشان ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے روم سے نکلا ان کے بیڈ روم کی طرف آیا تھا۔ دستک کے لیے ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ اندر سے جینی کی آواز آ رہی تھی اور ہیری۔ وہ دونوں کچھ بول رہے تھے۔

''امی! میں ابھی آپ کو کچھ دیر میں کال کرتا

ہوں۔" اس نے عجلت میں فون بند کر کے کان اندر کی آوازوں پر لگائے۔

"آہو ویسے اسے کچھ چنگا نہیں ہویا۔ انکل جی اوعورت کسی نوں نال لے کر آ گئی اور آپ نوں کہا اے تہاڈا پتر اے اور آپ نے من وی لیا۔ فیر اس کو گھر وچ جگہ وی دے دیتی۔ کیا تسی وہ سب بھول گئے۔ جو اس عورت نے آپ دے نال کیتا؟"

"آئی کانٹ بلیو دس۔ ڈیڈ! آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ اتنا اندھا اعتبار ایک بار پھر۔ کیا آپ کو یاد نہیں، کیا کیا ہوا تھا ہمارے ساتھ۔ کتنی اذیت کاٹی تھی ہم نے۔ کیا آپ۔"

وہ بپھری ہوئی تھی، وہ کم عقل ہے۔ مگر اس قدر ہوگی۔ اسے قطعاً اندازہ نہیں تھا۔ یہ کوئی وقت تھا حساب کتاب کا۔ اس کی برداشت بس یہیں تک تھی۔ جینی کی بات درمیان میں ہی رہ گئی، وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ ایک کاٹ دار نظر دونوں پر ڈالی۔

"بہت رات ہوگئی ہے ڈیڈ؟ آپ سوئے کیوں نہیں ابھی تک؟" اور سر جھکائے بیٹھے عمر حبیب کیا جواب دیتے۔ ان کی نیندوں کو برباد ہوئے تو صدیاں گزر گئی تھیں۔ پھر وہ ان دونوں سے مخاطب ہوا۔

"باقی باتیں کل تک موخر ہو سکتی ہیں پلیز؟" بظاہر تو وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا تھا۔ مگر صاف لگ رہا تھا دانت کچکچائے گئے ہیں اور لال بھبھوکا چہرے والی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ حد تھی نا۔ وہ اپنے ڈیڈ سے کب بات کرے اور کب نہ کرے۔ اب یہ اسے بتائے گا۔ باپ کی چپ پہلے ہی کھٹک رہی تھی کہ اس روبوٹ کی دخل اندازی پر بھی انہوں نے اسے کچھ نہ کہا تھا۔ وہ تن فن کرتی کمرے سے چلی گئی۔ ہیری بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا انکل جی فیر تسی ریسٹ کرو۔ گڈ نائٹ۔" اور ضومیر نے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ وا کیا تھا۔

"صدمے اور غصے میں اکثر لوگوں کی عقل ماری جاتی ہے۔ کس مقام پر کیسے ری ایکٹ کرنا ہے ان کو پتا نہیں چلتا۔ جینی کو تو میں کیا کہوں۔ لیکن ہیری صاحب! میں حیران ہوں کہ آپ بھی "پکے" ہیری جی "ہی نکلے۔"

یہ اس نے تعریف کی تھی یا کچھ اور...... دروازے کے باہر کھڑا ضومیر سد ھو گردن کھجاتا سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

قسمتی سے اس نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جہاں بے سکونی اور انتشار تھا۔ اس کے باپ کو میوزک کا جنون تھا۔ وہ خود کو بہت اچھا سنگر سمجھتا تھا۔ مگر بات تو جب بنتی نا کہ دنیا والے بھی اس کے ہم خیال ہوتے۔ بس اسی بجھ اور نا سمجھی میں الجھے اس شخص نے نہ صرف اپنی زندگی مشکل کیے رکھی بلکہ ان سب کو بھی ہمیشہ امتحان میں ڈالے رکھا۔

ان کے گھر کی ہر صبح اس کی لمبی لمبی تانوں سے ہوا کرتی تھی۔ ایک تان وہ اڑاتا اور ایک اس کی ماں۔ جو تمام عمر شوہر سے سخت نالاں رہی۔ اسے شوہر کی ایک بات بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ (اب اس میں ماں کا کیا قصور۔ کوئی اچھی لگنے والی بات بھی تو ہوتی نا) مگر پھر بھی وہ بے حد حوصلہ مند عورت تھی۔ خود ایک گارمنٹ فیکٹری میں جاب کرتی تھی۔

شوہر کی تو ہوائی روزی تھی۔ جو کبھی ہوتی کبھی نہ ہوتی اور جو ہوتی بھی تو اس کے اپنے بڑے اللے تللے تھے۔ سگریٹ نوشی کے علاوہ وہ بادہ کا بے حد نوش تھا۔ ہمہ وقت دھت رہتا۔ جوئے کی لت الگ لگی ہوئی تھی اور سب باتیں تو برداشت ہو ہی جاتیں لیکن اس کا تو بہت سی عورتوں سے بھی میل جول تھا۔ اس کی ماں کی قوت برداشت دے جاتی۔

ماں پہلے پہل تو خوب لڑا کرتی تھی۔ لیکن جب اس نے اپنی روش نہ چھوڑی تو وہ کیوں پیچھے رہتی۔ اس کا باپ جب ہوش میں آتا۔ چیختا چلاتا۔ وہ اس گھر کی پہلی اولاد تھی۔ جو تیزی کے ساتھ شعور کی منازل طے کرتی وہاں آ کھڑی ہوئی تھی۔ جہاں سے خیر اور

شر نمایاں ہونے لگتی ہے۔

اسے سب سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ اسے عام بچے کی نفرت تھی۔ اسے خاص بنتا تھا۔

کچھ عرصہ بیتا۔ باپ کو شدید بیماری نے آن لیا۔ وہ سارا دن فلیٹ کے سب سے تنگ اور تاریک کمرے میں پڑا کھوں کھوں کرتا زندگی کے دن گن رہا تھا۔ ماں کی اپنی ایک دنیا تھی۔ لیکن زیادہ کام اب اس سے بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے تو اس نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنا خرچا خود اٹھائے۔ سو یوں پڑھائی کے ساتھ ساتھ اسے ایوننگ شفٹ میں ویٹرس کی جاب کرنی پڑی۔

اس نے پہلی بار اسے اسی ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا۔ وہ اپنی جاب سے واپسی پر کافی پینے کے لیے یہیں آتا تھا۔ اکثر وہ ہی اسے کافی سرو کیا کرتی۔ یہ آپ میں گم سارے زمانے سے لاپروا وہ تیکھے نقش والا ایشین لڑکا جس کے چہرے کے خدوخال پہلے ہی دن اس کی توجہ کھینچ چکے تھے۔ وہ اسے اپنے باپ اور بھائی کے علاوہ اردگرد رہنے والے ڈھیروں مردوں میں سب سے الگ اور منفرد لگا تھا۔ وہ یقیناً ایک سلجھی ہوئی اور نفیس شخصیت کا مالک تھا۔

گو کہ وہ ان کے دیس سے نہیں تھا اور ان ترقی پذیر ممالک سے آنے والوں کے متعلق اس نے بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ لیکن پھر بھی اس کی دلچسپی بدستور بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اکیلا ہی آتا تھا۔ (یہ ایک اور قابل توجہ خوبی تھی) بالکل آخری ٹیبل پر بیٹھتا۔ ایک کپ کافی آرڈر کرتا۔ جب تک کپ اس کے سامنے رکھا جاتا، وہ ٹیبل پر انگلی سے نادیدہ لکیریں کھینچتا رہتا۔ جانے کن سوچوں میں ڈوبے وہ کافی ختم کرتا اور بل ادا کر کے کسی کی طرف بھی دیکھے بنا اسی خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا۔

اتنے دن ہو چکے تھے اسے وہاں آتے ہوئے اور اسے یقین تھا اگر وہ کہیں باہر ملا تو پہچانے گا بھی نہیں۔ وہ تو سر اٹھا کر کسی کو دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ روز اسے مخاطب کرنے کا سوچ کر ہی رہ جاتی۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی سردمہری کسی سوال کی اجازت کب دیتی تھی۔

اس روز جب اسے ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ اس کے آرڈر کرنے سے پہلے ہی اس کا کپ تیار کرنے لگی۔ کرفی اس کی قلیپائنی ساتھی عجلت میں اس کے پاس آئی۔

"تمہاری مدر کی کال آئی ہے۔ تمہارے فادر کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ فوراً پہنچو۔"

"اوہ گاڈ۔ کیا ہوا؟" اس نے یونہی پوچھ لیا تھا ورنہ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کی طبیعت اس کے بچپن سے لے کر اب تک بھلا کس دن سدھری تھی۔

"پتا نہیں۔ انہوں نے ڈیٹیل نہیں بتائی۔ تم جاؤ، میں سب سنبھال لوں گی۔" کرفی نے اس کے ہاتھ سے کپ لینا چاہا۔

"نہیں، یہ میں سرو کر کے چلی جاتی ہوں۔" اس نے کپ نہیں دیا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ گاڈ بلیس یو۔" وہ اس کی فرض شناسی سے متاثر ہوئی تھی۔ شانہ جھٹک کر پلٹ گئی۔ وہ اطمینان سے کپ لیے ٹیبل تک چلی آئی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"کیا میں نے کافی آرڈر کی تھی؟" وہ عجب روکھے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا گئی۔

"روز کافی ہی تو آرڈر کرتے ہیں تو میں اس لیے۔" وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا اسی لیے تو ہاتھ بڑھا کر کپ تھام لیا۔

"گڈ سروس۔ آئی ایم امپریسڈ۔ لیکن آج مجھے کافی نہیں پینی تھی۔ میں تو چیز سینڈوچ اور گرین ٹی آرڈر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن خیر۔ کوئی بات نہیں۔ جو چیز مقدر میں ہوتی ہے تو وہی ہے۔ بڑی ٹھوکریں لگتی ہیں انسان کو لیکن وہ سمجھ پھر بھی نہیں پاتا۔" وہ بولتے بولتے خود کلامی کرنے لگا تھا۔ وہ حیران اس کے ہلتے لبوں کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"ہاں۔ نہیں۔ اینڈ چیز سینڈوچ پلیز۔" اس کا آرڈر تیار کر کے سرو کیا اور اپنی سائیکل نکال کر گھر بھاگ گیا۔ بیمار باپ جس سے بھی اس کی ذرا سی بھی جذباتی وابستگی نہیں رہی تھی۔ جس کے سیاہ ہونٹ اور سرخ آنکھیں اسے ڈرایا کرتی تھیں۔ وہی آنکھیں کبھی نہ کھلنے کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ ماں کو اس نے پہلی بار شوہر کے روبرو سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔ وہ بھی اس کے پاس جا گری تھی۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

صبح سویرے کمرے کا دروازہ بری طرح دھڑ دھڑایا گیا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھے۔ لپک کر دروازہ کھولا۔ باہر میک کھڑا تھا۔ بے حد پریشان۔ ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی روہانسے لہجے میں بول اٹھا۔

"ڈیڈ۔ مام اپنے روم میں نہیں ہیں۔ وہ چلی گئی ہیں۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔"

"ریلیکس مائے سن۔ نہیں ہوں گی۔ اطمینان سے دیکھو۔" انہوں نے کم سن بچوں کی طرح ماں کے لیے بلکتے بیٹے کو ساتھ لگا لیا۔

"نہیں ہیں۔ وہ یہاں کہیں بھی نہیں ہیں۔ میں ہر جگہ دیکھ چکا ہوں۔ ان کی تو میڈیسن بھی ختم ہو چکی تھی۔ ان کے پاس رقم بھی نہیں تھی۔ وہ کہاں جائیں گی؟ ڈیڈ پلیز انہیں ڈھونڈیں۔" میک تڑپ رہا تھا۔

اس کی آواز سن کر ضومیر اپنے روم سے نکلا۔ صورت حال جان کر اسے بھی خاصی تشویش ہوئی۔

"میک۔۔۔ پلیز ڈونٹ کرائے۔ بی بریو۔ آنٹی کہیں نہیں گئیں۔ ہو سکتا ہے مارننگ واک کے لیے چلی گئی ہوں۔ آؤ دیکھتے ہیں۔" ضومیر نے گاڑی کی چابی اٹھائی۔

"اگر وہ خاتون چلی ہی گئی ہیں تو کوئی ضرورت نہیں ہے ان کے پیچھے جانے کی۔"

کسی کو بھی مخاطب کیے بنا جینی نے کہا تھا۔ ضومیر کے اٹھتے قدم اک پل کو تھمے۔ تاسف بھری نظر اس لاپروائی اور لب بھینچے دروازہ پار کر گیا۔

عمر حبیب چپ چاپ کارپٹ پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اندر کیا چل رہا تھا اس پل بتانا مشکل تھا۔ اس کے جانے کی انہیں پروا نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی جانے کیوں دھیان ادھر ہی لگ گیا تھا۔ ضومیر اور میک کچھ ہی دیر میں واپس پلٹ آئے۔ وہ واقعی جا چکی تھی۔ ان کا مختصر سا سامان بھی گھر میں نہیں تھا۔

میک کی حالت دیدنی تھی۔ اس کو دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو رہے تھے۔ جتنی ہر فکر سے آزاد … ہی ہوتی جا چکی تھی۔ ضومیر کو شک ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ اس کی رات کی گفتگو انہوں نے بھی سن لی تھی تب ہی تو وہ یوں گھر چھوڑ گئیں۔

وہ متاسف سا میک کو دیکھ رہا تھا۔ … اچانک گم شدگی سے جس کی جان پر بن گئی تھی۔ … کیفیت سمجھ سکتا تھا۔

خود اس چھت کے نیچے سکھ کے سانس لیتا ان … در بھٹکنے کے لیے کہیں چھوڑ سکتا تھا۔ جبکہ وہ دمہ کی مریضہ تھی۔ یہی خیال اس کا دم نکالے جا رہا تھا۔ پل قرار نہ تھا۔ ضومیر پھر گاڑی کی چابی لے کر نکل پڑا اور یہ اس کی دن بھر کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک ہاسپٹل میں خستہ حال وہ انہیں مل ہی گئی۔

☆☆☆

وہ اس کے لیے یقینی طور پر لمحہ حیرت تھا۔ جب تین دن بعد وہ ریسٹورنٹ آئی تھی اور اس نے حاضری کی بابت دریافت کیا۔ ایک تو حالت … اس کی توجہ کی خوشی نے بے اختیار پلکیں بھگو دیں۔ اسے سب بتاتی چلی گئی۔ وہ خاموش سامع آنکھوں سے ہی دلاسے دیتا رہا۔ وہ بڑا کم گو تھا۔ لیکن جتنا بولتا تھا اس سے کہیں اچھا سنتا تھا۔

وہ بولتی جاتی بخار کے زور سے جلتی اور یونہی روتے روتے وہ ایک دن اسے کہہ گئی۔

"ول یو میری می؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا اور ہموار لہجے میں گویا ایک بار پھر اسے بتایا۔

"یو ڈونٹ… آئی ایم مسلم اینڈ یو۔"

"آئی نو۔ بٹ آئی ریئلی لو یو۔ میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر۔" وہ یوں مسکرایا جیسے کسی نادان بچے کی … کوئی سیانا تدبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ "یہ صرف کتابی باتیں ہیں۔ سب اپنی اپنی زندگی گزار لیتے ہیں کسی کے ہونے نہ ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔"

"پلیز ڈونٹ۔ تم چپ ہی رہو۔ مت بولو۔ تو بہت بری باتیں کرتے ہو۔" وہ سخت بدمزہ ہوئی۔

"تم صرف وقتی اٹریکشن کا شکار ہو رہی ہو۔ میں آج کے بعد تم سے نہیں ملوں گا۔ چند دن بعد تمہاری حالت خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ بلیو می۔" وہ … کسی ڈاکٹر کی طرح مشورے سے نوازتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔ پلیز۔ میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر۔" وہ منت کرتا اٹھ کر چلا گیا تھا۔

اگلے دن واقعی وہ نہیں آیا تھا اور اس کے بعد بھی۔ اس کی تو جان پر بن آئی تھی۔ اتنے دن وہ اچھی ہی ستاتی رہی تھی۔ اس سے تو پوچھا ہی نہیں تھا کہاں سے آیا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ وہ سارے شہر میں سائیکل دوڑاتی پھری اور ایک دن وہ پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں پھر کچھ فرق پڑا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ گئے۔ تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنے مخصوص لاپرواہ لہجے میں سامنے تھا۔ وہ تو اسے دیکھتے ہی … کے بے حال اس سے گلے لگ کر دھواں دھار رو پڑی تھی اور اسے یقیناً ایسے ردعمل کی توقع نہ تھی۔ وہ بری طرح سٹ پٹا کر رہ گیا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کی خبر اس کی ماں تک بھی پہنچی۔ جس نے شدید برا مانا تھا۔

"تم جانتی ہو وہ لڑکا ایشین ہے۔ یہ پور کنٹریز کے ان ایجوکیٹڈ بوائز یہاں دولت کمانے آتے ہیں۔ نہ شکل نہ عقل۔ غریب قوم کے مزدور کیڑے۔ ان کے پیچھے لمبے چوڑے خاندان ہوتے ہیں۔ جن سے دور یہ آ تو جاتے ہیں۔ مگر ان سے یہ کٹ کر نہیں رہ سکتے اور تم جیسی کم عقل لڑکیاں ہوتی ہیں جو ان کے جال میں پھنس کر اپنی زندگیاں خراب کر بیٹھتی ہیں۔ کیا تم بھول گئی ہو وہ کیا ہوا تھا ایلس کے ساتھ؟ وہ بچوں کا تحفہ دے کر ساری دولت ہتھیا کر لے گیا تھا وہ بلڈی ایشین۔ اس کی بے وفائی کے غم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئی تھی وہ۔" وہ اسے اپنی سہیلی پر بیتی یاد دلا رہی تھی۔

"وہ ایسا ہرگز نہیں ہے مام۔ بہت اچھا ہے اور اس کے پیچھے کوئی خاندان نہیں ہے، وہ بالکل اکیلا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ آپ میرا۔"

"بکواس۔ سب بکواس کر رہا ہے وہ تم سے۔ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ تم دیکھنا وہ تم سے بھی کام کروائے گا۔ پیسے اکٹھے کرے گا اور واپس اپنے وطن لوٹ جائے گا اور تم یہاں اس کی اولاد پالنا۔ یہ خبیث لوگ تو اپنے ہی بچوں سے بھی مکر جاتے ہیں۔ تم یہ غلطی کر کے کہیں کی نہیں رہو گی۔ تم برباد ہو جاؤ گی۔" اور صرف ماں پر ہی کیا موقوف اسے سب نے روکا تھا۔ سمجھایا تھا لیکن اس کی محبت جیت گئی تھی اور وہ جتا جو بھی مان گیا تھا۔

☆☆☆

آج وہ پہلے سے بہت بہتر نظر آ رہی تھیں۔ اس دن تو وہ انہیں دیکھ کر ڈر ہی گیا تھا۔ انہیں استھما کا شدید اٹیک ہوا تھا۔ وہ اک پارک سے بالکل خالی ہاتھ لائی گئی تھیں۔ اسی لیے تو بروقت شناخت نہ ہو سکی۔ وہ تو زندگی باقی تھی جو وہ بھی انہیں تلاشتے ان تک جا پہنچا تھا اور وہ اب ان کے سامنے تھیں۔ میک اس کا شکر گزار تھا۔ بار بار گلے لگ کر کہتا۔

"یو آر گریٹ برو۔۔۔ آئی ایم اوبلائجڈ ٹو یو۔
(میں آپ کا احسان مند ہوں)"

"اوں ہوں۔ احسان کیسا۔ یہ میرے لیے بھی تو ماں جیسی ہیں نا۔ میں نے تو ایک بیٹا ہونے کا ثبوت دیا ہے اور بس۔" وہ ہنس دیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے ان کی جانب رخ

پھیرا جو بہت دیر سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"تم نے ابھی کہا، میں تمہاری ماں جیسی ہوں؟ اگر میں کچھ پوچھوں تو سچ بتاؤ گے؟" اور وہ ٹھہر ہی رہ گیا تھا۔ وہ اس سے اردو میں بات کر رہی تھیں۔ اسے خوشی ہوئی تھی۔

"ارے واہ! آپ تو بہت اچھی اردو بول لیتی ہیں۔"

"ہاں تھوڑی بہت سیکھ لی تھی۔ جب تمہارے ہم وطن کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ تب میں نے ہر وہ کام سیکھنے کی کوشش کی جو اسے اچھا لگتا تھا۔ بے حد محبت تھی مجھے اس سے۔ پھر ایک دن سب بکھر گیا۔ خطا میری ہی تھی۔ میں ہی نہ جان سکی اس نعمت کی قدر جو قدرت نے میری جھولی میں ڈال دی تھی۔ تم ایک اچھے لڑکے ہو۔ عمر حبیب نے تمہارا انتخاب یقیناً بہت سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔ مجھے بہت اچھا لگا تم سے مل کر۔ مگر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ جینی خوش نہیں ہے؟ وہ مجھ سے ناراض ہے۔ بہت نفرت کرتی ہے مجھ سے۔ میں جانتی ہوں۔ لیکن وہ تم سے کیوں خفا نظر آتی ہے۔ تم دونوں کے درمیان کچھ غلط ہے اور کیوں؟ کیا مجھے سچ بتانا پسند کرو گے؟"

عمر حبیب کو تو دھوکا دینا آسان تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے تھے۔ مگر وہ ایک عورت تھیں اور سب سے بڑھ کر جینی کی ماں۔ ان کا سوال ہی ایسا تھا کہ اسے چپ لگ گئی تھی۔

"پلیز مانے نا۔ تم مجھ پر اعتبار کر سکتے ہو۔" جس کنڈیشن میں تھیں انہیں سچ بھی تو نہیں بتا سکتا تھا۔ مسکرا کر ان کا ہاتھ تھپکا۔

"ڈونٹ وری۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کسی بھی طرح کا اسٹریس مت لیں اور مجھ سے پرامس کریں، آئندہ بغیر بتائے گھر سے کہیں نہیں جائیں گی۔"

"وہ عمر حبیب کا گھر ہے۔ مجھے وہاں رہنا اچھا نہیں لگ رہا۔ مجھ میں ہمت نہیں مزید اس کا سامنا کرنے کی۔ مجھے مجبور مت کرو پلیز۔" ان کا لہجہ التجائیہ تھا۔

"اس گھر میں آپ کے بچے رہتے ہیں۔ بس انہیں دیکھیں۔ دیٹس اٹ۔"

"پہلے بھی ان کی وجہ سے ہی وہاں رہنا تھا۔ بس اب۔"

"بس اب اور کچھ بھی نہیں۔ جلدی سے ہو کر گھر چلیں۔ جب تک آپ کی صحت بہتر نہیں ہو جاتی۔ آپ کہیں نہیں جا سکتیں۔ ہاں پھر آپ جو چاہیں گی۔ میں خود وہاں چھوڑ آؤں گا ٹھیک۔" انداز ایسا حتمی تھا وہ کیا کہتیں۔

☆☆☆

ایک بیڈ روم لاؤنج اوپن کچن اور واش روم تھا اس کے خوابوں کا چھوٹا سا گھر اور اس کے لیے بہت تھا۔ وہ دونوں ایک ہو چکے تھے۔ یہ خوشی ہی کم تھی کہ باقی سب سر و سامان اس کے آگے تھے۔ وہ اپنے جذبوں کا اظہار کرنے میں بالکل نہ تھی۔ وہ خوب بولتی ہنستی اور بے دھڑک وہ کم گو ہے، وہ پہلے سے جانتی تھی۔ وہ بھی کھل کر ہنستا۔ یہ بھی اسے علم تھا۔ مگر اس کے اطوار محبت بھی ایسے ہی ہوں گے۔ یہ اندازہ نہ تھا لیکن معاملات میں وہ بالکل کنجوس نہیں تھا۔ جہاں تک پڑتا ضروریات زندگی مہیا کرتا۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

"مرد کا کام ہوتا ہے کمانا اور عورت کا سنبھالنا۔ میں اپنے کام میں کسی کو دخل نہیں دیتا اور تم اپنے کام میں دل لگانا۔ پھر دیکھنا زندگی خوبصورت اور سہل ہو جائے گی۔" اور وہ اس کی بات پر حرف بہ حرف عمل کر رہی تھی اور شاید کرتی ہی رہتی اگر جہاں اس کے اپنے دھیان نہ بٹاتے۔

"اف۔ یہ گھر ہے کہ ڈربا۔ او خداوند کیسے سانس لیتی ہو تم ان گھٹی ہوئی دیواروں کے درمیان۔ کیا ہے تمہارے پاس؟ نہ اچھا گھر نہ اچھا کھانا نہ ماحول۔ یہ لباس دیکھا ہے تم نے اپنا؟ کیسا بدرنگ رہا ہے۔"

لیا، تمہیں اچھے کپڑے بھی نہیں دلا سکتا؟ اگر نہیں تو تم کیوں اپنی صلاحیتوں کو زنگ اپنے ہاتھ پیر ہلاؤ تم تو اس سے بھی ہو۔ کیوں گھٹ گھٹ کر جی رہی ہو

اس کی ماں کے ارشادات تھے جو وقتاً فوقتاً کے کانوں میں انڈیلتی رہتی تھیں۔ اس کی شادی انہوں نے بھی اچھے کماتے بچے کاروباری سے شادی کر لی تھی اور جیسے ان کی قسمت کے ستارے کو سکون آ گیا تھا۔ سب تنگیاں دور ہو تھیں۔ اب ان کے ہاتھ میں صرف اپنی کمائی تھی۔ بلکہ نئے نویلے شوہر کے والٹ سے اور خرچ کرتیں۔

"وہ ماما! آپ کو پتا ہے کہ اسے میرا گھر سے کام کرنا پسند نہیں۔" وہ انہیں وضاحت دیتی۔

"یہ اس کی پسند نہیں بلکہ اس کی ذہنیت ہے۔ وہ جہاں سے بی لونگ کرتا ہے وہاں کے لوگ کنزرویٹو ہوتے ہیں۔ ان سے برداشت ہی نہیں ہوتا کہ عورت کسی بھی معاملے میں ان سے آگے بڑھ جائے۔ چار سال تم اس چار دیواری میں قید رہی ہو۔ اس کی خواہش پر۔ اس کی خوشی کے لیے تو کیا اب وہ تمہاری ایک نہیں مان سکتا جبکہ اس میں اس کا کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہے۔ میں تمہارے لیے اچھی سی جاب دیکھتی ہوں۔ جب تم جوائن کر لوگی تو اس کے پاس اعتراض کا کوئی جواز نہیں رہ جائے گا۔"

اور یہ صرف کہا ہی نہیں گیا تھا بلکہ جلد ہی عمل بھی کیا گیا تھا۔ وہ اسی گمان میں تھی کہ وہ تھوڑا سا ناراض ہوگا پھر سب ٹھیک ہو جائے گا اور حیران کن طور پر ایسا ہی ہوا۔

وہ چپ کی بکل مارے بہت دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ جیسے یقین نہ آیا ہو وہ اس طرح حکم عدولی کر گزرے گی۔ مگر پھر "اوکے ایز یو وش" کہتا کروٹ بدل کر سو گیا اور اس نے تو گویا اس کی چپ کو اس کی رضا ہی جان لیا۔

ایک بار من مانی کیا کر لی آئندہ کے لیے راستہ ہی کھل گیا۔ وہ اپنے معاملے میں اس کی ہر کوتاہی کو نظر انداز کر جاتا تھا۔ مگر بیٹی کے لیے وہ بہت پوزیسو تھا۔ ذرا سی لاپروائی ناقابل برداشت ہوتی۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں معمول کا حصہ بن گئیں۔ جن پر اس کے نام نہاد خیر خواہ خوب مسالا چھڑکتے۔

بات بگڑی تو پھر بگڑتی ہی چلی گئی اور اس روز تو حد ہی ہو گئی۔ ان کے باس کو ایک بڑا کانٹریکٹ ملا تھا۔ اسی خوشی میں پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کا جانا ضروری تھا۔ جبکہ بیٹی کی طبیعت بھی ناساز تھی۔ اسے موسمی تبدیلی نے گھیر رکھا تھا۔

"تم آج گھر سے باہر نہیں جاؤ گی۔ بس اس کا خیال رکھو اور ہو سکتا ہے آج مجھے واپسی میں کچھ دیر ہو جائے۔ ویسے تو میری پوری کوشش ہوگی جلد آنے کی لیکن خدانخواستہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں تم اسے فوری طور پر ڈاکٹر کے پاس لے جانا اور......"

"لیکن تمہیں پتا ہے کہ آج میرا پارٹی میں جانا ضروری ہے۔" اس کا ہدایت نامہ جاری تھا کہ وہ جھنجھلا کر کہہ گئی۔

"اگر بیٹی کی زندگی اور صحت سے زیادہ ضروری ہے تو بے شک چلی جانا۔ میرے روکنے سے پہلے بھی رکی ہو تم جو آج رک جاؤ گی۔" وہ سنجیدگی سے کہتا اپنی چیزیں سمیٹ رہا تھا۔

"تمہیں تو بس موقع چاہیے مجھے باتیں سنانے کا اور تمہیں بھی آج ہی دیر سے آنا ہے۔ پہلے تو کبھی نہیں ہوا ایسا۔ تم جان بوجھ کر زچ کرتے ہو مجھے۔"

"اپنا اور بیٹی کا خیال رکھنا۔"

وہ ہمیشہ کی طرح کسی بھی بحث میں پڑے بغیر جا چکا تھا۔ وہ تادیر کلستی رہی۔ اسے پورا یقین تھا۔ وہ صرف اسے روکنے کے لیے ایسا کہہ کر گیا ہے۔ وہ ٹائم سے واپس آ جائے گا۔ اسی لیے تو خوب اہتمام سے تیار ہوئی۔ بیٹی کو زبردستی دوائی کھلائی اور اس کے رونے تڑپنے کی پروا نہ کرتے ہوئے پڑوسن کو اس کا

وہ پانچ سالہ پیاری سی بچی رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ سیب سے سرخ گال نمکین قطروں سے بھیگے ہوئے تھے۔ وہ چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مسز کرسٹوفر عاجز آچکی تھیں کہ ان کے پندرہ سالہ بیٹے نے آکر ان کی مشکل آسان کی۔

"ممی! آپ جانا چاہیں تو جا سکتی ہیں۔ میں ہوں اس کے پاس۔ اس کا خیال رکھوں گا۔" وہ بیڈ کی پائنتی پر آبیٹھا تھا اور اس کے تپتے ہوئے ہاتھ کو بڑی نرمی سے سہلایا۔

"اوہ مائے سن یو آر سو سویٹ۔ میرے سر میں تو پہلے ہی درد تھا اب اور بڑھ گیا ہے۔ کتنا رو رہی ہے یہ۔ بخار بھی تو کتنا ہے اسے اور ماں کو دیکھو۔ ذرا جو فکر ہو۔ بیمار بچی کو چھوڑ کر چلی گئی۔ حد ہے لاپروائی کی۔ تم کچھ دیر اس کے ساتھ گیمز کھیلو۔ جب یہ سو جائے تو ڈور لاک کر کے آجانا۔ اس کے باپ کے پاس چابی ہے دروازے کی وہ خود ہی آکر کھول لے گا۔ سمجھ گئے۔"

"یاہ۔ یاہ۔ سمجھ گیا۔ ڈونٹ یو وری اباؤٹ ہر۔ آپ جا کر ریسٹ کریں۔ میں اسے سلا کر جاؤں گا۔" اس نے ماں کو بھرپور تسلی دی۔ ان کے جاتے ہی ڈور لاک کر کے وہ اس کے سرہانے آبیٹھا تھا۔

"چپ بس چپ۔ خبردار جو اب آواز نکالی۔ میرے پاس چاقو ہے شور کیا تو اس سے گلا کاٹ دوں گا تمہارا۔" اس کے منہ پر ہاتھ رکھے وہ یک لخت ہی بھیانک دیو بن گیا تھا۔

☆☆☆

ویک اینڈ پر۔ کبیر ماموں ملنے چلے آئے۔ عمر حبیب کا موڈ بھی ان کے آنے سے بہل گیا تھا۔ اب نہ صرف انہیں بولتے بلکہ ہنستے دیکھ کر اسے اچھا لگا تھا۔ وہ بے اختیار کہہ گیا۔

"روز تھوڑا سا وقت نکال کر آجایا کریں ماموں! آپ کے آنے سے تو گھر کا موسم ہی بدل گیا ہے۔"

"ہاں بس میں ہی وقت نکالا کروں۔ تمہارے پاس تو وقت ہی نہیں رہا ہمارے لیے۔ ابھی پہلے تم گھر کے پاس سے گزرے تھے تو یاد نہ آیا کہ ہمارے گھر بھی آسکتے تھے؟" ماموں نے اپنی شکایتوں کی پٹاری کھول لی۔

"دو دن پہلے؟ ارے ہاں وہ تو میں ابو کو اسلامک سینٹر لے کے گیا تھا۔ ان کے ڈاکٹر نے ایڈوائز کیا تھا کہ انہیں مصروف رکھا جائے۔ زیادہ اسٹریس لینے کی وجہ سے ان پر میڈیسن نے اثر کرنا چھوڑ دیا تھا اور اگر وہ کچھ کام اور ایکٹیویٹیز میں رہتیں تو انشاء اللہ ریلائز بھی ہو سکتی تھیں۔ میں نے سوچا کہ انہیں ایسی جگہ لے جاتا ہوں جہاں جا کے وہ اپنی ساری فرسٹریشن بھول جائیں۔" اس کی وضاحت پر عمر حبیب نے چونک کر سر اٹھایا۔ "اتنی خراب حالت؟ اور انہیں پتا ہی نہیں۔" کبیر ہاشمی نے اس کا شانہ تھپکا۔

"جزاک اللہ۔ بیٹا یہ تو بہت نیکی کا کام کر رہے ہو۔ مجھے تو بہت دکھ ہوا ہے انہیں دیکھ کر۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ وہ بہت نادم ہیں اور یہی ندامت ان کی بیماری کا سبب ہے۔ وہ ڈیڈ سے معافی مانگنا چاہتی ہیں۔ وہ جنتی کو پیار کرنا چاہتی ہیں۔ لیکن راہ میں پڑی سرد برف ان کے پاؤں گرو دیتی ہے۔ اگر تو صرف ایک بار۔"

اور بولتے بولتے اس کی نظر عمر حبیب سے جا ملی تو باقی کے لفظ حلق میں ہی پھنس گئے۔ جبکہ کبیر ہاشمی اس کی تائید کرتے مزید دلائل دے رہے تھے۔ عمر حبیب کی انگلیاں گلاس پر بے کل سی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ وہ بالکل چپ تھے۔

"میں نے نہایت معقول مشورہ دیا ہے۔ غور ضرور کرنا۔ چلتا ہوں۔" کبیر ہاشمی ان کا شانہ تھپکتے چلے گئے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے نکلا تو تھا کہ قدم دہلیز پر رک گئے۔

"کبیر ہاشمی کو تم نے بلایا تھا؟"

"جی ماں۔ نہیں۔۔۔ نہیں وہ تو خود۔"

"اور اس کے منہ میں تمہاری ہی زبان بول رہی ہے۔ ہے نا؟" ان کی آنکھوں کی سرد مہری نے اسے نظریں چرانے پر مجبور کر دیا۔ مگر جھوٹ کیسے بولتا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔ اس کے شانے پر بازو پھیلایا۔ چند لمحے اس کے بجھے چہرے کو دیکھتے رہے۔ پھر سر سے سر جوڑ کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"بات یہ ہے بیٹا جی! آپ کچھ زیادہ ہی اوور اسمارٹ ہو گئے ہیں۔ یعنی باپ کو مشورے۔۔۔ واہ بہت خوب اور مجھے پورا یقین ہے اس قصے کے بعد جنتی سے ضرور پٹو گے۔"

ایک تو ان کی بات، اس پر لہجے کا بدلاؤ۔ اس نے ایک جھٹکے سے رخ ان کی جانب پھیرا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بے اختیار ان سے لپٹ گیا۔ انہوں نے بھی محبت سے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ الجھے ہوئے تھے۔ فیصلہ بہت کٹھن تھا۔ جی چاہتا تھا اس کی سب خطائیں معاف کر دیں۔ مگر پھر جنتی کا متوقع رویہ زنجیر بن جاتا۔ زندگی عجب دھوپ چھاؤں سی گزری تھی۔ اب جنتی روٹھ کہیں پڑاؤ ڈالتی تھی اور اب دل کو ڈھارس مل گئی تھی۔ ضومیر سب سنبھال لے گا۔ یہ حوصلہ کافی تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"واہ جی آپ نے کیا مجھے اتنا ہی ذہن سمجھ رکھا ہے۔ بچنے والی کوئی اور مخلوق ہوتی ہوگی۔ یہ میں ہوں۔ ضومیر ہاشمی نام ہے میرا۔ میں نہیں بچنے والا۔"

وہ اوور اسمارٹ ہی نہیں بلکہ چالاک بھی تھا۔ گھر میں کیا بلایا وہ تو گھر والا ہی بن بیٹھا۔ ان کی زندگیوں میں اتنی مداخلت۔ دروازے میں کھڑی جنتی کی آنکھوں سے نکلتے شعلے کچھ ایسا ہی بیان دے رہے تھے۔ دونوں نے اسے دیکھا۔ وہ دھاڑ سے دروازہ بند کرتی سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وہ دھپ سے بینچ پر بیٹھی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے دھواں دھار رونے لگی۔ اس کا پورا وجود ہل رہا تھا۔ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ برابر بیٹھے ہیری نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ اسے بے پناہ ترس آ رہا تھا۔ وہ تو پہلے ہی زود رنج ہو رہا تھا کہ اب وہ بھی۔ دونوں دکھی تھے۔ وہ اس کے پاس اپنا دکھ بانٹنے آئی تھی۔ دنیا میں سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ بس وہ دونوں رہ گئے تھے اور ان کا غم۔ ہاتھ میں تھامی بوتل اس نے پرے اچھال دی۔ جو پچھلی کیاری سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ فضا میں ایک چھناکا ہوا۔ پھر دوسرا۔

"سالی۔ ہمیں رلاتی ہے۔ ہمیں توڑتی ہے۔ کوئی ہمارا نہیں بنتا۔ اب میں توڑ دوں گا سب کو۔ نہیں چھوڑوں گا کسی کو بھی۔ ریجیکٹ کی تو۔ مجھے ریجیکٹ کیا اس نے مجھے۔"

ایک اور چھناکا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس نے آتے دیکھا ہی کب تھا کہ رات کے اس پہر ہیری لان میں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ وہ ڈیڈ اور ضومیر سے لڑ کر گھر سے نکل آئی تھی اور روتے ہوئے اس کے پاس چلی آئی جو لگ رہا تھا اپنا ہی کوئی غم غلط کر رہا ہے۔

"دنیا ظالم ہے۔ ہمارے پیچھے پڑی ہے۔ ہمیں رلاتی ہے۔ تم دیکھنا میں سب کو مار دوں گا۔ اور تمہارا بدلہ لوں گا۔ کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔ تم میری جان۔ بس تم نہ رو۔" وہ واقعی حواسوں میں نہیں تھا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اوپر جھک آیا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ اس نے کراہیت سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

"ہیری۔ واٹس رونگ ود یو۔ کیا بکواس کر رہے ہو۔ ہوش میں آؤ۔" وہ چلائی تھی۔ لیکن وہ سنتا تب نا۔ وہ اسے بازوؤں میں دبوچ چکا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح پھڑپھڑائی۔ وہ جیسے کسی آہنی گرفت میں تھی۔ ایسی بے بس کیفیت میں اسے ایک اور بھیانک منظر یاد آیا تھا۔ سفید چہرے اور نیلی آنکھوں والا ایک بدصورت دیو اس کی گردن پر چھوٹا سا چاقو رکھے ہوئے تھا۔ وہ ڈر بھی گئی تھی۔ لیکن وہ چپ نہیں رہی تھی اس نے ماما کو آوازیں دی تھیں۔ وہ پوری قوت

اور اکھٹے پل اس نے دیکھا تھا آندھی طوفان کی طرح اندر آتے ڈیڈ نے اس شخص کو لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا تھا۔ اگر خدانخواستہ ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو..... اتنے سالوں سے اب تک وہ اس ہولناک لمحے کے حصار سے نہیں نکل پائی تھی۔

وہ لمحہ ایسا منحوس ثابت ہوا تھا کہ ان کے سروں پر سیاہ بادل بن کر چھا گیا تھا۔ ان کا بسا بسایا گھر اجڑ گیا۔ ڈیڈ غم اور غصے سے اتنے پاگل ہوئے کہ اس سب کا ذمہ دار ماما کو ٹھہرا کر اپنی زندگی سے نکال باہر کیا۔ وہ ایک پل ان کا عمر بھر کا جینا محال کر گیا تھا۔ ان مٹ سیاہی کی جیسے۔ گہرے داغ کی طرح دلوں پر ثبت ہو گیا تھا۔

اسے وہ سب بھولا نہیں تھا۔ کہ آج ایک بار پھر ویسا ہی خوف اس کی رگوں میں گردش کرنے لگا۔

"اف۔ نہیں۔" پورا زور لگا کر اپنا آپ چھڑاتے وہ چیخی تھی۔ ہری کی گرفت ڈھیلی پڑی اور وہ منہ کے بل جا گری۔ میز کا کونا اس کے سر پر لگا تھا۔ حواس کھونے سے پہلے اس نے دیکھ لیا تھا، ضومیر تیر کی رفتار سے بھاگتا آ رہا تھا اور اس پر جھکتے ہری کو اس نے پیچھے سے کھینچ کر دور پھینکا تھا۔

☆☆☆

ضومیر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ ہاتھ میں پکڑی ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی۔ کھڑکی کے پردے ہٹائے۔ سارا اندھیرا پل میں چھٹ گیا۔ تازگی اور توانائی دیتی کرنیں بیڈ تک بھی آئی تھیں اور بند پلکوں کو شرارتی بچے کی طرح گدگدانے لگیں۔ جنت نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا اور سوتی بنی رہی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گلا کھنکھارتا گویا ہوا۔

"میں جانتا ہوں تمہیں اچھا نہیں لگتا صبح سویرے میری شکل دیکھنا۔ لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔ ڈیڈ کی تسلی کے لیے مجھے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ مگر گھبراؤ مت کچھ ہی دنوں کی بات ہے پھر ہو سکتا ہے میں اپنے ملک واپس چلا جاؤں۔ ملیحہ کی شادی ہے اور اس ذمہ داری سے بھی بہت سے کام میرے منتظر ہیں۔ نمٹانے میں وقت لگ سکتا ہے۔ پھر جب ختم ہو جائے گا تو ہو سکتا ہے میں وہیں رک جاؤں۔ ممکن ضرور ہے۔ ہمارا نکاح اور جو ڈیل تم نے کی تھی، اس کے پیپرز میں نے دراز میں رکھ دیے ہیں۔ تم چاہو ان پر سائن کر کے اس کاغذی رشتے سے آزاد ہو جانا اور پلیز اپنے دل سے آنٹی کے لیے کدورت دور کر کے ایک بار ضرور سوچنا۔ وہ بہت دکھ جھیل چکی ہیں اور ڈیڈ بھی تھک گئے ہیں۔ آج نہیں تو کل تمہیں اپنی نئی زندگی کی شروعات کرنا ہی ہے۔ جب تم مصروف ہو جاؤ گی تب کوئی تو ہو جو ان کا خیال رکھ سکے۔ بہت تنہائیاں کاٹ چکے وہ۔ کیا وہ اکیلے ہی رہیں گے؟ اور کیا آنٹی باقی ماندہ عمر اولڈ ہاؤس میں گزاریں گی؟ وہ ماں ہیں تمہاری کیا تم تصور بھی کر سکتی ہو؟" وہ پوچھ اس سے رہا تھا اور رخ اب بھی کھڑکی کی جانب تھا۔ وہ کب سے اسی طرف منہ کیے بولتا جا رہا تھا۔ اسے دیکھا ہی نہیں۔ اگر دیکھتا تو جان لیتا۔ اس نے نچلا لب دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ ضبط سے سرخ پڑتے عارض۔ بازو کے تلے چھپی بھیگی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک لکیر بھی بالوں میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔

تو کیا ایک بار پھر نحوست کا اژدہا اس کی زندگی کے سب رنگ چرا لے جائے گا اور وہ خالی ہاتھ روتی کرلاتی رہ جائے گی؟ کیا رات کے اندھیرے پھر سے اسے ڈرایا کریں گے؟ جب وہ ماما کو پکارا کرتی تھی۔ اور اب کس کے نام کی فریاد کیا کرے گی؟ اس وقت وہ کم سن اور نا سمجھ تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے سب بکھر گیا اور وہ دیکھتی رہی۔ لیکن اب تو سمجھدار اور باشعور ہے۔ اب کی بار گھر ہی نہیں بکھرے گا۔ دل بھی اجڑ جائے گا اور کیا وہ یہ صدمہ سہہ لے گی؟

اس نے تڑپ کر آنکھوں سے بازو ہٹایا۔ لیکن کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ جا چکا تھا۔ اس کے کلون کی دلفریب مہک سانسوں میں اتر رہی تھی۔ چادر ہٹائی وہ تیزی سے بیڈ سے اتری اور اس کے پیچھے ہی باہر بھاگی تھی۔ کچن کاؤنٹر کے پاس آنٹی کھڑی تھیں جو اسے یوں بوکھلاتے ہوئے آتے دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ لپک کر اس کی طرف آئیں۔

"جنت آر یو اوکے؟ واٹ ہیپنڈ؟" اسے بازوؤں سے تھامے وہ پوچھ رہی تھیں۔ پھر یک دم جیسے یاد آنے پر پیچھے ہٹ گئیں۔ اس کا کیا بھروسا ابھی چلانا شروع کر دے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا وہ جلد ہی یہاں سے چلی جائیں گی۔ بس اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار تھا۔ ماں تھیں۔ وہ گھبرائی ہوئی اسے دیکھ رہی تھیں اور اس کی نظر بھی ان کے چہرے پر تھی۔ پلکوں تلے ڈھیر سارا پانی اکٹھا ہونے لگا۔

"ماما" اس کے لب بے آواز ہلے تھے۔

لیکن ماں کے دل نے پکار سن لی تھی۔ مارے خوشی کے ان کے ہونٹ بھی سل گئے۔ بانہیں پھیلا کر اسے خود میں سمیٹ لیا۔ برسوں کا غبار دھل رہا تھا۔

☆☆☆

وہ کب سے اپنے ہاتھوں پر نظر جمائے بیٹھی تھیں۔ سب لفظ گونگے ہو گئے تھے۔ ذہن خالی سلیٹ سا۔ بس دل۔ ہاں بس دل تھا جو اتنے ادوار سے گزر کر بھی دھڑک رہا تھا۔ ٹپ ٹپ گرتے آنسو ہاتھوں کی پشت پر جا گرے۔

"اونہوں۔ اب یہ آنسو نہیں۔ بھول جاؤ سب۔ بہت رو چکے تم۔" انہیں سمیٹ کر ایک ساتھ لگا گئی۔

"تم بہت اچھے ہو عومر حبیب۔" گو کہ یہ اعتراف نیا نہیں تھا۔ ان کی خوبیوں کی معترف تو وہ بہت پہلے سے تھیں۔ لیکن آج ایک بار پھر ان لفظوں کو دہرانا اچھا لگا تھا۔ وہ ہنس دیے۔

"اتنی عمر گزر گئی اور تمہیں میرا نام ٹھیک سے لینا نہیں آیا۔"

"مجھ بدنصیب کو تو محبت بھی ٹھیک سے کرنا نہیں آئی۔ عمر بے کار ہی گزار دی۔ تم نے مجھے معاف تو کر دیا ہے نا عومر حبیب؟" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھ رہی تھیں۔

"ہمارا ایک ساتھ ہونا کیا اس بات کی دلیل نہیں؟" وہ ہولے سے اثبات میں سر ہلاتے مسکرا دیے۔ عمر حبیب بھی مسکرا رہے تھے اور دل کو یقین تھا زندگی بھی مسکرانے لگی ہے۔

☆☆☆

وہ سب ڈنر ٹیبل پر اکٹھے بیٹھے تھے۔ جب ضومیر نے بتایا کہ وہ کچھ دن تک پاکستان جا رہا ہے۔ اس نے سنا تو منہ تک نوالہ لے جاتا ہاتھ راستے میں ہی رک گیا۔ دل ڈوب کے ابھرا تھا۔ بہانے بہانے سے اسے مخاطب کرنے والا ضومیر ہاشمی جیسے کہیں گم ہی ہو گیا تھا۔ وہ خود کو اتنا بزی رکھتا تھا کہ ان کا سامنا نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ آج جانے کتنے دن بعد وہ اسے ٹیبل پر دیکھ رہی تھی اور محسوس ہوا تھا کہ جیسے جلتی آنکھوں پر کسی مہربان نے برف کے پانی میں بھیگا پھایا رکھ دیا ہو۔ تراوٹ روح تک سرشار کر گئی تھی۔ اسے چپکے چپکے دیکھنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ کیا وہ سچ مچ چلا جائے گا۔ اب وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھے جا رہی تھی۔ جو مزے سے ڈنر انجوائے کر رہا تھا۔

"آپ اکیلے ہرگز نہیں جا سکتے ڈیئر برو۔ کیا آپ اپنا وعدہ بھول گئے؟ آپ نے کہا تھا ملیحہ کی شادی پر میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے وہاں کی شادی دیکھنا ہے۔ اف۔ کس قدر کلر فل شادیاں ہوتی ہیں وہاں کی۔ دھوم دھڑکا' ہنگامے' رنگین' مزے مزے کے کھانے' اور..... مجھے وہ سب انجوائے کرنا ہے اور مجھے ڈیڈ کا وہ گھر دیکھنا ہے جہاں ان کی زندگی کے کئی برس گزرے۔ کیوں ڈیڈ میں جا سکتا ہوں نا؟" وہ ان سے اجازت چاہ رہا تھا۔ انہوں نے جوش سے سرخ پڑتے اس کے چہرے کو محبت سے دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔

...جاتے ہو گئے ہیں۔ اور تم میرے گھر ضرور جانا اور وہاں اپنے چچا جان اور ان کی فیملی سے بھی ملنا۔"

"واؤ۔ رئیلی۔ آپ کے بھائی بھی ہیں ڈیڈ؟ آپ نے پہلے کبھی بتایا نہیں؟" اس کا جوش کچھ اور بڑھا تھا۔

"بس یونہی پہلے کبھی ہمارے درمیان ایسا کوئی تذکرہ نہیں ہوا نا۔ چھوٹا بھائی ہے وہ میرا اور ہماری اماں جی اسے پیارے تارا کہا کرتی تھیں اور مجھے۔"

"اور آپ کو چاند۔" گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے ماریانہ ان سے پہلے بول پڑیں۔ انہیں خوش گوار حیرت نے گھیرا۔

"تمہیں یاد ہے؟ یہ تو میں نے تمہیں ہماری دوسری ملاقات میں بتایا تھا۔ اس ریسٹورنٹ میں جب۔"

"جی مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے اور مجھے تو یہ بھی یاد ہے آپ اپنی اماں جی کے بہت تابع دار اور فرماں بردار بیٹے ہوا کرتے تھے اور تارا اتنا ہی ضدی اور شرارتی اور اس کی کسی ضد کی وجہ سے ہی آپ دونوں بھائیوں میں ناراضی ہو گئی تھی۔"

ماریانہ کو سب یاد تھا اور بھولے تو وہ بھی نہیں تھے۔ مگر زندگی نے اتنا تو اچھی طرح سمجھا ہی دیا تھا۔ آصف ان کا مقدر تھی ہی نہیں۔ ان کا نصیب تو اسی عورت سے جڑا تھا جو دوسری بار پھر ان کے نکاح میں آ گئی تھی اور جب ہم تقدیر سے لڑ نہیں سکتے تو اپنے ہی جیسے کسی انسان سے لڑ کر کیا حاصل؟ بس یہی وجہ تھی انہوں نے اپنے دل سے ہر کدورت مٹا ڈالی تھی۔ بھائی نے اتنے سالوں میں کوئی خیر خبر نہیں لی تھی۔ لیکن ان کی ہڑک جاگ گئی تھی۔

"واؤ...... اٹ مینز مام کہ ڈیڈ نے خود ہی اپنی تعریفیں کر کے آپ کو انسپائر کیا تھا۔ لو جی یہ تو اب میں چچا جان سے مل کر باقی کا قصہ سنوں گا۔ کیوں ڈیڈ آئی ایم رائٹ؟"

میک کے شرارت بھرے لہجے نے انہیں چونکایا تھا۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اسے پیار بھری ایک چپت لگائی۔ وہ سب ہنس بول رہے تھے۔ بس اگر جنت عمر تھی جس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ اس کی پلکوں پر منوں وزنی بوجھ پڑا تھا۔ جب برداشت نہ رہی تو اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی پلیٹ میں سب ویسے ہی پڑا تھا۔ ماریانہ نے اسے جاتے دیکھا اور پھر ضومیر کو جو پورے دھیان سے اسموکڈ چکن کے ساتھ انصاف کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے لیے اس کے روم میں آ گئی تھیں۔ حسب توقع اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ انہیں بے اختیار اس پر پیار آیا۔

"جنتی میری جان۔ کھانا کیوں نہیں کھایا تم نے؟ سب ویسے ہی چھوڑ آئیں؟ یہ لو میں کھانا یہیں لے آئی ہوں اور میں اپنی گڑیا کو اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔"

"کچھ نہیں کھانا مجھے۔ پلیز مام لے جائیں یہ سب۔ آپ بھی چلی جائیں۔ پلیز لیو می الون۔" وہ حد درجہ نروٹھی ہو رہی تھی۔ کتنے ہی آنسو قطار در قطار رخسار پر ڈھلک آئے۔

"اس طرح رونا مسئلے کا حل تو نہیں ہے نا میری جان۔ تم دونوں کے درمیان آخر چل کیا رہا ہے۔ بات کرو اس سے۔ وہ کیوں خفا ہے تم سے؟" ماریانہ بہت دن سے سنجیدگی سے سوچ رہی تھیں کہ عمر حبیب کو بتائیں تاکہ وہ خود ان دونوں کی رنجشیں دور کریں۔

"میں کس منہ سے بات کروں مام۔ اسے میں نے خود خفا کیا ہے۔ سب میری غلطی ہے۔ میں نے بہت تکلیف دی ہے اسے۔ بہت بری ہوں۔ وہ چلا جائے گا مجھے چھوڑ کر۔ میں ہوں ہی اس قابل۔ آپ کو پتا ہے مام۔"

اور دھواں دھار روتے، ہچکیاں لیتے، سسکیاں بھرتے اس نے سب کہہ سنایا۔

"او مائی گاڈ۔ اتنی بڑی حماقت کیوں کی تم نے؟" اور وہ کیا جواب دیتی۔ اس کے بے دریغ آنسو سب کہانیاں سنا تو رہے تھے۔ اس کا ڈر اس کا خوف، وہ بے اعتباری ہی تو تھی جو اس نے اپنے خود پر خوشیوں کا دروازہ بند کیے رکھا۔ وہ جو سمجھتی تھی وہ ویسا بالکل نہیں تھا۔ ہاں جیسا ڈیڈ نے بتایا تھا وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ سچا، کھرا اور خلوص سے بھرا۔ ماریانہ نے بے تابی سے اپنی نادان شہزادی کو گلے لگایا۔

"یہ سب میرا قصور ہے۔ مجھے معاف کر دو میری بچی۔ جن بیٹیوں کی مائیں اچھی نہ ہوں نا وہ بھی بدنصیب ثابت ہوتی ہیں۔ تم رو مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ضومیر بہت پیارا انسان ہے۔ بہت پیار کرتا ہے وہ تم سے۔ تم نے اس سے جو بھی ڈیل کی تھی وہ سب فضول ہے۔ اس کاغذ کی حقیقت ہی کیا ہے۔ پھاڑ کر پھینک دو۔ بس قصہ ختم۔ اصل کاغذ تو وہ ہے نا جسے نکاح نامہ کہتے ہیں۔ یہ اللہ کے دربار میں درج ہوا وہ عہد ہوتا ہے جسے اسی کے حکم سے زمین پر دہرایا جاتا ہے۔ تمہارا دل اسے قبول کر چکا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی ہو گی۔ بس ہو گیا فیصلہ۔ تم نے اسے ناراض کیا ہے تم ہی اسے مناؤ گی۔ وہ اکیلا کہیں نہیں جائے گا۔ تم اس کے ساتھ جا رہی ہو۔ اٹھو تیاری کرو اپنی۔"

"بٹ مام۔۔"

"شش بس چپ۔"

☆☆☆

زرد رنگ کی شارٹ شرٹ، کاسنی امبرائیڈڈ کیپری کے ساتھ ہم رنگ شیفون کا دوپٹا۔ جو اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ دوسرے بازو پر بڑا سا ہینڈ کیری بیگ، دل نشیں صورت پر چھایا ہوا خوف، اڑی ہوائیاں اور اس کی ہمراز نہیں پریشان۔ ان سے زیادہ وہ خود پریشان تھی۔ وہ انہیں سمیٹے، دوپٹا لپیٹے یا پھر اس ہینڈ کیری کو قابو کرے۔

"اف۔ مام بھی نا۔ ایک نہیں سنی تھی انہوں نے اس کی اور یہ حلیہ بنا کر بھیج دیا۔"

"یا اللہ کیا کروں میں۔" وہ عاجز آئی ہوئی جیسے رنگین پری کی طرح دور سے اڑتی آ رہی تھی۔

میک نے دیکھا اور برابر بیٹھے ضومیر کو کہنی مار کر متوجہ کیا۔ جس نے بے دھیانی سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی خواہش تھی اسے مشرقی لباس میں دیکھنے کی اور آج تمنا بر آئی تھی اور کچھ یوں کہ... حیران سے شادمان ہو گئی۔ مگر وہ ضومیر ہی تھا اپنے احساسات کو قابو میں رکھنا آتا تھا اسے اور... جتا جو نے جتنے ظلم اس کے دل ناتواں پر کیے تھے... جتنا اس کا ضبط آزمایا تھا۔ اب وہ اتنی آسانی... معاف کرنے والا نہیں تھا۔

وہ پھر سے منہ پھیرے میگزین پر جھک گیا۔... ان کے نزدیک آ چکی تھی۔ میک نے اٹھ کر اس... ہاتھ سے ہینڈ کیری پکڑا۔ اس نے زمین پر گھٹنا... اٹھا کر بے تکے پن سے اپنے گرد ایک اور بل دیا... گالوں کے بوسے لیتی آوارہ لٹوں کو اک ہاتھ... کان کے پیچھے اڑسا اور اس کے ساتھ والی سیٹ... گرنے کے سے انداز سے بیٹھی۔ اسے دیکھ کر... نوازی سے مسکرائی۔ چند دن پہلے وہ یہ مسکراہٹ... کرتی تو وہ سو جان سے فدا ہو جاتا۔ اب یو... دیکھا جیسے کسی اجنبی کو دیکھا جاتا ہے اور میگزین... سے چہرے کے آگے۔ جنت عمر کا سارا اعتماد... ہونے لگا۔ اس کی بے اعتنائی سے بکی کا احساس... تھا۔ پلکیں ضرور بھیگ جاتیں۔ لیکن مام کی تھپکی... کے شانے پر تھی۔

(شرمانا ضرور۔ مگر گھبرانا نہیں۔ وہ جز بز... تمہارا۔ تھوڑا سا اپنی ٹیوڈ دکھانا تو یوں بھی اس کا... بنتا ہے۔ کچھ کم تو نہیں کیا نا تم نے اس کے ساتھ... نہ بولے تو خود کوئی بھی بات کرنا۔ بس اس کی توجہ... ادھر ادھر ہوتے دیکھ۔ انڈر اسٹینڈ)۔

"کیا پڑھ رہے ہو؟" اس نے ہاتھ بڑھا... یوں میگزین لیا گویا پرانی بے تکلفی ہو۔ ضومیر کی... اپنے خالی رہ جانے والے ہاتھوں پر ہی رہ... جواب ندارد۔ نہ ہی میگزین واپس لیا گیا۔ یا... سے سیل فون نکالا۔

"کتنا ٹائم رہ گیا ہے فلائٹ کے جانے..."

وہ قریب ہوئی موبائل کی اسکرین پر جھک آ...

جیسے اس کے ساتھ لگ جانے سے کرنٹ لگنے کا خدشہ ہو۔ وہ خفیف سی ہوتی پیچھے ہٹی۔

"خفا ہو مجھ سے؟" نہایت معصومیت بھرا سوال آیا تھا۔ ضومیر نے بھنویں اچکا کر دیکھا۔

"فار واٹ؟"

"وہ کل تم نے دیکھ لیا تھا۔ ہری مجھ سے بات کرنا چاہ رہا تھا اور تمہیں آتے دیکھ کر چلا گیا۔ وہ تم سے ڈر گیا ہے۔ تم نے اس کی دھلائی بھی تو بہت کی تھی نا۔ اس کے زخم تو ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئے۔ ایکچلی وہ اپنے اس دن کے بی ہیویر پر سوری کر رہا تھا۔ لیکن مجھے اس پر بہت غصہ ہے۔ میں نے اسے معاف نہیں کیا۔ اچھا کیا نا؟"

وضاحت کے ساتھ وہ ایک اور معصوم سا سوال کیا گیا تھا۔ اس نے فقط کندھے اچکا دیے۔ وہ سامنے ڈیپارچر لاؤنج میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا اور وہ اسے۔ وہ اس کا تھا اور کیسی بے دید تھی وہ۔ کبھی نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔ دیکھ لیتی تو جان جاتی کہ وہ تو اچھا خاصا ہینڈسم ہے۔ اس کا اک اک نقش دل موہ لینے والا تھا۔ چمکتی فراخ پیشانی اس کے عمدہ اوصاف بتا رہی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں ایک عجب نرم سا تاثر تھا۔ جو درحقیقت اس کی پوری شخصیت کا ہی خاصا تھا۔

"یہ لو بس! آئس کریم کھاؤ۔ تمہاری فیورٹ۔" میک نے اسے چونکایا۔

"تمہیں کیسے پتا یہ میری فیورٹ ہے؟" وہ اپنا آپ سنبھال چکی تھی۔

"ضومیر بھائی بتا رہے تھے۔ انہوں نے اکثر تمہیں یہی فلیور کھاتے دیکھا ہے۔" میک نے بتایا۔ اس کی دھڑکنیں ایک بار پھر زیر و زبر ہوئی تھیں۔ مارے خوشی کے سانس تھمنے لگی۔

"ارے واہ۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تمہیں میری پسند کا علم ہے اور کیا کیا پسند ہے مجھے۔ کیا کیا جانتے ہو؟" لہجہ اشتیاق سے لبریز تھا۔ اس نے پھر شانے اچکا دیے۔

"میرے پاس تو اکثر اپنے لیے وقت نہیں ہوتا۔ میں کسی ایکس وائی زیڈ کی پسند کیسے جان پاؤں گا۔ آئس کریم کا تو اس لیے علم ہوا کہ ہری کے ساتھ تمہیں دو چار بار کھاتے دیکھا تھا۔"

اس بے درد نے یقیناً کوئی پرانا بدلہ چکایا تھا اور کیا ہی بدلا لیا تھا۔ جنت عمر کا دل چاہا آئس کریم کھینچ کر فرش پر دے مارے۔

☆☆☆

"امی۔ امی۔ ناشتا تیار ہے؟ ملی میرے کپڑے پریس ہو گئے؟ معیز میرے جوتے لے کر آؤ۔ اچھی طرح پالش کیے ہیں نا۔ یاد رہے جوتے میں سامنے والے کی شکل نظر آنی چاہیے اور اگر ایسا نا ہوا تو پھر تمہاری خیر نہیں اور شی تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو بھاگو میرے روم کی صفائی کر دو جا کر۔" گرے ٹراؤزر اور ریڈ ٹی شرٹ پہنے اس عام سے حلیے میں بھی خاص دکھتا وہ سیڑھیاں اترتا گھر کے ایک ایک فرد کو پکارتا آ رہا تھا اور سارے کے سارے حاضر بھی ہو گئے۔

"ناشتا بالکل تیار ہے بیٹا۔ ٹیبل پر آ جاؤ میرے بچے۔" نگہت کہہ رہی تھیں۔

"بھائی آپ کا ڈریس ریڈی ہے۔ آپ کے روم میں رکھ آئی ہوں۔" ملی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی۔

"بھائی! شوز آپ کی حسب خواہش چمکا کے رکھ دیے ہیں۔ اگر سامنے والا دیکھ کر اپنے بال نہ سنوارے تو پیسے واپس۔" یہ معیز کا جواب تھا۔ اس نے شی کو دیکھا۔ جو ابھی تک اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی۔

"اچھا۔ اچھا نا جا رہی ہوں۔ ایسے تو مت دیکھیں۔" اگلے ہی پل وہ بے چاری بھی گھبرا کر میدان چھوڑ گئی۔ وہ اپنی ماں کا لاڈلا سپوت تھا۔ جو ہل کر پانی نہیں پیتا تھا۔ مگر پھر قدرت اٹھا کر پردیس لے گئی۔ چار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا اسے سوئی سے لے کر سلائی تک سارے کام خود ہی سر انجام دیتے۔

اور لڑکی رسان حال تک نہ تھا۔ جیسے کو اس کی شادی بھی ہوئی تھی۔ مگر آ وہ کے ہاتھ نہ آیا۔ ایک ظالم سے زندگی کے تار جڑ گئے۔ جس نے جھکنے پر جھکا ہی دیا تھا اور اب وہ وہی سب پرانے دن چاہتا تھا۔ وہ ٹیبل تک کے بجائے صوفے پر پاؤں پسار کے بیٹھ گیا۔

"کیا ٹھاٹ ہیں برو۔" میکائیل نے شانہ ہلایا۔ نگہت ماتھے پر شکن ڈالے بنا اس کا ناشتا ادھر لے گئیں۔ ٹیبل پر جنت عمر تنہا رہ گئی تھی۔ گھر کا گھر اس کی ناز برداریوں میں لگا تھا۔ اس کی الائچی کی خوشبو سے مہکتی چائے یک دم ہی بدمزہ ہو گئی تھی۔ ذرا بابا کہ نگہت نے آواز دی۔

"ارے جنا آ جاؤ تم بھی یہاں۔ میاں کے پاس بیٹھ کے ناشتا کرواؤ۔"

"کیا اپنے ہاتھ سے؟" میک کی شرارت بھری سرگوشی صرف ضومیر ہی سن پایا تھا۔ جو برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

"ایسے اپنے نصیب کہاں۔"

"مجھ سے کچھ کہا۔"

نگہت نے اس کے لب ہلتے دیکھے تھے۔

وہ اس کے بالکل عین سامنے صوفے پر بیٹھی۔ دھانی رنگ کے لباس میں نکھری ستھری۔ جسے ایک نظر کے بعد ارادتاً دوسری نظر دیکھنے کو جی چاہے۔

"امی! آج ہمارے کیس کی ہیئرنگ ہے۔ لیکن اس سے پہلے مجھے ذرا طارق سے ملنے جانا ہے۔"

وہ ماں سے مخاطب تھا۔ وہ جو کارپٹ کے ریشے پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ چونک کر سر اٹھایا۔ اس نے خاص طور پر اس کے سامنے جو اتنے اہتمام سے نام لیا تھا تو کون تھی وہ۔ کیا کوئی پرانی آشنا؟ جس سے دشمن آتے ہی ملنے کی ہڑک جاگ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے کسی اور کا نام سننا کتنا برا لگا تھا اور اگر سچ میں کوئی ہوئی تو۔

اف۔ وہ اس پل بالکل بھول گئی تھی کہ اس نے تو صرف ابھی کسی کا تذکرہ ہی کیا ہے اور اس کی جان نکلنے کو ہے۔ یہ اسے ایک جیتے جاگتے وجود کے ساتھ دیکھ کر اس پر کیا بیتی ہوگی؟ نگہت کے ماتھے پر شکن پڑ گئی۔

"تو ان سے کیوں ملنے جانا ہے تم نے؟"

"ارے امی مت پوچھیں۔ اس نے کتنی فون کالز کی ہیں مجھے۔ میرا تو سونا جاگنا دوبھر کر دیا اس لڑکی نے۔ لیکن میں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ میں تو اس خاندان سے اب ہر بات عدالت کے تھرو ہی کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن چھتیں انکل نے بتایا کہ پچھلی تین پیشیوں پر کوئی نہیں آیا اور اس بار نوٹس کے بعد باپ کی بیماری کا سرٹیفکیٹ جمع کروا دیا ہے۔ میں اب یہی جاننا چاہ رہا ہوں کہ اب کیا ڈھونگ کر رہے ہیں وہ لوگ۔"

"حد ہے ذلالت کی۔ اللہ ہی غارت کرے اس طارق حبیب کو۔ ہماری حق حلال کی کمائی، تمام عمر کی پونجی کھا گیا بدبخت۔ اس ڈھیٹ انسان کو کیا ہوتا ہے۔ یہ ان کا کوئی نیا ڈرامہ ہوگا۔" ان کے لہجے میں تنفر بھرا تھا۔ میک جو ابھی موصول ہوا میسج پڑھ رہا تھا۔ کچھ چونکتا انہیں دیکھنے لگا۔

"ابھی کیا نام لیا آپ نے۔ طارق حبیب؟ یہ کون ہیں؟ عجیب اتفاق ہے۔ ڈیڈ نے اپنے بھائی کا ایڈریس سینڈ کیا ہے اور ان کا نام بھی طارق حبیب ہے۔"

"اچھا۔ دکھاؤ مجھے۔" ضومیر نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لیا اور اگلے لمحے وہ نگہت کو دیکھ رہا تھا اور وہ ان سب کو۔

☆☆☆

طارق حبیب عرف تارا۔ جسے ماں باپ نے بہترین تربیت ہی دینا چاہی ہوگی۔ مگر جو صرف اپنی ہی کے ہاتھوں شر کی گہری کھائی میں اترتا چلا گیا۔ بچے کی تربیت کے ذمے دار صرف والدین ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ خاندان، محلہ اور سارا معاشرہ حصہ دار ہوتا ہے۔ اسے بچپن سے اس کی کم صورتی کا احساس دلانے والے ماں باپ تو نہیں تھے نا۔ ماں تو ہمیشہ میرا تارا

بس خوا مخواہ کا بیر پالا تو اس معاشرے نے۔ جو صرف ظاہری حسن و خوبصورتی کے عشق میں کچھ اتنا اندھا ہو چکا ہے جو جانتا ہی نہیں اس کے بدصورت رویے کس طرح گھر اجاڑ دیتے ہیں۔

شکیل ہاشمی (ضومیر کے والد) بھلے مانس آدمی تھے۔ جو طارق حبیب کی چلتر بازیاں جان ہی نہ سکے اور باپ سے ملنے والا سارا ترکہ اس کے ہاتھوں پراپرٹی خریدنے میں لگا دیا۔ یہ تو بعد میں خبر ہوئی کہ وہ ساری کاغذی کارروائی جعلی تھی۔ ان کے شور مچانے پر طارق حبیب انہیں قتل کی دھمکیاں دینے پر اتر آیا۔ یہی صدمہ ان کے ہارٹ فیل کا سبب بنا۔ مال تو گیا ہی جان بھی گئی۔ وہ تو اللہ مسبب الاسباب ہے۔ جس نے اتنا کچھ چھن جانے کے بعد اپنی نعمتوں سے نواز دیا۔ طارق حبیب نے بھی جو بویا وہ کاٹنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ ساری زندگی دلوں کو دکھانے کے سوا کیا ہی کیا تھا اس شخص نے۔ جسے ایک چھوٹے سے ایکسیڈنٹ نے بستر پر لا ڈالا۔ کمر پر ایسی ضرب پڑی کہ ریڑھ کی ہڈی جگہ چھوڑ گئی۔ وہی پیسے اب بیماری پر لگ رہے تھے۔ بیٹوں نے یہ صورت حال دیکھی تو باقی ماندہ بچے مال کی بندر بانٹ کر لی اور دور ہو گئے۔ برے وقت میں بیٹے تو چھوڑ گئے۔ بیٹی کہاں جاتی۔ وہی فریاد لے کر دوڑتی پھر رہی تھی۔

ضومیر کے وکیل سے نمبر لے کر اسے کال کرتی رہی۔ گھر بھی گئی۔ جنت نے اندر نہ گھسنے دیا۔ اب وہ سامنے بیٹھی رو رو کر سب مجبوریاں سنا رہی تھی اور دیکھنے سننے والوں کے دل شق ہو رہے تھے۔

"بس بیٹا یہ سب ان کی کرنی کے پھل ہیں۔ ہم بدنصیبوں کو تو خبر ہی نہیں تھی کہ یہ اتنا پیسہ آتا کہاں سے ہے۔ ہمیں تو یہی کہتے رہے کہ کاروبار کرتا ہوں۔ سارے بھید تو ان کی بیماری کے بعد کھلے۔ بیٹے اسی ذلت و رسوائی سے بچنے کے لیے گھر چھوڑ گئے۔ کس کس سے منہ چھپاتے۔ ساری مصیبت سہنے کو ہم ماں بیٹی رہ گئیں۔ بتاؤ کہاں جائیں ہم۔ سر چھپانے کو بھی ایک ٹھکانا بچ گیا ہے۔ اس سے تمہارا کچھ نقصان پورا ہو تو بے شک لے لو۔" طارق حبیب کی بیوی گھٹنے کے ساتھ ضومیر سے کہہ رہی تھیں۔ جس کے پاس کوئی بھی کچھ نہ بچا تھا۔

"میں سمجھتا رہا کہ میں اپنے ساتھ برا کرنے والوں سے بدلہ لیتا ہوں۔ مگر کیا پتا تھا۔ میں اپنے ساتھ ہی برا کرتا ہوں۔ ساری عمر اپنے پیاروں کو دکھ دیے۔ بہت گناہ کیے میں نے۔ اب جبر یاد ہوگی؟ جس جس سے معافی مانگوں گا میں۔ کوئی معاف نہیں کرے گا مجھے۔ چاند بھائی بھی نہیں۔"

طارق حبیب اپنے سر پر ہاتھ مار رہے تھے۔ جنت اور میک پریشان کن نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ وہ تو اپنے چچا سے ملنے آئے تھے۔ کیا خبر تھی۔ وہ اس حال میں ملیں گے۔ ضومیر کا مجرم اس کے ڈیڈی کا بھائی ہے۔ ان کے لیے تو شرمندگی کا مقام تھا۔ جنت تو اٹھ کر ہی چلی گئی۔ ضومیر کا سامنا کرنے کا سوچ کر ہی اسے جھرجھری سی آ رہی تھی۔ میک ڈیڈ کو کال ملا رہا تھا۔

☆☆☆

وہ ماں کا چاند تھے اور چاند تو اپنے قریب آنے والے تارے کو بھی جگمگا دیتا ہے۔

انہوں نے ضومیر سے کہا تھا۔

"بیٹا! میں تمہارے والد کو تو واپس نہیں لا سکتا۔ لیکن تمہارا مالی نقصان ضرور پورا کر سکتا ہوں۔ تم اللہ کے واسطے طارق کو معاف کر دو۔ میں اس کا علاج کرواؤں گا۔ پلیز تم اسے میرے پاس بھیجنے کے تمام انتظامات کروا دو۔"

"مال و دولت تو آنی جانی چیز ہے۔ جو میرے نصیب کا ہے، وہ مجھے ملتا رہے گا اور رہی بات میرے والد کی تو وہ بھی مجھے مل چکے ہیں۔ ڈیڈ آپ ہیں نا میرے پاس۔" ضومیر کے جواب نے ان کا دل شاد کر دیا تھا۔

"جیتے رہو میرے بچے! تم تو اللہ کا انعام ہو میرے لیے۔ سدا خوش رہو۔"

"ہو آپ کی بیٹی رہنے دے تب نا۔" ایک آہ بھر کے وہ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن چپ رہا۔

"میری بیٹی بے حد حساس ہے۔ طارق کے جانے کے بعد بہت ڈسٹرب ہو گئی ہے وہ۔ وہ گلٹی فیل کر رہی ہے۔ اس کا خیال رکھو بیٹا۔ اسے سمجھاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"جی جو حکم۔"

☆☆☆

اور ان کے حکم کی پاس داری کرتا ہی وہ اس کے پاس آیا تھا۔ سارے گھر میں رونقیں بکھری تھیں۔ کل سے شادی کی تقریبات شروع ہو رہی تھیں۔ سب ہی مصروف تھے اور وہ سب سے الگ تھلگ چھوٹے سے لان کے ایک گوشے میں چھپی بیٹھی تھی۔ اپنے ہی کسی دھیان میں۔

پشاوری چپل میں مقید دو صاف ستھرے پاؤں پاس آ رکے۔ چونک کر سر اٹھایا۔ کلف لگے سفید قمیص شلوار میں ملبوس وہ اتنا وجیہہ لگ رہا تھا کہ آس پاس سب بھول گیا۔ یک ٹک دیکھے گئی۔ وہ گلا کھنکھارتا کچھ فاصلے پر رکھی کین کی چیئر پر بیٹھ گیا۔

"مام کی کال آئی تھی۔ انہوں نے بتایا تمہاری کچھ شاپنگ رہتی ہے۔ میں جا رہا تھا مارکیٹ تک۔ تم بھی چلو میرے ساتھ۔ جو بھی چاہیے لے لو۔"

"میرا موڈ نہیں ہے۔" جب سے وہ آئے تھے وہ آج اس سے مخاطب ہو رہا تھا اور وہ بھی مام کی تاکید کے بعد۔ اب جنت عرا اتنی بھی ہلکی نہیں تھی۔ جتنا اس نے لے لیا تھا۔

"او کے ایز یو وش۔ میں تو تمہاری سہولت کے لیے کہہ رہا تھا۔ ورنہ میرے تو اتنے کام باقی ہیں ہو سکتا ہے جب تم جانا چاہو تو میں نہ جا سکوں۔ چلو خیر۔" اب اتنے صاف جواب کے بعد وہ کیا منت کرتا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ڈیڈ کو مس کر رہی ہوں۔ مجھے واپس جانا ہے۔ تم میری ٹکٹ کنفرم کروا دو۔"

جتنا وہ اپنی برداشت کا امتحان لے چکی تھی۔ اب اس سے زیادہ کی ہمت نہیں رہی تھی۔ بمشکل بھی کو بھیگنے سے روکتے کہا۔ ضومیر کے قدم زنجیر ہوئے۔ پلٹ کر دیکھا۔ اس کی کھنچی سی ناک سرخ ہو رہی تھی اور نیلگوں آنکھیں تو گویا اب جھیل بنی کہ تب۔ وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچتا سر ہلا رہا تھا۔

"آہاں۔ واپس جانا ہے۔ ڈیڈ کو مس کر رہی ہو؟ اس کا مطلب تمہیں یہاں آ کر بالکل اچھا نہیں لگا اور میں نے تو تم سے یہاں آنے کے لیے کبھی نہیں کہا تھا۔ یہاں آنا تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ اب اگر تم ہو سک نیس کا شکار ہو رہی ہو تو میں رکنے کے لیے بھی بالکل نہیں کہوں گا۔ لیکن بس یہ ملیحہ کی شادی کے د تین دن کسی طرح نکال لو۔ پھر میں دیکھتا ہوں کب کی سیٹ آسانی سے مل سکتی ہے۔ ٹھیک۔"

اور اس قدر صاف گوئی کے بعد اس کا سر جھکنے کی سکت بھی کھو گیا تھا۔ وہ دور تک جاتا دیکھتی رہی ایک پل کو محبت کرلائی اسے آواز دے کر روک لو۔ اگلے ہی پل جیسے انا نے اپنے سخت کھردرے ہاتھ ہونٹوں پر جما دیے۔ نہ وہ ساتھ لے کر آیا تھا نہ روکنا چاہتا ہے تو پھر۔ گلا ہی گھٹ گیا۔ وہ جا چکا تھا بس اس کی خوشبو رہ گئی تھی۔ جو سانسوں سے ر تک اترتی ایک عجب احساس سے ہم کنار کر ر تھی۔

اور اس رات جب وہ سر درد کا بہانا کر کے بیڈ ر میں جا چکی تھی تو شینا ایک شاپنگ بیگ لے آئی تھی۔

"بھابھی! یہ میرو بھیا نے آپ کے لیے بھیج ہے۔ کچھ رہے ہیں چیک کر لیں۔ اگر کوئی کمی بیش ہوئی تو چینج کروا دیں گے۔"

وہ بہت دیر منہ سر لپیٹے پڑی رہی۔ اس بیگ سے آتی خوشبو سانس اکھیڑ رہی تھی۔ جھٹ کر اٹھا ارادہ دور پھینکنے کا تھا۔ مگر سب چیزیں بکھر گئیں اور اتنی حیران کہ پلک تک نہ جھپکی۔

☆☆☆

وہ دونوں جیسے مہمان خصوصی تھے۔ اتنی اہمیت پیار۔ سب ہی سراہ رہے تھے۔ سارا خاندان ضومیر

قسمت پر رشک کر رہا تھا جسے اتنی حسین بیوی ملی تھی۔ پھر سونے پر سہاگہ مزاج اتنا دھیما اور سلجھا ہوا۔ (اب یہ تو کوئی ضومیر سے پوچھتا) جو اس کی تعریفیں حق سمجھ کر وصول کر رہا تھا۔ ہر تقریب میں وہ اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتا رہا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ڈھیروں تصویریں بھی بنوائیں۔ وہ خود پر ضبط کے کڑے پہرے بٹھائے ساتھ دینے پر مجبور تھی۔ کئی بار جی چاہا اس بے درد کا بازو جھٹک کر کہیں دور بھاگ جائے۔ مگر۔ وہ یہ سب دنیا دکھاوے کو کر رہا تھا نا۔

"مطلب پرست' چالاک آدمی۔" وہ کڑھتی۔ اکثر اس کی سرخ پڑتی آنکھیں دیکھ کر نگہت مرچیں لینے دوڑ پڑتیں۔ انہیں لگتا بہو کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ وہ تو عام سے حلیے میں بھی اتنی خوب صورت لگتی تھی۔ اب ذرا سا سنگھار کر لیتی تو نظر نہ ٹھہرتی۔ وہ پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتیں اور شدید کرب میں اسے ہنسی آنے لگتی۔ ماں کو پھونکیں مارنے سے فرصت نہ تھی اور بیٹے کو اس سنگدل و روح چھونکنے سے۔ وہ تو ایسا کٹھور دل تھا مجال ہے جو ایک بار بھی نظر بھر کر دیکھا ہو یا ایک حرف ہی اس کی مدح میں ادا کیا ہو۔

بارات والے دن تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ سرخ اور سبز کمبی نیشن کی جھلملاتی ہوئی انتہائی دیدہ زیب میکسی تو بالکل اس کی شادی والی میکسی جیسی تھی اور باقی کے تمام لوازمات جن میں جیولری' چوڑیاں' سنہرے سینڈل بھی تقریباً ملتے جلتے اور یہ سب ضومیر لے کر آیا تھا جسے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔

"وہ سب چیزیں ماما کی پسند سے لی ہیں۔ تمہیں اچھی لگیں؟"

اگلی صبح وہ پوچھ رہا تھا اور اچھا نہ لگنے کی کوئی وجہ تو تھی نہیں۔ وہ ایک ماں کی محبت تھی۔ جس نے اس کا دل سرشار کر دیا تھا۔ انہوں نے اسے اس کی شادی پر نہیں دیکھا تھا اور آج اس نے سیلفی لے کر خاص طور پر ماما کو سینڈ کی تھی۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ ان کے پسند کردہ ڈریس میں کیسی لگ رہی ہے؟ اس کے بعد مصروفیت ہی اس قدر رہی۔ علیمہ کی رخصتی پر سب کے ساتھ اسے بھی کئی دن کا غبار نکالنے کا بہانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔ خوب نکالی کہ جھٹ گھبرا کر کہہ گئیں۔

"ہائے ماں صدقے جائے۔ پریشان ہو گئی ہے میری بچی۔ ضومیر بیٹا! تم اسے کمرے میں لے جاؤ۔ شبینہ بھاگ کر بھابھی کے لیے گلوکوز بناؤ۔"

ان کے بچے فوراً عمل درآمد کے لیے بڑھے۔ اب اتنے لوگوں کے درمیان وہ کیا کرتی۔ جب اس نے بازو تھام لیا تھا۔ ہاں روم سے باہر ہی جھٹکے سے چھڑوایا۔

"میں خود چل سکتی ہوں۔ تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں اور بہت شکریہ۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔" وہ پوری طرح بے گانگی کا چولا پہنے اسے وہیں ہی چھوڑ آئی تھی۔ مگر وہ پیچھے ہی چلا آیا۔ ابھی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ ہانپتی کانپتی شبینہ گلوکوز کا گلاس تھامے چلی آئی۔

"یہ لیں بھابھی! آرام سے بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ کر کے پی لیں۔"

"تھینکس۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔ اس سے پہلے میرے لیے اچھی سی چائے ایک چین کر لے آؤ پلیز۔" درحقیقت یہ سب اسے سنانا تھا جو آرام سے پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"ہاں ہاں۔ بالکل آپ آرام کریں۔ تھک گئی ہیں۔ میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔" شبینہ جتنی تیزی سے آئی تھی اسی رفتار سے پلٹ گئی۔ جنت نے ہاتھ میں تھاما گلاس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کانوں میں جھولتے آویزے اتارنے لگی۔ آئینہ اس کے عکس سے جگمگا اٹھا تھا۔

"ماما تمہیں کال اور میسج کرتی رہیں۔ تم نے کسی ایک کا بھی ریپلائے نہیں کیا؟" ضومیر کی نظر اس کے جھلملاتے عکس پر تھی۔ اس کے ہاتھ تھم گئے۔ دائیں کان سے اتارا آویزہ ٹیبل پر رکھ کر کلچ سے سیل فون نکالا۔

"ماشاء اللہ۔ کسی کی نظر نہ لگے۔ کس قدر حسین

لگ رہی ہے میری بیٹی اور میری جان تو خوب ہے ہی۔ مگر تمہارے اس روپ میں آدھا ضومیر کی چوائس کا ہے۔ کیا زبردست ڈریس لیا اس نے تمہارے لیے۔ دل خوش ہو گیا میرا۔ اللہ دونوں کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔" اور اس نے بے اختیار سر اٹھایا۔ وہ دونوں بازو سینے پر لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"اوہ۔ ہاں یاد آیا۔ یہ رہا تمہارا انکلٹ۔ دیکھ لو میں اپنے قول کا کتنا پکا ہوں۔ وعدہ کیا تھا نا تم سے؟ کہا تھا نا کہ بس دو تین دن۔ ویسے بھی میں کسی کو پریشان دیکھ ہی نہیں سکتا۔ کسی کی آنکھ میں آنسو تو مجھ سے برداشت ہی نہیں ہوتے۔ کیا کروں مزاج ہی ایسا پایا ہے۔ ویل۔ تم یہ پکڑو۔"

اور وہ تو ناک چڑھی۔ اس کا تو دل ہی گویا پسلیوں کے اندر کہیں سرک گیا تھا۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ ہتھوڑے برس رہے تھے۔ وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی۔ گویا کچھ کہہ رہی ہو۔

"تو میں نے تو ایویں ہی کہا تھا۔ تم لے بھی آئے۔ حد ہوتی ہے فرماں برداری کی بھی۔"

"نہیں۔ وہ بھلا تمہیں کیوں روکے گا۔ اسے تو تم نے خود موقع فراہم کیا ہے جان چھڑانے کا۔ اب جلدی کرو واپسی کی تیاری۔"

پھر تو تم اور اپنی انا کا ہار بنا کر گلے میں ڈالے رکھو۔ بلکہ تاج بنا کر سر پہ سجا لو اور پھر تنہائی کے سیاہ محل میں جدائی کے کانٹے دار تخت پر بیٹھ کر اس سارے سال کا ماتم کرو۔ اس کے اندر کوئی بولا نہیں چلا رہا تھا۔ اف۔ نہیں۔ یہ نہیں ہو سکے گا مجھ سے۔ اس کے ہاتھ میں تھامے کاغذ سے نگاہ چرا کر بستر مرگ پر پڑے مریض کی طرح کراہتے پانی مانگنے کا قصد کیا۔

"تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ جبکہ تم یہ ڈریس خود لائے ہو۔ اس لیے نا کہ تم مجھے دلہن بنے دیکھنا چاہتے تھے؟"

"ہاں بھئی۔ اپنی شادی پر تو تمہیں پوری طرح دیکھا ہی نہیں تھا۔ تم نے دیکھنے ہی نہ دیا۔ پہلے ہی ہزار قدغنیں لگا دی تھیں۔ تو سوچا اب دیکھ لوں گا۔"

وہ بلا جھجکے کہہ گئی تھی تو اس نے بھی برملا اعتراف کیا۔

"اور پھر بھی مجھے جانے کا کہہ رہے ہو۔ کیا میں چلی جاؤں؟" اس کے چہرے کو دیکھتے لہجہ سوالیہ ہوا۔ اس نے عادتاً شانے اچکا دیے تھے۔

"تم روکو گے نہیں؟"

"ہرگز بھی نہیں۔ تم جانا چاہ رہی ہو تو پھر میں کیوں روکوں گا بھلا۔ کیا میں تمہیں اتنا ظالم دکھائی دیتا ہوں؟"

وہاں معصومیت کی انتہا تھی اور بس اس کا ضبط اتنا ہی تھا۔ جنت تمام ہو چکی۔ قصہ اپنے انجام کو پہنچا۔ اب کیا پیروں میں گر جاتی۔ رو رو کر تو پہلے ہی جان ہلکان کر چکی تھی۔ اب رونا نہیں تھا۔ اب تو بس رخت سفر باندھنا تھا۔ عالم اضطراب میں دوسرا آویزہ اتارنے کو ہاتھ بڑھایا۔

"اونہوں۔ رہنے دو نا۔ اچھے لگ رہے ہیں۔ تمہارے ہر بناؤ سنگھار پر صرف میرا حق ہے اور حد ہے مجھے ہی ٹھیک سے دیکھنے نہیں دیتی ہو اور کتنا تنگ کرو گی سنگ دل لڑکی۔ اب تو بس کر دو۔ بہت من مرضیاں کر چکیں تم۔ اب اس سے زیادہ میں اور نہیں سہہ سکتا۔ سمجھیں؟" یہ صرف اس کا ہاتھ پکڑ کر روک دیا گیا۔ بلکہ آویزہ بھی نہایت نرمی سے کان میں ڈال دیا گیا۔

اسے اک پل میں رنگ بدلتے دیکھ کر وہ ایسی ہک دک ہوئی کہ مجسمے کا گمان ہونے لگا۔ ضومیر کو ہنسی آ گئی۔

"اب اس مرے ہوئے کو اور کتنا مارو گی۔ ہوش میں آ جاؤ جانم۔" جھک کر روشن پیشانی پر مہر محبت ثبت کی۔ اس کے پورے بدن میں کرنٹ دوڑ گیا تھا۔ تڑپ کر اٹھنا چاہا کہ شانوں پر ٹھہرے اس کے ہاتھوں نے کوشش ناکام بنا دی۔

"میں نے کہا نا، بہت چلالی تم نے اپنی۔ بہت بھگت چکا ہوں میں۔ اب میری باری ہے اور تمہارا حوصلہ تو میں نے اس دن ہی دیکھ لیا تھا جب تو نے طلاق کا نام لیا تھا۔ فوراً ہی اڑ گیا تھا تمہارا رنگ اور اگر کچھ

میری کوئی گرل فرینڈ سامنے آجائے تو۔"
"خبردار...... ایسا سوچنا بھی مت۔ جان لے لوں گی تمہاری۔" وہ نہ صرف ہوش میں آچکی تھی۔ بلکہ اس کے ہوش بھی اڑا سکتی تھی۔
"پورے ایک سال' پانچ مہینے اور اکیس دن تم نے جان ہی تو نکالی ہے۔ میری اور کیا ہی کیا ہے تم نے۔ کوئی کسر چھوڑی بھی کیا؟" اس کا حساب کتاب پورا تھا اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا علاوہ نظر جھکانے کے۔ دو قطرے ٹپک کر دامن میں جا گرے۔ ایک انگلی ٹھوڑی تلے رکھ کر چہرہ اوپر اٹھایا گیا۔
"آئندہ یوں رو کر مت دیکھنا مجھے۔ کل شام کی فلائٹ ہے۔ پیکنگ کرلینا۔" حکم صادر کرتا وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ ایک ہاتھ ڈریس پینٹ کی پاکٹ میں ڈالے۔ انداز میں لاپروائی کا عنصر نمایاں تھا۔ جنت نے کپکپاتی انگلیوں سے ٹکٹ پکڑا۔ دھندلائی نظر ڈالی اور...... بوکھلا کر اسے دیکھا پھر ٹکٹ کو۔
"ضو...... ضومیر...... یہ...... یہ...... ٹک...... کیا ہے؟"
"کیوں کچھ غلط ہے کیا؟ ارے بابا! اتنے امتحان لے کر بھی کیا ہنی مون منانے کا حق نہیں دو گی مجھے؟ یہ اسلام آباد کا ہوائی ٹکٹ ہے۔ کل شام ہم فلائی کر جائیں گے۔ پھر وہاں سے مری' نتھیا گلی' پتریاٹہ' بھوربن اور واپس اسلام آباد اور پھر ادھر سے بالاکوٹ اور بالاکوٹ سے وادی ناران' کالام......"
وہ اسے پورا شیڈول بتا رہا تھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے جانے آنسو روک رہی تھی یا ہنسی۔ وہ اس کے پاس آیا۔ وہی دل ربا سی مسکراہٹ چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔
"تم چاہو تو میری زندگی میں آجاؤ۔ تم چاہو تو چلی جاؤ۔ واہ۔ یہاں کیا صرف آپ کی اجارہ داری چلتی ہے مادام۔ میں تو جیسے کوئی گھاس کھانے والی مخلوق ہوں؟ ہے نا؟ جسے آپ جب چاہیں لاٹھی سے ہانک لیں۔ وہ تمہارا گھر تھا۔ یہ میرا گھر ہے اور یہاں سے میری مرضی کے بنا جا کر تو دکھاؤ ذرا۔ تمہاری اور اپنی جان ایک نہ کر دوں گا میں۔"
اس نے مہندی اور چوڑیوں سے سجے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ وہ اس کے ہاتھوں میں دبے اپنے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔ جن سے نکلتی ایک سکون آمیز لہر دل تک سفر کر رہی تھی۔ پور پور وہ اس کیفیت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ ضومیر نے شرارت سے ہاتھ دبائے۔
"ہاں اب بولو بھی؟ ٹھیک ہے نا کوئی اعتراض تو نہیں؟" اور بھلا وہ اعتراض کرنے والی کون تھی۔ جب اللہ اپنی نعمتوں سے نوازنے پر آئے تو آگے بڑھ کر لے لیتے ہیں اور اس کا شکرانہ ادا کرتے ہیں۔ ناشکروں کا انجام اس سے ڈھکا چھپا تو نہیں تھا۔ مکمل خود سپردگی کے ساتھ اس کے سینے سے جا لگی۔ ضومیر نے بے پایاں محبت کے احساس سے خود میں سمیٹ لیا۔
"میں نے کہا تھا نا محبت کی نگاہ سے دیکھو گی تو میری سب خوبیاں تم پر آشکار ہوں گی اور یاد ہے میں نے کیا کہا تھا؟" وہ اسے ایک پرانی بات یاد دلا رہا تھا۔ اسے اپنا جواب بھی اچھی طرح سے یاد تھا۔ لیکن اس پل وہ جواب کیوں دہراتی۔ بمشکل ہنسی روک کے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔
"ماشاء اللہ۔"
"اچھا جی آج ماشاء اللہ۔ واہ بہت سیانی ہو تم تو۔" وہ بے اختیار ہنسا۔ دونوں ہنس رہے تھے۔ سب گمان بادل کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔ یقین اجلے چاند کی مانند دلوں کو جگمگا رہا تھا۔
☆☆

زارا سکندر



"مارے گئے۔" سعد نیچے آیا تو امی کو ساگ لئے دیکھ کر اپنا سر پکڑ کے وہیں سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا۔
"یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے، اک واری فیر ساگ۔ میری پیاری امی مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر آپ کو ساگ سے اتنی محبت کیوں ہے۔ جب دیکھو ہمارے گھر میں ساگ ہی پک رہا ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو آپ نے اتنا سارا بنایا تھا اور آج پھر۔"
"جی نہیں، پچھلے سے بھی پچھلے ہفتے یعنی پندرہ دن پہلے پکایا تھا۔" امی نے فوراً ہاتھ روک کر اسے یاد دہانی کروائی۔ "اور ویسے بھی کون سا میں نے سبزی والے سے خریدا ہے۔ وہ تو بھلا ہو اللہ دتہ کا، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دے کر گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کھیت سے تازہ توڑ کر سیدھا ادھر ہی آرہا ہوں۔ بڑا نرم ہے جلدی پک جائے گا، پوری بوری بھر لایا تھا۔ میں نے بس آدھا ہی رکھا ہے اور باقی ساتھ والی راشدہ کو دے آئی ہوں۔ بڑی شکر گزار ہو رہی تھی وہ میری۔ کہاں ملتا ہے ایسا تر و تازہ خالص سرسوں کا ساگ اور وہ بھی بغیر کھاد کے۔" امی ساگ کاٹنے کے ساتھ ساتھ اسے تفصیل بھی سناتی جا رہی تھیں۔ اس دوران وہ مسلسل غصے سے دانت پیس رہا تھا۔
"اچھا تو اس کا مطلب ہے کہ پہلے اللہ دتہ کا بندوبست کرنا پڑے گا جو بوری بھر لاتا ہے۔ یہ یقیناً ہم سے کوئی پرانی دشمنی نکال رہا ہے منحوس کہیں کا۔ ساگ کھلانے کے لیے اسے ہمارا گھر ہی ملا ہے۔"
"اب تم کیا کہہ رہے ہو؟" اسے منہ میں بڑبڑاتا ہوا دیکھ کر امی پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔
"کچھ نہیں امی میں بس یہی سوچ رہا ہوں کہ اب دو دن آپ ہمیں کسی ڈاکٹر کے نسخے کی طرح ساگ ہی کھلائیں گی۔ رات کے کھانے پر ساگ، صبح ناشتے پر ساگ پھر دوپہر میں ساگ ہی تو ہوگا۔ کوئی ساگ نہ ہوا کوئی دوائی ہوگی۔"
"نا تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اتنا تو مزے



دار بنتا ہے۔" امی کو سعد کی تنقید ذرا بھی پسند نہ آئی، اس لیے خفگی بھرے انداز میں بولیں۔

"تو پھر ٹھیک ہے آپ کھائیں اور ابو کو بھی کھلائیں۔ میری طرف سے دو دن کھانے کی ہڑتال سمجھیں۔" سعد اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

"کیوں بھئی برخوردار! قربانی کا بکرا سمجھ رکھا ہے مجھے جو ساگ کھلانے کا مشورہ دے رہے ہو۔ بس بیگم صاحبہ بہت ہوگئی۔ ہمارے صبر کو مت آزمائیں۔ یوں روز روز ہم سے ساگ نہیں کھایا جاتا۔" سعد کی بات سن کر ابو بھی بولتے ہوئے ساتھ والے کمرے سے نمودار ہوگئے۔

"چلیں جی یک نہ شد دو شد۔" امی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"سعد بیٹا جی! میں بھی تمہارے ہڑتالی کیمپ کا ممبر ہوں۔" ابو اب سعد کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے اسے یقین دلا رہے تھے۔

"اور مجھے بھی اپنے ساتھ شامل سمجھیں۔" سعد کی چھوٹی بہن مائرہ نے دور سے ہاتھ ہلائے۔

"اس کا مطلب ہے ادھر آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ پھر میری دال کہاں گلنی ہے۔" امی پر تو گویا مایوسیوں کی آمد ہو رہی تھی۔

"آج سے ہمارا ساگ کے خلاف علم بغاوت بلند ہے۔ لہٰذا ہم سب اسی کیمپ میں بیٹھیں گے۔" ابو کا نعرہ سن کر امی اب اچھی خاصی خفا ہو چکی تھیں اور لگیں پھر سے شکوہ کرنے۔

"آپ بجائے ان بچوں کو سمجھانے کے الٹا ان کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔"

"بس بیگم صاحبہ! میں اپنی بچہ پارٹی کے ساتھ ہوں۔ اب تو یہاں دمادم مست قلندر ہی ہوگا۔" ابو دونوں بچوں کو ساتھ لگاتے ہوئے بولے تو امی نے چھری ہی پھینک دی۔

"لگتا ہے ان سب نے تو ساگ نہ کھانے کی نیت کر لی ہے تو پھر مجھے کیا ضرورت ہے صرف اپنے لیے اتنا تردد کرنے کی۔ اٹھاؤ نذیراں! یہ ساگ اور لے جاؤ گھر، تم پکا لو اور ہاں میرے لیے ساگ کی ایک پلیٹ ضرور بھجوا دینا۔ ... نکالوں گی۔" امی نے سارا ساگ کام والی ماسی کو دیا اور خود غصے سے اٹھ کر فریج تک گئیں ... پلیٹ نکال کر کچن کی سلیب پر رکھ آئیں۔ ... خوشی خوشی ساگ سمیٹ کر چلتی بنی۔

☆☆☆

"یہ ہوئی نا بات، میری امی زندہ باد۔" ... نے خوشی سے نعرے لگانا شروع کر دیے جب کہ ... ابو کی طرف دیکھ کر وکٹری کے نشان بنا رہی تھی جو ... تک ہنس رہے تھے۔

"نہیں، آخر ساگ کھانے میں برائی کیا ہے۔ اس کے تو طبی فوائد ہی اتنے سارے ہیں۔ پیٹ کے بہت سے مسائل تو محض ساگ کھانے سے ہی حل ہو جاتے ہیں۔" امی سے ابھی تک ساگ کی ناقدری برداشت نہیں ہو رہی تھی تو لگیں اس کی خوبیاں گنوانے۔

"امی! اس میں برائی والی صرف ایک ہی بات ہے کہ ہمیں اکثر کھانا پڑتا ہے۔" مائرہ نے بھی اپنی رائے دینا مناسب سمجھی۔ بس پھر کیا تھا امی طیش میں آگئیں۔

"لائے تو سہی، اب اللہ دتہ ساگ۔ میں اسے گھر میں گھسنے ہی نہیں دوں گی۔ دے آئے جا کر کسی قدردان کو، اس گھر کے ناشکرے لوگوں کو اس نعمت کی قدر نہیں۔"

"یہ ہوئی نا بات بیگم! بہت اچھا فیصلہ کیا ہے آپ نے تو۔ بالکل ٹھیک، اسے گھر ہی مت آنے دیجیے گا بلکہ مجھے بلائیے گا۔ اس کم بخت کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آئندہ ساگ توڑتے ہوئے بھی دس بار سوچے گا۔" ابو آج بھرپور مذاق کے موڈ میں تھے۔ امی مزید تلملا اٹھی تھیں۔

"ابو! خدا کی قسم مجھے تو سردیوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"وہ کیوں بھئی؟" ابو نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ابو! گھر گھر ساگ پک رہا ہوتا ہے۔ اپنے ... کھانے جاؤ ساگ، محلے سے گزرو تو ہر گھر ... سے ساگ کی مہک آرہی ہوتی ہے۔ ... کے گھر سے اگر کچھ آرہا تو ساگ۔ یہاں ... کے گھر سے بھی ساگ ہی جا رہا ہے اور تو ... اب میں بھی ساگ ہی نظر آتا ہے۔" سعد جان ... کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ ابو اور مائرہ کے ... بے حال ہو رہے تھے۔

"بس کرو، خیر تم اتنے بھی مظلوم نہیں ہو۔ ... ہوں قورمہ، خوش ہو جاؤ سب کے سب۔" امی ... پاؤں پٹختی کچن میں چلی گئیں۔

☆☆☆

سعد کے یونیورسٹی کے امتحان نزدیک تھے جن کی تیاری کے لیے آج کل وہ گھر پر ہی ہوتا تھا۔ اگلے دن ابھی صبح کا ناشتا ہو رہا تھا کہ چھوٹے چچا چلے آئے، ان کا گھر چچا کے آفس کے راستے میں ہی پڑتا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک ڈونگا تھا۔

"فاطمہ نے ساگ بنایا تھا۔ کہہ رہی تھی کہ بھابی کو دیتے جائیں۔" چچا تو امی کو ڈونگا پکڑا کر چلے گئے، پیچھے سے امی کی خوشی دیدنی تھی۔

"دیکھا تم لوگوں نے، مجھے ساگ نہیں پکانے دیا پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا سارا ساگ بھیج دیا ہے۔" سعد اچھی طرح پہچان چکا تھا کہ یہ وہی ڈونگا ہے جس میں امی نے ساگ بھر کے چچا کے ہاں بھجوایا تھا بلکہ سعد ہی دے کر آیا تھا۔

اب یہ دونوں بہن بھائی بیٹھے چپ چاپ کھا رہے تھے جب کہ ابو تو گرم گرم ساگ پر مکھن کی ٹکیہ دیکھ کر کب کے پھسل چکے تھے۔ اس لیے وہ بھی امی کے ساتھ مل کر پراٹھوں اور ساگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

☆☆☆

"سعد بیٹا! اتنی شام کو کہاں جا رہے ہو؟" سعد کو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بناتے ہوئے دیکھ کر امی پوچھنے لگیں۔

"امی! فرحان نے اپنے گھر بلایا ہے، ہمیں مل کر پیپر کی تیاری کرنی ہے۔ میں جلدی آجاؤں گا۔"

فرحان چونکہ سعد کے بچپن کا دوست تھا اور ان کے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر ہی رہتا تھا اس لیے امی کو بھی فکر نہیں ہوتی تھی۔ رات گئے تک پڑھائی کے بعد جب سعد واپسی کے لیے اٹھنے لگا تو فرحان نے روک لیا کہ امی کہہ رہی ہیں، کھانا کھا کر جانا۔ سعد نے بہت انکار کیا لیکن فرحان سنی ان سنی کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی، جو سعد کے آگے رکھ دی۔

"یہ کیا؟" اپنے آگے رکھے کھانے کو دیکھتے ہی سعد کا منہ کھلا رہ گیا۔ گرم گرم بھاپ اڑاتا ہوا ساگ اور ساتھ میں مکئی کی روٹیاں دیکھ کر وہ چند لمحوں کے لیے گم صم ہو گیا۔ فرحان کیا کہہ رہا تھا، وہ تو کچھ سن ہی نہیں پا رہا تھا۔

"یار آج ہی گاؤں سے یہ تازہ ساگ آیا ہے۔ امی بہت اچھا بناتی ہیں بلکہ ہم سب بہن بھائی تو ان سے فرمائش کر کے بنواتے ہیں۔ ان کا بنایا ہوا ساگ اور مکئی کی روٹیاں تو ہمارے پورے خاندان میں مشہور ہیں۔"

کھانا سامنے تھا۔ ساگ اور مکئی کی روٹی کھا کے ہی جان چھوٹنی تھی۔ بغیر کھائے کسی طور فرار ممکن ہی نہیں تھا۔ سعد بے چارہ مرتا کیا نہ کرتا۔ دھیان کہیں اور نوالہ کہیں اور جا رہا تھا۔ اوپر سے فرحان اسے مزید کھانے پر اصرار کر رہا تھا۔ روتے ہوئے دل کے ساتھ ساتھ اب اس کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں ہو گئے، جسے دیکھ کر فرحان پانی لینے اندر بھاگا کیونکہ اسے لگا شاید ساگ میں مرچیں تیز ہونے کی وجہ سے سعد کی آنکھوں میں پانی آرہا تھا۔



کہنے والوں نے کیا خوب کہا تھا......

''ارے...... سکینہ خود تو مر گئی مگر اس کی بیٹی نے تو اتھری گھوڑی کی طرح ہمارے محلے میں اپنی اجارہ داری قائم کی ہوئی ہے۔ گلیوں میں دندناتی پھرتی ہے۔ شرم، حیا تو اس چھوکری کو چھو کر گزری بھی نہیں۔ پچھلے دنوں مولوی کے بیٹے پر الزام جڑ دیا کہ لڑکیاں تاڑتا ہے بھلا حافظ قرآن لڑکا کیوں کر ایسی بھونڈی حرکت کرنے لگا...... بڑے چھوٹے کی تمیز ہی نہیں ہے...... اور سکینہ کے خاوند حیات محمد بھی اسے کچھ نہیں کہتے......''

برقی قمقموں کی جگمگاہٹ سے ذرا پرے تھی دیوار سے قریب میں کرسی پر بیٹھی تھی...... روشنیوں کی

مگر میں چاہ کر بھی نہ کہہ سکی...... لگا لیے...... لفظ نکل ہی نہ سکیں۔ جلتی ہوئی تھی اور برقی بتیاں کی مقدریں...... رکھے چراغ کی طرح جلنے لگی تھیں...... دور رہے تھے۔ مہندی کی بھلی سی خوشبو میں چکرا رہی تھی۔ مجھے مہندی بہت پسند نے اپنی ہتھیلیوں کو ہمیشہ کورا رکھا تھا۔ ارے کنیز...... کیوں بن ماں کی بچی لگا رہی ہو...... پڑھی لکھی ہے۔ سب گُن پرسجاتی ہے سارے گُن ہیں اس میں ورنہ اکیلی لڑکی ہو کر بوڑھے باپ کو سنبھال کر رکھے اور گھر کی دیکھ

منشا محسن علی

محبت ایک معجزہ ہے

طرف لپکتا پتنگا جلتا مرتا پھڑپھڑاتا ہوا میری جھولی میں آن گرا تھا...... میرے بارے میں تفصیل بتانے والی وہ شخصیت آپا کنیز کی تھی جو صدری محلے کی چچا چچا کہتی تھیں۔ ہر روز چینی، پتی مانگنے آتی تھیں اور ہر بار میں اپنے ماتھے پر بل ڈالے بغیر انہیں دے دیتی تھی۔

آج پروین کی مہندی کا فنکشن تھا اور میں اس کے خصوصی بلاوے پر ہی آئی تھی۔ مجھے ہمیشہ روشنیوں سے خوف آتا تھا۔ میں کافی تنہائی پسند تھی۔ اسی لیے میں یہاں کونے میں بیٹھی تھی...... میرا دل چاہا کنیز آپا سے کہوں......

جن کی مائیں مرجاتی ہیں ناں تو ان کی پرورش زمانہ کرتا ہے اور زمانے میں آپ جیسے لوگ بہ کثرت شامل ہوتے ہیں۔''

کر سکے ہے۔ ہم نے تو اس میں کوئی عیب نہ دیکھا کبھی...... تو ہی بس بھلے میں سے برائی نکالتے پھرتی ہے...... جوان بیٹی کی ماں ہے، ذرا دوسرے بچی کا نام لیتے وقت خیال رکھا کر......''

سکینہ کی بات پر یوں لگا کنیز آپا کے چہرے پر کسی نے سیاہی الٹ دی تھی۔ منہ کے زاویے غربا بھینچے مگر آن واحد میں ہی وہی رنگ چڑھ گیا۔ ... اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ ... کے ... چہرے سے چاند کی روشنی چھن چھن کر میرے ... دل پر رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر چاند کی ٹکیا کی طرف نظر اٹھائی تھی۔

''ہر فرعون کے دور حکومت میں موسیٰ ضرور ہوتے ہیں۔''

لڑکیوں کے قہقہے، چوڑیوں کی کھنک اور ذو معنی کی باتیں...... میں ان "جیسی" نہیں تھی۔ میرے وجود کے گرد "حد" کھنچی ہوئی تھی۔ کیا میرا دل ہنسنے، مسکرانے، مرا ہے جانے کو نہیں چاہتا تھا؟

میں "حد" کے گنبد میں گھوم رہی تھی۔ کسی کٹی پتنگ کی طرح...... دائرہ در دائرہ...... شاید میں "سب" سے مختلف تھی...... یا شاید "سب" مجھ سے مختلف تھے...... میں کسی پیرزادی کی پازیب کی سی تھی جو کھنکتی نہیں "چپ" سی رہتی ہے۔ میری جھولی میں گرے مردہ پتے کی بو مجھے بے حال کر گئی...... میں نے کھڑے ہو کر دامن جھٹک دیا...... مہندی کے گیت زور و شور سے گائے جا رہے تھے۔ پروین کی بہن زبیدہ میرے پاس آئی تھی۔

"استانی جی...... آپ کیوں الگ ہو کر بیٹھ گئی ہو۔ سب کے ساتھ بیٹھو، گیت گاؤ۔" وہ بناری سوٹ میں مجھے کسی سرسوں کی ڈال کی طرح لگی تھی۔

"نہیں...... زبیدہ...... مجھے گیت نہیں آتے...... بس میں یہیں ٹھیک ہوں...... ہو سکے تو ایک کپ چائے دے دو......"

وہ کرسیوں کے درمیان جگہ بناتے ہوئے واپس پلٹ گئی تھی۔

"اچھا...... آپ بیٹھیں...... میں کسی کے ہاتھ بھجواتی ہوں......" میں انتظار کرتی رہی...... مگر چائے نہیں آئی...... شاید وہ بھول گئی تھی۔ میں لوگوں سے مختلف تھی اسی لیے میں تو اپنی کہی گئی باتیں یاد رکھتی تھی۔ وعدے وفا کرنا مجھے آتا تھا۔

بابا سو چکے ہوں گے...... میں جانتی تھی وہ نیند کے کچے تھے...... مہندی کے فنکشن بھی رات ڈھلنے تک جاری رہتے تھے...... میں نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں تھک چکی تھی اسی لیے پروین اور اس کی اماں کو خدا حافظ کہہ کر گھر جانا چاہتی تھی...... پروین کی اماں نے مجھے دیکھا۔

"آج رات یہیں رک جاؤ...... اتنی رات اکیلی کیسے جاؤ گی......؟" چاندنی کی روشنی مدھم سی تھی۔

"نہیں خالہ!...... بابا اکیلے ہوں گے میں ان کو بھی نہیں آئی تھی کہ رات رکوں گی...... آپ فکر نہ کریں میں چلی جاؤں گی......" میں نے آنکھیں بند کر دی۔ وہ زبردست انداز میں ہنسی تھیں۔

"ارے...... ہاں بھئی...... تمہیں "کوئی" کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم اکیلی جا سکتی ہو......" میں ان کی اولاد تھی۔

وہ مجھے میرے انداز کے مطابق غلط ثابت کر رہی تھیں...... ہر کوئی کہتا تھا کہ میں مردانہ تھی۔ لڑکی ہوں جو محلے کے لڑکوں سے لے کر دکانداروں سے فری ہے۔ بوڑھا باپ تھا اور ایک پارسا حیات......

زندگی نے مجھے وقت سے پہلے "بیٹا" کر دیا تھا۔ میں لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتی جا رہی تھی جب زبیدہ کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ایک پل کو ششدر سی ہوئی پھر مگن ہو کر ساتھی لڑکی سے باتیں کرنے لگی۔ میں کرسیوں سے گزرتی خارجی دروازے کے پاس پہنچ کر واپس پلٹی تھی......

سارا ماحول پر جوش تھا کسی کو بھی میرے چلے جانے سے فرق نہیں پڑا تھا۔ گلی میں اندھیرا تھا...... اگر پروین کی اماں کی اپنی بیٹی ہوتی تو کیا وہ اسے اکیلے اندھیری رات میں جانے دیتیں۔ کسی کو تو ساتھ ضرور بھیجتیں...... میں سوچتی ہوئی جا رہی تھی۔ میں بھی تو ایک لڑکی تھی مگر ان میں سے کسی کی "بیٹی" نہیں تھی اور نہ ہی وہاں میرا کوئی "اماں"...... تھی...... میں تو بس ایک "لڑکی" تھی۔ وہ لڑکی جو بہت بہادر تھی مگر معاشرہ بہادر نہ تھا کہ اس کی "بہادری" کو تسلیم کرتا۔

☆☆☆

صبح کی مستانی ہوا صحن میں بکھرے جامن کے پتوں سے آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی جا رہی تھی...... رات کا ملگجا سا اندھیرا پوری طرح غائب نہیں ہوا تھا...... پرندوں کی آوازیں مجھے ایرانی سازندے گلزار کی یاد دلاتی تھیں...... وہ گلزار جو آواز ایک رکھتا تھا مگر اس میں چاروں موسموں کے سے ہوتے تھے۔ گرمی، سردی، بہار...... خزاں...... اور ساز خزاں کسی ماتم کی طرح مشرق سے ابھرتا اور مغرب کے فلک بوس پہاڑوں میں ڈھلتا تھا...... میں نے آب خوروں میں پانی ڈالا اور کٹوری میں باجرہ ڈال کر خشک پتوں کی بیل کے ساتھ رکھ دیا تھا۔

مجھ میں اور ابا میں کئی قدریں مشترک تھیں...... ان میں سے ایک سحر خیزی تھی اور دوسری مطالعہ کتب کا...... ابا کمرے میں نماز پڑھتے تھے جبکہ میں برآمدے میں بچھے تخت پر پڑھتی تھی۔ پھر ابا برآمدے میں آ جاتے۔ تلاوت ...... کرتے تھے اور میں کچن میں چولہے پر چائے کے برتن رکھتی۔ تلاوت سنتی رہتی تھی۔

تلاوت کی آواز میں زمانوں کی جھلک ملتی ہے۔ ماضی، حال، مستقبل میں ان زمانوں کی داستان رو رہی تھی...... حیران ہوتی تھی...... اور سوچتی تھی۔

"بے شک چرند پرند اور زمانے، جمادات و نباتات بنانے کا فن صرف میرے "اللہ" کو ہی حاصل ہے...... اور وہ بہترین رازق اور خالق ہے۔"

ابا تلاوت ختم کر کے آواز دے رہے تھے۔

"پارسا...... اگر چائے بن گئی ہے تو لے آؤ......"

میں نے چائے کو دو کپوں میں ڈالا اور باہر آ گئی...... ابا کرسی پر بیٹھے تھے...... میں کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

"رات مجھے تو نیند آ گئی تھی...... تم کتنے بجے واپس آئی تھیں......؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ ہوا کی ایک پرجوش لہر سے چنبیلی کی مدھم خوشبو سارے میں پھیلنے لگی تھی۔

"جی ابا...... بارہ بجے آئی تھی۔ اصل میں آپ کو پتا ہے ایسے موقعوں پر دیر سویر تو ہو جاتی ہے۔"

"کون چھوڑ کر گیا تھا......"

میں نے کپ پر گرفت سخت کر لی تھی شاید کپ چیخ کر ٹوٹ ہی جاتا۔

"پروین کا چھوٹا بھائی چھوڑ گیا تھا......" میں نے دل پر پتھر رکھ کر جھوٹ بولا تھا۔

وہ چائے پیتے رہے...... آب خورے کے گرد چڑیوں کا جمگھٹا لگ گیا...... ہر پرندہ ایک گھونٹ بھرتا اور پھر آسمان کی طرف نگاہ کرتا تھا...... پرندوں کو اپنے رازق کا شکر ادا کرنا کتنی اچھی طرح آتا تھا۔ میرے دل میں معمول کی طرح ایک خواہش ابھری تھی۔

"کاش میں بھی ایک پرندہ ہوتی...... پوری دنیا میں آزادانہ گھومتی اور جنگل میں ناچتے موروں کو کسی پیپل کے گھنے پتوں میں چھپ کر دیکھنا کتنا خوب صورت منظر ہوتا۔" لوگ "اڑان" بھرنے کو پرندہ بننے کی خواہش کرتے ہیں اور میں صرف "شکر" کرنے کے لیے...... ابا کی آواز پر میں چونکی تھی۔

"آج میں سلامت بھائی سے دکانوں کا کرایہ وصول لے جاؤں گا...... تمہاری یونیورسٹی فیس بھی دینی ہے اور کچن کا سامان تو تم لے آؤ گی......" میں نے چائے کے کپ اٹھائے تھے...... پھیلاوا مجھے پسند نہیں

تھا۔

''جی ابا..... وہ تو میں لے ہی لاؤں گی..... بس آپ خیال سے جائیے گا..... آج یونیورسٹی سے چھٹی ہے تو میں آج صفائی کر لیتی ہوں پورے گھر کی۔''

مشرق سے سورج طلوع ہو چکا تھا..... سونے کی سی کرنیں در و دیوار پر پھیل رہی تھیں..... وہ چپل پہن رہے تھے..... میں ان کی گھڑی اٹھا لائی اور ان کی کلائی پر باندھ دی۔

''پارسا بیٹا..... آج کھانے میں کیا بنے گا..... کوئی سبزی لانی ہے تو بتا دو.....'' وہ پوچھ رہے تھے.....

''نہیں ابو..... گوشت اور چاول ہیں..... کام ختم کر کے بریانی بنا لوں گی..... ہاں بس آتے وقت پھل لیتے آئیے گا۔''

وہ سر ہلاتے باہر نکل گئے..... صحن میں جامن اور امرود کے پتے بکھرے ہوئے تھے..... میں نے دوپٹہ کمر سے باندھا اور جھاڑو اٹھالی..... صحن میں جھاڑو دی..... سارے پتوں کو ڈھیر آگ لگا دی تھی آدھا گھنٹہ بعد کڑوا کسیلا دھواں تھما تو کپڑے دھو کر الگنی پر ڈال دیے..... پھر چند تازے صاف ستھرے صحن اور پھولوں پر چکراتی تتلیوں کو دیکھتی رہی..... نارنجی اور کاہی رنگ کی تتلیاں بنفشے کے پھولوں کے گرد دھمال ڈالتی رہیں..... وقت گزرتا گیا..... بریانی بنانے کی ٹھان لی.....

فضا میں بریانی کی اشتہا انگیز خوشبو چکراتی رہی..... بریانی پکاتے پکاتے میری اپنی بھوک ہی مر گئی۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا..... جانے ابا کب آئیں گے۔

میں چھوٹی سی تھی جب اماں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں..... مجھے ابا نے بہت مشکل سے پالا اور پڑھایا..... اب میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگلش کر رہی تھی ساتھ ساتھ شام کو بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی..... یہ میری زندگی تھی۔

کچھ چیزیں فطری ہوتی ہیں ہم انہیں چاہ کر بھی نہیں بدل سکتے..... مجھے بھی فطرت نے غلط ''غلط'' اور ''صحیح'' کہنا سکھایا تھا اور شاید یہی وہ باتیں تھیں جو محلے والوں کو میرے خلاف کر لیتی تھیں۔

جس عمر میں لڑکیاں ''گڑیا، گڑیا'' کھیلتی ہیں اس عمر میں میں یعنی پارسا حیات نے ''زندگی در زمانہ'' جیسے دقیق کھیل کو کھیلا تھا..... اور ایسے کھیل بچپن چھین لیتے ہیں اور ''آگاہی'' نامی صد وجود کے گرد باندھ دیتے ہیں..... میرے گرد بھی حد باندھ دی گئی اور میری زندگی شعور سے گزرتی رہی..... اور پھر میں نے خود کو ایک خول میں بند کر لیا جسے کوئی بھی زک پہنچانے کی جرأت نہ کر سکے۔

اور لوگوں نے پارسا حیات کو رات کے آخری پہر بھی میڈیکل اسٹورز پر بوڑھے باپ کی دوا لیے جاتے ہوئے دیکھا تھا..... وہ راستوں سے یوں گزرتی تھی جیسے راستے ہی اس کے نگہبان ہوں۔ لڑکیاں رات کے آخری پہر خوف سے ڈگمگا کر چلتی ہیں مگر وہ ناچتا تاریکی سے چلتی تھی..... لڑکیاں چاپ ابھرنے پر سہم جاتی تھیں..... مگر وہ اطمینان سے اپنا راستہ ناپتی..... جب وجود کو ''قرآنی آیات'' کے خول میں باندھ دیا جائے تو پھر کسی کی کیا جرأت کہ آنکھ بھی اٹھا کر دیکھے.....

☆☆☆

''رحیمو چاچا..... میں نے کہا بھی تھا کہ اگر میرے آنے میں بھی تاخیر ہو بھی جائے تو کتابیں کسی کو بیچ کر دیجیے گا۔ میں ضرور لینے آؤں گی مگر آپ نے اس شخص کو کیوں دے دیں؟'' فٹ پاتھ کے کنارے سفیدے کے درختوں کی لمبی قطاریں تھیں اور دائیں ہاتھ پر رحیم چاچا کا اسٹال تھا جہاں وہ پرانی کتابیں بیچتے تھے..... میں دو سال سے ان کی خریدار تھی مگر وہ سدا کے وعدہ خلاف تھے..... میری کی تاکید چٹکیوں میں اڑانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

وہ لڑکا کتابوں کا ڈھیر اپنی طرف کیے کھڑا تھا..... بلیک پینٹ، اسکائی بلیو پلی شرٹ، ستواں کھڑی ناک اور ہلکی گندمی رنگت تھی اس کی۔ اگر وہ مسکراتا ہو گا تو بہت خوب صورت مسکراتا ہو گا..... وہ بالوں کو ہاتھوں میں پکڑے کھڑا تھا اور ایک کتاب کے ورق پلٹ رہا تھا..... میری جان جل گئی اس کے ہاتھوں میں مستنصر حسین تارڑ صاحب کی ''پیار کا پہلا شہر'' تھی۔ میری پسندیدہ کتاب جو میں ایک سال سے ڈھونڈ رہی تھی۔

''پارسا بیٹا..... یہاں تو پہلے آؤ، پہلے پاؤ کا اصول چلتا ہے۔'' رحیم چاچا نے میرے غصے کو دیکھا تو ہنس دیے۔

آپ بہت وعدہ خلاف ہیں حالانکہ میں نے آپ کو کتنا کہا تھا..... ''رحیم چاچا نے کتابوں کو صاف کیا تو گرد اڑنے لگی تھی..... وہ لڑکا کھانستا ہوا پیچھے ہٹا تھا۔

''سنیے..... کیا آپ یہ بک مجھے بیچ سکتے ہیں؟'' وہ ٹشو سے منہ صاف کرتا میری طرف گھوما تھا۔

''جٹ والے۔'' وہ پوچھ رہا تھا.....

''وہ اصل میں اس بک کی مجھے کافی عرصے سے تلاش تھی..... میں نے رحیمو چاچا سے بھی کہہ رکھا تھا..... مگر آج کتاب آئی بھی تو آپ نے خرید لی۔'' میری بات پر اس نے بغور کتاب کے ٹائٹل پر نگاہ ڈالی اور پھر خصوصی طور پر مجھے دیکھا تھا۔

''آپ کتاب رکھ لیں مگر پڑھ کر واپس کر دیجیے گا کیونکہ مجھے بھی پڑھنی ہے۔'' وہ کتاب میری طرف بڑھا رہا تھا..... میں نے کتاب لے لی۔

''آپ کا بہت بہت شکریہ..... میں جلد یہ پڑھ کر رحیمو چاچا کو دے دوں گی پھر آپ ان سے لے لیجیے۔'' وہ کتاب میرے ہاتھ میں دے کر باقی کتابیں اٹھا کر رحیم چاچا کو سلام کرتا روڈ کی طرف جانے لگا..... سنہری دھوپ تارکول پر گر کر نئے رنگ میں ڈھل رہی تھی..... سفیدے کے پتوں کو ہوا روڈ پر اڑائے پھر رہی تھی۔

وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ کر بیلٹ باندھ رہا تھا..... جب میں مستقل اس کی طرف دیکھے گئی تو وہ استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا تھا..... میں نے گھبرا کر اس کی طرف سے پیٹھ موڑ لی تھی اور اپنے آپ کو اس حرکت پر گھرکا۔ پھر گاڑی چلنے کی آواز آئی..... میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جگہ خالی تھی..... اک پل کو لگا پارسا حیات کے وجود میں بھی خالی پن اتر گیا ہو۔

''یہ لڑکا کون تھا چاچا.....؟'' میں نے پلٹ کر ان سے پوچھا تھا۔ وہ کتابیں چھانٹ رہے تھے۔

''شاید اس شہر میں نیا آیا ہے..... ہفتہ ہو گیا ہے۔ یہاں آ رہا ہے کتابیں لینے۔'' انہوں نے مصروف سے انداز میں جواب دیا تھا..... کاسنی پھول کہیں سے اڑ کر آئے اور میرے پیروں کے قریب آن ٹھہرے..... ہوا میں شدت سی آ گئی تھی..... میں نے وہ کاسنی پھول اٹھائے اور کتاب کھول کر اس میں رکھ دیے اور پھر کتاب بند کر دی۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا جب اترتا تھا اور چاند کسی گھڑیال کی طرح آسمان کے وسط میں ہوتا تھا تو میں اور ابا بالکونی میں چائے یا کافی پیتے ہوئے کئی گھنٹے کتابوں پر بحث کرتے رہتے۔

بالکونی میں رکھے مٹی کے گملوں میں لگے پودوں پر جگنو قطار در قطار اترتے تھے اور میں ان کی ننھی ننھی روشنیوں کو دیکھے جاتی تھی۔

رات کا سحر چاروں قطبین کو گرفت میں لے لیتا تھا..... ابا سونے چلے جاتے مگر میں پھر بھی جاگتی رہتی تھی۔ ریلنگ تھامے اور گرد نظر دوڑاتے ہوئے میں سوچتی تھی کہ میں کتنا بھی خود کو یقین دلا دوں مگر حقیقت نہیں بدل سکتی کہ میں تنہا تھی۔

ٹوٹتے تاروں کی گنتی کرنا میرا دلچسپ مشغلہ تھا..... میرے اس مشغلے میں خلل تب ہی پڑتا جب میری پیاری دوست عاشی کا فون آ جاتا تھا.....

''پارسا..... تم بہت قنوطی لڑکی ہو..... دنیا کہاں پہنچ چکی ہے اور تم آج بھی وہیں کی وہیں کھڑی ہو۔'' میں اس کی باتوں پر ہنس دی تھی۔

''عاشی..... میری زندگی میں جمود ہے آگے

بڑھنے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں...... دوسروں کی زندگی پر باتیں کرنا ہر کسی کو آتا ہے مگر ایسے حالات فیس کرنا آسان نہیں ہوتا۔" میں جواب دیتی اور وہ اپنے دلائل پیش کرتی۔

"پارسا...... حماد جانے کب سے تم میں انٹرسٹڈ ہے...... تم اس کی حوصلہ افزائی کرو......" میں اس کی باتیں کاٹ دیتی۔

"چار دن کی پسندیدگی کو محبت نہیں کہتے...... وہ ایک امیر زادے کا وقت گزارنے کا چارم ہے...... جو جلد ہی ختم ہو جائے گا۔"

"ہیں کیا کمینہ دیکھتا تو ایسے ہے جیسے تمہارے لیے صدیوں سے جوگ لیے بیٹھا ہو......"

"کیا میری شخصیت ایسی ہے کہ کوئی میرے لیے جوگ لے سکے......؟" میں نے پوچھا تھا۔

"ایسا...... تم سنجیدہ ہو پارسا......؟" وہ جاننا چاہ رہی تھی۔

"آف کورس...... میں سنجیدہ ہی ہوں۔" میں نے کہا تھا...... میں خود سے "اچھی" طرح واقف تھی۔

"اچھا اللہ مجھے لڑکا بنا دیتا اور میں پورے دل اور گردوں سے تم پر فریفتہ ہو کر گریبان پھاڑ کر صحراؤں، جنگلوں کی خاک چھانتی......" وہ شرارت پر آمادہ تھی۔

میں ہنسی تھی۔

"تم ایسا کچھ بھی......"

وہ بھی ہنسنے لگی تھی...... اس سے بات کر کے میں ہمیشہ اپنے آپ کو پرسکون محسوس کرتی تھی۔

"شاید ہماری زندگی میں دوستی نامی 'دوا' رکھی ہی اس غرض سے جاتی ہے کہ یہ ہماری تکلیفوں اور مشکلوں میں راحت بن جائے......" اور وہ عائشہ عرف عاشی ایسی ہی تھی۔

☆☆☆

عاشی میں اور رانیہ درمیانی قطار میں رکھی کرسیوں پر بیٹھے تھے...... کلاس ونڈو کے پار سے سنہری روشنی پگھلی ہوئی چاندی کی طرح کلاس روم میں گر رہی تھی...... آج ٹیوٹوریل ڈے تھا اور اس روز سر گردیزی ایک ٹاپک دیتے تھے جس پر ہر اسٹوڈنٹ کو پانچ منٹ بات کرنا ہوتی تھی۔

سر گردیزی نے ساری کلاس میں نظریں دوڑائی تھیں۔

"جی اسٹوڈنٹس! آج میں چاہتا ہوں کہ آپ سب "محبت" پر بات کریں۔" تالیاں، سیٹیاں، قہقہے۔ کلاس روم مچھلی بازار بن گیا تھا...... ڈائس زور زور سے بجائے گئے تھے۔ رانیہ ہم دونوں کی طرف جھکی۔

"یہ محبت کیا ہوتی ہے......؟" میں نے ہونقوں کی طرح دیکھا تھا...... عاشی انچیو بن گئی اور قلم کان کے پیچھے اٹکا لیا تھا۔

"یہ جو محبت ہوتی ہے ناں ایک میریکل (معجزہ) ہوتی ہے۔" عاشی کی بات پر رانیہ کی آنکھیں چمکی تھیں۔

"جیسے جادو ہوتا ہے......" رانیہ کی آنکھیں اشتیاق کے مارے پھٹی جا رہی تھیں۔

میں نے اسے گھورا۔

"کمینی...... ہماری افلاطون صاحبہ تمہیں غلط گائیڈ کر رہی ہیں......"

عاشی نے مجھے گھورا۔

"تمہیں میری ذہانت پر رشک کیوں نہیں آتا......"

"کیونکہ مجھے تم پر ترس آتا ہے......"

"مجھ سے غداری کر رہی ہو تم......"

"نہیں تمہارے بے تکے اور بے لگام آئیڈیاز سے......"

"آئی ول کل یو پارسا......" آنکھیں غصے سے چھوٹی ہو گئی تھیں۔ کلاس روم میں یکلخت سیٹیوں کا شور مدھم ہوا تھا...... اور ایک آواز گونجی تھی۔ انچیو نے کمال اطمینان سے بردباری کا غلاف اوڑھ لیا۔

رانیہ نے اسے چٹکی کاٹی تھی۔

"ہم...... عاشی تم کتنا اچھا "گرگٹ" بنی

ہو...... پل میں بدل جاتی ہو۔"

"گرگٹ......؟" عاشی نے صدماتی کیفیت لیے مجھے مدد طلب نظروں سے دیکھا مگر مجھے ایک دم گھبراہٹ ہونے لگی تھی...... سر گردیزی عین ہمارے سامنے موجود تھے۔

"یہ کون تھا......؟" نظروں میں گہری سنجیدگی طاری تھی......

"گرگٹ......" رانیہ کے لبوں سے جملہ پھسلا...... ساری کلاس کے قہقہے ابل پڑے۔

"واٹ ڈو یو مین......" سر مسکراہٹ دبائے رانیہ کو دیکھ رہے تھے۔

"سر وہ تو میں عاشی سے پوچھ رہی تھی کہ گرگٹ کا مسکن کہاں ہوتا ہے......؟" رانیہ گڑبڑائی تھی۔

"اوہ آئی سی......" سر نے سر ہلاتے ہوئے رانیہ کو مخاطب کیا تھا۔

"تو مس رانیہ روسٹرم پر کھڑی ہو جائیے...... اس ٹاپک کا آغاز آپ سے ہوگا......"

"سر میں......؟" صدماتی آواز۔ سر مسکرائے۔

"جی...... مس رانیہ بنت احمد علی......"

تالیوں کا شور تھا اور مس رانیہ ہانپتی، کانپتی روسٹرم پر کھڑی نظر آئیں...... گلا تر کیا...... وہ بے نماز کی صورت گول چپیوں کی طرح چہرے پر چھایا۔

"یہ خطبہ تو نہیں پڑھنے والی ہیں محترمہ......" دبی دبی ہنسی کی آواز ابھری تھی۔

رانیہ نے جھجکتی نظروں سے گرگٹ کو دیکھا...... عاشی نے وکٹری کا نشان بنایا...... میں نے بھی یہی کیا تھا۔

رانیہ نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور لرزتی، کانپتی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"محبت ایک معجزے کی طرح ہوتی ہے جو کسی بھی انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے...... پھر انسان گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں بھاگ جاتا ہے...... اور صحراؤں میں بھٹکتا ہے...... جہاں پانی بھی نہیں ملتا......"

بارش کی دعا مانگتا ہے اور جب بارش ہو جاتی ہے تبھی پانی پی کر خوشی خوشی گھر آ جاتا ہے۔"

پہلا قہقہہ...... دوسرا...... تیسرا...... تعداد بڑھنے لگی تھی۔

مس رانیہ لال ٹماٹر بنی خفت سے سرخ ہوئی جاتی تھیں...... گرتے، کانپتے سیٹ تک پہنچنے کے چکر میں ہاتھ سیدھا جسما تو علینہ کی عینک پر پڑا تھا...... سو علینہ سے پیچھے بھی سنگواتی آئی تھی...... اب گہرے سانس لیتی مجھے کہہ رہی تھی۔

"پارسا...... میں نے کیسی اسپیچ کی......؟"

اگر یہ اسپیچ تھی تو انتہائی "وہ" تھی...... وہ مطلب (گھٹیا) ہی...... ہی۔

"بہت اچھی...... بہت اعلیٰ۔" میں نے آگے روسٹرم کی طرف نظر دوڑائی تھی۔ عاشی مکمل سکون اور اطمینان سے کھڑی محبت کو بیان کر رہی تھی۔

"میرے نزدیک محبت ایک ایسا حادثہ ہے جو آپ کو اپنا نہیں رہنے دیتا...... یہ آپ کی روح کسی اور کے ہاتھ میں تھما کر کہتا ہے۔

"جاؤ...... یہ تمہاری ہوئی۔" محبت ایسا فیز ہے جو انسان کو روحانیت کی سیڑھی پر کھینچ لاتا ہے...... اور یہ الگ بات ہے کہ یہ محبت ہماری سوسائٹی میں مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے۔"

مس گرگٹ نے انتہائی دقیق اور پیاری بات کہی تھی...... سر مسکرائے تھے۔

"ویری نائس مس گرگٹ......"

"ایں...... یہ کیا...... اس کا مطلب سر وہ گفتگو سن چکے تھے۔" عاشی کا رنگ اڑا تھا۔

"مگر خیر...... کسی کے کہنے سے عاشی محترمہ گرگٹ تھوڑی نہ بن جائیں گی"

اور پھر ساری کلاس نے اپنے خیالات پیش کیے...... ہماری کلاس زندہ دل اور انتہائی ہنسوڑ تھی۔ لمحہ لمحہ زندگی جینے والی...... بس ذرا "ادب" نامی جذبے کا فقدان تھا...... (اختلافی رائے) میں نے سامنے دیکھا تھا۔

"اب آئیں گی اس مقابلے کی امیدوار...... آیئے مس پارسا......" میں نے ان کو کھی کرتی لڑکیوں سے مکمل اجنبیت برتی اور روسٹرم پر جا کھڑی ہوئی۔ اور وہیں میں نے اسے دیکھا تھا۔

وہ وہی لڑکا تھا جو مجھے رحیمو چاچا کے ہاں ملا تھا اور جس کی کتاب میرے پاس تھی...... میں چونکی تھی سر کی بات پر۔

"آپ کا ٹائم شروع ہوتا ہے اب۔" میں نے ان مڑی ہوئی پلکوں کو دیکھا جو پہچان کے کسی بھی رنگ سے خالی تھیں...... عاشی اور رانیہ مجھے اشارے کر رہی تھیں...... مجھے سب بھول رہا تھا...... کلاس روم اسٹوڈنٹس...... اپنی دوستیں۔

آخر میں نے ہمت جوڑی تھی۔

"میں نہیں جانتی محبت کیا ہوتی ہے...... کیسے ہوتی ہے...... میری زندگی میں محبت میرے ابو کے روپ میں میرے سامنے ہے۔ شاید دنیا میں سب سے زیادہ اسی ٹاپک پر گفتگو کی گئی ہے...... رہی ہے...... اس لفظ کا وجود اتنا وسیع ہے کہ سارے دلائل، ساری فلاسفیاں، کم پڑ جاتی ہیں اور میرے نزدیک واقعی یہ ایک مریکل (معجزہ) ہے جو کبھی بھی، کہیں بھی کسی بھی وقت، کسی کے ساتھ بھی وقوع پذیر ہو سکتا ہے۔" میں یہ سب کہہ کر پلٹ آئی تھی...... ہر کسی نے تالیاں بجائی تھیں۔

"مگر وہ بردبار سا شخص کمال اطمینان سے سب کی آرا سن رہا تھا...... اور اس کے چہرے پر مدھم سی ایک مسکراہٹ تھی۔

سر گردیزی اب روسٹرم پر کھڑے تھے...... شاید انہیں کچھ کہنا تھا۔ سر گردیزی نے اشارے سے کسی کو بلایا تھا...... میں نے پلٹ کر دیکھا تھا بلیو جینز کے اوپر وائٹ سلور شرٹ پہنے، کلائی میں مہنگی سی گھڑی باندھے وہ وہی تھا...... سر اب تعارف کرا رہے تھے۔

"اسٹوڈنٹس...... یہ آپ کے نئے دوست ہیں...... انہیں ویلکم کہیں...... یہ ہمارے قریبی عزیز

یہ بھی آپ کے ساتھی بن کر آپ کی محفلوں کا حصہ بنیں گے...... ان کا تعلیمی ریکارڈ انتہائی شاندار ہے۔" وہ سر کے پاس خاموش سا کھڑا تھا...... مگر میں جانتی تھی اس کی آنکھیں بول رہی تھیں جیسے سارے ان کہے راز آج کھولیں گی...... اسے دیکھ کر کئی لفظ ذہن میں آتے تھے "ڈیشنگ، ذہین، ..."

ساری کلاس اب پرجوش ہو کر "ویلکم، ویلکم" کے نعرے لگا رہی تھی...... رانیہ اور عاشی اس میں پیش پیش تھیں۔ وہ سر کو خم دے کر دھیمے انداز میں مسکرا رہا تھا...... اس کا نام "امر" تھا۔

پچھلے بینچ پر بیٹھی شاہدہ بولی تھی۔ "واؤ سو چارمنگ۔" جانے کیوں مجھے یہ فقرہ برا لگا تھا...... مجھے کیا ہو رہا تھا؟ مجھے عاشی کے الفاظ یاد آئے تھے۔

"محبت آپ کو اپنا نہیں رہنے دیتی...... آپ کی روح تک کو پرایا کر دیتی ہے۔"

میں بھی میں نہیں رہی تھی شاید...... یہ غلط ہو رہا تھا۔ میں کوریڈور میں بیگ تھامے عاشی اور رانیہ کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی...... وہ دونوں کسی بحث میں الجھی ہوئی تھیں...... میں غیر ارادی طور پر ادھر ادھر جوش کیمپس میں مشغول طالب علموں کو دیکھ رہی تھی۔ عاشی نے میرا ہاتھ تھاما۔

"تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے......؟"

"وہ کس بارے میں پوچھ رہی تھی......؟ مجھے کچھ بھی خبر نہ تھی...... ابھی میرے وجود میں اتری ہوئی تھی۔

"آر یو اوکے......؟" رانیہ نے تشویش سے مجھے دیکھا تھا...... میں زبردستی مسکرائی تھی۔

"ڈونٹ وری، آئی ایم اوکے۔" میں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا...... مگر میرا اطمینان رخصت ہو چکا تھا...... کیا کوئی شخص پہلی نظر میں اسیر کر سکتا ہے؟

☆☆☆

میں بس اسٹاپ سے گھر دو گھنٹے میں پہنچی تھی۔ کیونکہ آج بس کافی لیٹ آئی تھی۔ ابا لاؤنج میں بیٹھے خبریں سن رہے تھے...... انہوں نے غور سے مجھے دیکھا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو......؟"

"جی میں ٹھیک ہوں...... بس تھک گئی ہوں۔" میں نے فائلز اور بیگ صوفے کی طرف اچھال دیا تھا۔

"کیسا رہا آج کا دن......؟" وہ پوچھ رہے تھے...... یہ ان کی اور میری ایک اور مشترکہ عادت تھی۔ ہمیں ایک دوسرے کے دن گزارنے کے احوال میں خاصی دلچسپی تھی۔

"آج ٹیوٹوریل تھا ناں......"

"گڈ...... پھر کس موضوع پر بات ہوئی......؟"

انہوں نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی بند کر دیا تھا۔

"محبت کے موضوع پر......" میں نے ہنس کر کہا تھا...... وہ ایک دم چونکے تھے اور سیدھے ہو بیٹھے۔

"گریٹ...... پھر ہماری بیٹی نے کیا روشنی ڈالی اس موضوع پر......"

"بس جو الٹا سیدھا ذہن میں آیا بول دیا......" تبھی مجھے کچھ خیال آیا تھا اور میں ہنسی ابلنے، ... سیدھے سے مجھے رانیہ کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ کتنی سادگی، بے ساختگی اور بچگانہ پن تھا ناں اس میں۔

واقعی کچھ دوست بہت عزیز ہوتے ہیں...... اور رانیہ اور عاشی مجھے بہت عزیز تھیں۔

"کھانا گرم ہے...... جا کر کھا لو......"

"ابا...... دل نہیں چاہ رہا...... بعد میں کھا لوں گی......"

"تمہارا یہ بعد کبھی نہیں آتا......" انہوں نے ... تھا۔

"نو ابا، آرام کرنا چاہتی ہوں...... تھک گئی ہوں......"

میں اٹھ کر کمرے کی طرف آ گئی تھی۔ پھر سو... چار بجے اٹھی...... ابا اور میں نے چائے اکٹھے ... پھر ابا باہر چلے گئے پانچ بجے ٹیوشن پڑ...

والے بچے اکٹھے ہوگئے۔ سارا آنگن ان کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

تبھی ابراہیم کی امی مٹھائی لے آگئیں...... ابراہیم کے پاس ہونے کی خوشی میں......

"آپ نے کیوں تکلیف کی......" میں نے انہیں کہا۔

"نہ...... دھی...... نہ یہ تو تیرا حق اے...... تو اتنی محنت کردی ایں بچہ نال...... میں جانتی ہوں یہ بچے تو بگڑے ہوتے ہیں......" وہ پنجابی بہت پیاری بولتی تھیں۔

"نہیں...... بس بچے ہوتے ہی ایسے ہیں...... ان کی شرارتوں میں ہی زندگی ہے......"

"بس میری دھی...... ایہہ تیرا احسان ہے جو توں ان بلاؤں کو سنبھال لیندی ہے۔"

میں ہولے سے ہنس دی تھی...... اور سبق پڑھتی "بلاؤں" نے تیکھی نظروں سے ابراہیم کی امی کو دیکھا تھا اور پھر بطور خاص ابراہیم کو بھی گھوریوں سے نوازا گیا۔ ابراہیم بے چارہ کھسیا گیا تھا۔

"اماں...... ہن بس کی بس وی کرو۔"

"ابراہیم...... تو وادی نہ بنا کر...... جا بیٹھ کے اپنا سبق یاد کر......"

میں نے انہیں متوجہ کیا۔

"اور سنائیں...... بھابھی کیسی ہیں آپ......؟"

"بس ٹھیک آں اللہ سوہنڑے دا شکر اے......"

انہوں نے مٹھائی کا ڈبہ اور دو سو روپے زبردستی میرے ہاتھوں میں دیے۔

"میں یہ نہیں لے سکتی بھابھی......" انہوں نے دکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"میرو غریب جو آں...... انکار کردی پئی ایں پارسا......"

میں نے بوکھلا کر انہیں دیکھا اور ڈبہ اور پیسے تھام لیے...... "ایسی بات نہیں بھابھی...... آپ پہلے ہی اتنا مشکل وقت گزار رہی ہیں۔" میں نے وضاحت دی تھی۔

"غلط بات نہ کر...... غریباں دے دل چھوٹے نہیں ہوتے...... خوش ہوں تو رب راضی ہوں...... میری خوشی توں ویکھ لے...... اللہ تجھے خوش رکھے۔" وہ دعائیں دیتی، میری پیشانی چوم کر چلی گئیں تو میں اپنی بلاؤں کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ جو ابراہیم کو گھیرے میں لیے بیٹھے تھے۔

"تمہاری امی نے ہمیں بلائیں کہا ہے...... ہم سے نہ بولنا اب کبھی بھی......"

میں نے مشکل سے صلح صفائی کروائی تھی۔

آنگن میں چڑیاں آب خوروں میں پانی پی رہی تھیں...... ایک قطرہ حلق میں جاتا تو سر اٹھا کر آسمان کی طرف نگاہ کرتی تھیں...... میں نے انہیں دیکھا تھا اور سوچ کر مسکرائی تھی۔

"یہ پرندے بھی ناں...... کتنے شکر گزار ہوتے ہیں...... ہر نوالے پر خالق کا شکر ادا کرنے والے اور انسانوں میں تو شکر گئے دنوں کی بات بن کر رہ گئی ہے......"

شام کا ہلکا نارنجی پن دیواروں پر لرز رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن یونیورسٹی میں ہم فری پیریڈ میں کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے...... عاشی جوس پی رہی...... اور رانیہ چپس ٹھونس رہی تھی...... اور میں "پیار کا پہلا شہر" میں سر دیے بیٹھی تھی...... کچھ صفحے رہتے تھے جو میں جلد از جلد ختم کر کے احمر کو لوٹا دینا چاہتی تھی...... میں نے زور سے کتاب بند کی تھی...... میرا اپنا دل بند ہوا جا رہا تھا۔

"سنان نے پاسکل کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔" میں نے کہا...... عاشی نے اسٹرا گھماتے ہوئے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا...... اور رانیہ بچے کھچے چپس نگلتی میری طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"سنان کون ہے؟" عاشی نے پوچھا تھا۔

"پیار کا پہلا شہر کا ہیرو......" میں نے اداسی سے کہا تھا۔

"اور پاسکل کون ہے......؟" یہ سوال رانیہ کی طرف سے آیا تھا۔

"پیار کا پہلا شہر کی ہیروئن......" میں نے اپنے آپ کو بمشکل رونے سے روک رکھا تھا...... عاشی نے میرے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے تھے۔

"اوہ...... ہیپی اینڈنگ نہیں ہوئی کیا......؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ میں اس ناول کو کبھی بھی نہیں بھول پاؤں گی...... شاید ساری زندگی مجھے پاسکل کا دکھ بے چین رکھے گا......"

"اوہو...... ناول ہی تو تھا...... کون سی رئیل اسٹوری تھی۔" عاشی نے مجھے کہا تھا۔

میں اداس ہنسی ہنسی تھی۔ "ہاں عاشی بس ناول ہی تو تھا...... تمہیں کیا پتا لفظوں کی دنیا میں کچھ انسانوں کو کیسے بدل کر زندگی جیتا دکھا دیا جاتا ہے۔"

"تو کیا سنان پاسکل کو چھوڑ کر چلا جاتا......؟"

"پتا نہیں...... مگر پلیٹ فارم پر لوگوں کے ہجوم میں صدائیں لگاتی پاسکل مجھے کبھی نہیں بھولے گی...... کبھی بھی۔"

"ہاں...... یہ وقتی فیز ہے...... جلد تم یہ سب بھول جاؤ گی......"

"کچھ کہانیاں کبھی بھی نہیں بھولتیں۔" میں نے کہا تھا۔

ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی تھی کہ حماد ہمارے پاس آن کھڑا ہوا...... مجھے شدید غصہ آیا تھا۔ مجھے اس شخص سے انتہا درجے کی چڑ تھی...... مگر یہ تھا کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔

"پارسا...... مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ کہہ رہا تھا...... میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی۔" میرے لہجے میں رکھائی تھی۔

"میں آپ کا عقبی گارڈن میں ویٹ کر رہا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر چلا گیا...... عاشی نے مجھے دیکھا۔

"جاؤ...... پارسا...... اس کی بات سن لو۔"

"مگر عاشی......؟"

"اگر اپنا تماشا بنوانا ہے تو یہیں بیٹھی رہو...... چلو رانیہ کلاس کا ٹائم ہونے والا ہے...... پارسا بات کر کے آجائے گی۔" عاشی نے اٹھ کر رانیہ کا ہاتھ تھاما۔

"مم...... مگر مجھے بھی حماد بھائی سے بات کرنا تھی۔"

رانیہ منمنائی تھی مگر عاشی اسے تھامے آگے بڑھ گئی...... میں مرتی کیا نہ کرتی...... آر یا پار کا فیصلہ کرتی عقبی گارڈن کی طرف آرہی تھی جب موڑ مڑتے ہی کسی سے ٹکرائی تھی۔

"آپ دیکھ کر نہیں چل......"

میری زبان وہیں گنگ ہوئی تھی۔ میرے سامنے احمر کھڑا تھا......

"آئی ایم سوری......" اس نے کہا تھا......

"اٹس اوکے......" میں دھیما سا مسکرائی تھی اور کتاب اس کے سامنے کر دی۔ "یہ آپ کی بک......"

وہ چونکا تھا۔

"اوہ...... تو وہ آپ تھیں......"

وہ دھیما سا مسکرایا تھا...... کیا وہ جانتا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کتنی پاورفل ہے۔ لوگوں کو مقناطیس کی طرح کھینچتی ہے۔ اس نے کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔

"کیسی لگی یہ......؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"بہت زبردست۔"

میں نے کہا...... وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔

"جی بالکل مستنصر صاحب بہت اچھا لکھتے ہیں اور یہ کتاب تو بیسٹ سیلر ثابت ہوئی تھی۔" احمر نے بھی اپنا تبصرہ پیش کیا۔ ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ حماد وہیں آگیا...... اس نے تالی بجائی تھی۔

"بہت خوب پارسا...... تم تو واقعی "پارسا" ہو...... یہ ہے تمہاری مصروفیت...... مجھ سے بات کرنے کے لیے تمہارے پاس پانچ منٹ نہیں اور یہاں صدیاں وارن کی جا رہی ہیں۔" اس کی بات نے مجھے آگ لگا دی تھی۔

"جسٹ شٹ اپ......" میں نے چلا کر کہا تھا...... احمر دم بخود سارا معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اوہ پلیز...... اب اپنے ڈھونگ بند کرو...... چادر اوڑھنے سے، لڑکوں سے بات نہ کرنے سے، کوئی پارسا نہیں بن جاتا...... مجھے تو تمہارے چال چلن پر پہلے ہی شک تھا۔" وہ بھڑک رہا تھا۔

سارے لوگ ادھر متوجہ ہو گئے۔ مجھے ان گنت نگاہوں کی بازپرس سے خوف آیا تھا...... جس چیز کی میں برسوں سے حفاظت کرتی آ رہی تھی...... آج وہی چیز چوراہے میں تماشا بنا دی گئی۔

حماد سکندر کون ہوتا تھا میرے کردار کی گواہی دینے والا......؟

میرا ہاتھ اٹھا اور حماد کے چہرے پر نشان چھوڑ گیا تھا...... وہ طیش سے بھرا مجھے دیکھ رہا تھا۔ پھر ادھر ادھر کھڑے طالب علموں سے مخاطب ہوا تھا۔

"سب دیکھو...... اتنے مہینے مجھے چکر دیتی رہی یہ شریف زادی اور اب نیا امیر لڑکا پھانس لیا......" وہ تمسخر اڑاتا کہہ رہا تھا......

"مسٹر...... یقیناً آپ کو کوئی مس انڈرسٹینڈنگ ہوئی ہے۔" حماد نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"واہ جی واہ...... پول کھل جائے تو غلط فہمیاں ہوتی ہیں......"

میں نے اپنے آپ کو زندہ قبر میں دفن ہوتا محسوس کیا تھا...... مجھے لگا میں اپنے قدموں پر کھڑی نہیں رہ سکوں گی......

کچھ بھی نہیں بچا تھا...... میری طرف انگلیاں کھڑی کر کے سرگوشیاں کی جا رہی تھیں۔

مجھے ان سرگوشیوں سے خوف آ رہا تھا...... میں نے اپنے آپ کو زمین پر گرتا ہوا محسوس کیا۔ آخری دو چہرے جو میں نے اپنی بند ہوتی آنکھوں سے دیکھے تھے وہ عاشی اور رانیہ کے تھے۔

مجھے ہمیشہ سے ہی الزام دیتی نگاہوں سے خوف آتا تھا۔

مگر اب...... یہ سب کیا ہو رہا تھا......؟ اگر سب ابا کو پتا چلا تو......؟ وہ تو جیتے جی مر جائیں گے۔

ادھر ادھر سے آوازیں آ رہی تھیں "ایمبولینس کو کال کرو......" عاشی اور رانیہ پریشان سی بے ہوش پارسا کو تھامے بیٹھی تھیں۔

حماد منظر سے غائب ہو چکا تھا...... احمر شدید پریشانی میں گہرا سوچ رہا تھا کہ آگے اسے کیا کرنا چاہیے۔

☆☆☆

میں نے کرسی جلال نور کی طرف گھماتے ہوئے دیکھا کھڑکی کے شیشے تھا...... وہ جب بھی میرے کمرے میں آتی تھی کے پار دیکھتے ہوئے بات کرتی تھی...... آج بھی وہ یہی کر رہی تھی۔

"مجھے ڈائیورس چاہیے۔" اس کے لہجے میں مکمل اطمینان تھا۔

"کیوں......؟" میں نے پوچھا...... جانے کیوں مجھے وہ سارے زمانے سے خفا لگتی تھی۔

"میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں۔

"آئی ریزن۔" میرا پہلا سوال تھا...... مجھے وجہ ڈھونڈنا تھی۔

"میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔"

"تم سے کس نے کہا......؟"

"مجھے پتا ہے......"

"اوکے...... تو پھر میرا فیصلہ سنو......" وہ پہلی بار میری طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"میں تمہیں کبھی بھی ڈائیورس نہیں دوں گا۔"

ایک پل میں اس کی آنکھیں بھیگی تھیں...... وہ مڑی اور دروازہ زور سے بند کر گئی...... میں کرسی سے اٹھ کر اس کی چھوڑی ہوئی جگہ پر جا کھڑا ہوا تھا۔

"تم بہت ضدی ہو...... مگر خیر...... میں تمہیں کبھی بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"

موبائل کی تھرتھراہٹ نے مجھے چونکایا تھا...... میں نے ٹیبل سے موبائل اٹھایا...... جلتی بجھتی

اسکرین پر لکھا آ رہا تھا۔

"عمارہ کالنگ......"

میں مسلسل تین دنوں سے اس کی کالز نظر انداز کر رہا تھا...... مگر کبھی تو مجھے اس کا سامنا کرنا ہی تھا نا۔ میں نے گہرا سانس لیا اور موبائل کان سے لگا لیا تھا۔

"ہیلو...... کیسے ہو......"

"ٹھیک ہوں......"

"میری کالز کیوں ریسیو نہیں کر رہے تھے۔"

"میں تم سے شرمندہ تھا......"

"اب نہیں ہو کیا......؟" عمارہ تلخی سے ہنس دی تھی۔

"اب بھی ہوں......" میں نے بمشکل کہا تھا۔

"وہ کیسی ہے......؟" وہ پوچھ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" ہاں وہ ٹھیک ہی تھی جو ابھی مجھ سے طلاق کی ڈیمانڈ کر کے گئی تھی۔

"خوب صورت ہے کیا......؟" دوسرا سوال۔

"مجھے لگتی ہے۔" دوسری طرف عمارہ نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"بہت محبت کرتے ہو اس سے......" اس نے پوچھا تھا۔

"ہاں...... بہت زیادہ۔" میں نے پورے یقین سے کہا تھا۔

"کیا میں آج اس بات کا یقین کر لوں کہ احمر جہاں زیب کو کبھی مجھ سے محبت تھی ہی نہیں۔"

وہ رو رہی تھی...... میرے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ جب میں روتا تھا تو ہمیشہ اس نے مجھے چپ کروایا تھا...... مگر آج وہ خود رو رہی تھی...... اور میں اسے چپ نہیں کروانا چاہتا تھا۔

"ہاں...... تمہیں یقین کر لینا چاہیے عمارہ......"

دوسری طرف عمارہ کی سسکی نکلی تھی...... لہجہ رندھ سا گیا تھا...... میری بچپن کی دوست رو رہی تھی۔

"تم خوش تو ہو نا احمر......" وہ پوچھ رہی تھی۔ مجھے لگا میں ابھی رو دوں گا۔

"میں بہت خوش ہوں عمارہ......"

وہ ادھر سے بولی تھی۔ "اللہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھے آمین۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔

میں نے موبائل بیڈ کی طرف اچھال دیا تھا—— میں کچھ دیر وہیں سانس ہموار کرتا کھڑا رہا۔ پھر اس کے بیڈروم کی طرف چل دیا...... دروازہ کھولتے ہی وہ سامنے بیٹھی نظر آ گئی تھی۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے فرش پر نظریں جمائے بیٹھی تھی...... میں بھی اس کے سامنے وہیں بیٹھ گیا تھا۔

"پتا ہے ابھی کس کا فون آیا تھا......؟"

اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ سوالیہ آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔

"عمارہ کا فون آیا تھا...... وہ میری بچپن کی دوست ہے۔ ہم اکٹھے پلے بڑھے ہیں۔ امی، ابو کی وفات کے بعد بھی اسی نے مجھے سہارا دیا تھا...... اس نے مجھے ابھی اس لیے فون نہیں کیا کہ میں نے اتنی اچانک شادی کیوں کر لی وہ بھی کسی کو بغیر بتائے...... اس نے تو صرف ایک سوال پوچھنے کے لیے فون کیا...... پتا ہے وہ سوال کیا تھا......؟" میں نے بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"اس نے صرف یہ پوچھا کہ وہ اپنے دل سے میری محبت کا یقین نکال دے...... اور میں نے پتا ہے کیا جواب دیا......؟" میری نظریں اس کے ہاتھوں پر جمی تھیں۔

"میں نے عمارہ کو کہا...... ہاں وہ یہ یقین دل سے نکال پھینکے کیونکہ میں پارسا جہانگیر سے بہت محبت کرتا ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا...... وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جھوٹ بول رہے ہیں آپ...... آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے بلکہ آپ تو اس ریلیشن سے صرف سمجھوتہ کر رہے ہیں۔" وہ غصے میں تھی...... میں جانتا تھا...... اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

"آپ یہ محبت کا ڈھونگ بند کریں...... کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا...... میں ایک عام سی یتیم لڑکی

ہوں...... جس سے کوئی بھی محبت نہیں کر سکتا......"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سخت غصے میں تھی۔

"ہماری شادی ایک حادثہ تھی...... اور حادثے کبھی بھی محبت کی وجہ نہیں بنتے......"

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی تھی۔

اس دن یونیورسٹی میں جو کچھ بھی ہوا تھا...... جانے اس میں اللہ کی کیا مصلحت تھی؟ پارسا کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا...... اور ہم ہسپتال پہنچے ہی تھے کہ وہیں ہمیں پارسا کے ابا کی وفات کا پتا چلا تھا۔ ہم سارے...... عاشی اور رانیہ سب دم بخود تھے۔

پارسا کے محلے کے کچھ بزرگ بھی جمع تھے...... شاید وہی پارسا کے ابا کو وہاں لائے تھے اور پارسا...... وہ بار بار ہوش میں آ کر بے ہوش ہو جاتی تھی۔

ہم کوریڈور میں ٹہل رہے تھے جب عاشی نے مجھے پوری تفصیل سے پارسا کی زندگی کے بارے میں تفصیل سے بتایا...... یونیورسٹی میں جو بھی ہوا تھا...... اس کا میں خود کو بھی کسی حد تک قصوروار سمجھ رہا تھا...... میں اپنی پوری زندگی کسی بھی گلٹ کے ساتھ نہیں گزار سکتا تھا۔

میں پارسا کو نہیں جانتا تھا...... اور پارسا مجھے نہیں جانتی تھی۔

میں اپنی زندگی میں اکیلا تھا...... امی اور بابا کی وفات کے بعد ان کی جائیداد کا اکلوتا وارث...... اور میری واحد دوست عمارہ تھی جو کہ ابا کے دوست کی بیٹی تھی۔ ہمارا بچپن اکٹھا گزرا تھا۔ میں نے پارسا کے ابا کی تدفین میں بھی حصہ لیا تھا...... زندگی میں کچھ فیصلے ہمارے ہاتھوں قدرت کرواتی ہے...... شاید میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا...... اور میں نے پارسا سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ سب پارسا کے والد کے دوست، عاشی اور رانیہ کی فیملیز کے توسط سے ممکن ہوا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ شاید اپنے گلٹ سے آزاد ہونے کے لیے کیا تھا...... مگر یہ گلٹ محبت کے سانچے میں ڈھل جائے گی مجھے قطعاً بھی یقین نہیں تھا۔

اور آج میں سر گردیزی کی کلاس میں ہونے والی گفتگو کو یاد کر رہا ہوں۔ شاید ہاں...... ہاں محبت معجزہ ہوتی ہے جو وجود پر اترتی ہے تو سب بدل دیتی ہے۔

"لو از آ مریکل۔"

☆☆☆

کسی حرف میں کسی باب میں نہیں آئے گا
ترا ذکر میری کتاب میں نہیں آئے گا
نہیں جائے گی کسی آنکھ سے کہیں روشنی
کوئی خواب اب کے عذاب میں نہیں آئے گا
کوئی خود کو صرف نہیں کرے گا میری طرح
کوئی خواہشوں کے سراب میں نہیں آئے گا
دل بدگماں ترے موسموں کو نوید ہو
کوئی خار دست گلاب میں نہیں آئے گا
اسے لاکھ دل سے پکار لو، اسے دیکھ لو
کوئی ایک حرف، جواب میں نہیں آئے گا
تری راہ تکتے رہے، اگرچہ خبر بھی تھی
کہ یہ دن بھی تیرے حساب میں نہیں آئے گا

میں چپ چاپ بیٹھی عاشی اور رانیہ کی باتیں سن رہی تھی...... عاشی نے گہرا سانس لے کر مجھے دیکھا تھا۔

"محبت کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے اور محبت کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور ہم محبت کے بغیر نہیں رہ سکتے...... اس طرح انسان زندگی میں کرائسز سے بھی گزرتا ہے...... میں جانتی ہوں تم اس وقت اس سب کے لیے تیار نہیں ہو...... مجھے انکل کی وفات کا بھی بہت دکھ ہے...... یہی زندگی ہے، ہر کسی کو جانا پڑتا ہے...... ہمارے، تمہارے رونے سے جانے والے رکا نہیں کرتے۔"

وہ اب خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

میرے ایک طرف رانیہ اور دوسری طرف عاشی بیٹھی تھی۔

"اور یہ بات اب تم بھی مان لو کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا...... اب یہی تمہارا گھر ہے...... اور احمر جیسا شوہر قسمت والوں کو ملتا ہے...... اور اگر وہ کہہ رہا ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے تو تمہیں یقین کر لینا چاہیے...... اسے کسی کو بھی یہ وضاحت دینے کی ضرورت نہیں کہ وہ پارسا سے محبت کرتا ہے...... مگر پھر بھی وہ ایسا کر رہا ہے...... صرف اس لیے کہ وہ واقعی تم سے محبت کرتا ہے اور یہی سچ ہے۔"

وہ سمجھ رہی تھی کہ اسے مجھ سے سب کچھ کلیئر کر لینا چاہیے۔

اور میں جانتی تھی کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ رانیہ نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔

"پارسا...... مرد نامی مخلوق انتظار نہیں کرتی...... سنبھل جاؤ...... اور سوری کر لو اس سے......"

"سوری...... ؟"

"ہاں...... تمہیں کرنا ہوگا کیونکہ یہ بات تمہیں پہلے تسلیم کر لینی چاہیے تھی۔"

عاشی نے لاؤنج کی دیواروں پر لگی پینٹنگز کو دیکھا...... اتنا بڑا محل جیسا گھر تھا، نوکر، چاکر، گاڑیاں اور ایک اچھا خوش شکل شوہر......

کس چیز کی کمی تھی...... ؟ کسی شے کی بھی نہیں۔

"اب تم اس گھر کی ملکہ ہو۔ تمہیں سب کچھ سنبھالنا ہوگا۔ یہ گھر، نوکر چاکر سب کچھ تمہارا ہے۔"

وہ مجھے سمجھا رہی تھی۔

وہ دوپہر کو آئی تھیں اور شام کا کھانا کھا کر گئی تھیں۔ میں نے انہیں سارا گھر دکھایا تھا۔ وہ بار بار میری قسمت پر رشک کر رہی تھیں۔

میں نے تو ہمیشہ آب خوروں سے پانی پیتی چڑیوں کے شکر کے انداز کو دیکھ کر سبق سیکھے تھے تو آج میں کیوں ناشکری کر رہی تھی...... ؟

میں برآمدے میں ٹہلتے ہوئے...... سوچ رہی تھی۔

مجھے اپنا گھر یاد آ رہا تھا جس کی چابیاں میرے بیگ میں پڑی تھیں۔ میں نے اکثر بن ماں کی لڑکیوں کو معاشرے میں خوار ہوتے دیکھا تھا...... میں نے اسی لیے ایک صاف شفاف زندگی گزاری تھی...... ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔

میں نے ایک لڑکا بن کر زندگی گزاری تھی...... شاید میری یہی غلطی تھی۔ میں مضبوط خول کی طرح تھی...... مگر خول ٹوٹ ہی گیا آخر۔

مجھے ہنسی آتی ہے کہ میں کس طرح دوسروں کو مشکل میں دیکھ کر ان کی مشکل میں کود پڑتی تھی۔ مگر پارسا حیات کو مشکل میں دیکھ کر کوئی بھی مدد کو نہیں آیا تھا...... کوئی بھی نہیں...... اور میرے مقدر نے مجھے احمر جہاں زیب دے دیا۔

جو کسی معجزے کی مانند میرے وجود میں اترا تھا۔

میں نے پہلی بار اسے رحمو چاچا کے پاس کتابیں خریدتے دیکھا تھا۔ دوسری بار یونیورسٹی میں...... اور اب ہر روز...... ہر صبح...... ہر شام۔

زندگی کب کون سا روپ دھار لے کچھ خبر نہیں...... اور مجھے جانے کیوں لگتا تھا کہ احمر تو کفارہ ادا کر رہا ہے...... اس کا تو رتی برابر بھی قصور نہیں، تو وہ یہ سب کیوں کر رہا ہے...... ابا کے دنیا چھوڑ جانے میں احمر جہاں زیب کا تو کوئی قصور نہیں ہے ناں...... تو پھر وہ کیوں سزا بھگتے...... ہاں غلطی تو میری ہی ہے۔

پارسا حیات کی...... اور معافی بھی میں ہی مانگوں گی......

تمہاری آنکھ کا آنسو، ہماری آنکھ سے نکلا
شکایت اب بھی باقی ہے محبت ہم نہیں کرتے

☆☆☆

وہ وہیں کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھتی مجھ سے باتیں کر رہی تھی...... مجھے شدید حیرت ہوئی کہ وہ آج اتنے دوستانہ موڈ میں کیوں ہے...... اور اگر وہ اپنا ڈائیورس والا سوال بھی نہیں دہرا رہی تھی تو......؟

میں آج بھی کرسی پر جھول رہا تھا...... جب اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا کہ میں اسے توجہ سے دیکھ رہا تھا یا نہیں...... اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی تھی۔

"میں نہیں جانتی تھی کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا

کہ میں پیچھے مڑ کر دیکھوں گی تو سب کچھ بدل چکا۔ اب مجھ سے کتابوں پر بحث کرنے والے ابا نہیں ہوں گے۔''

''تم مجھ سے کتابوں پر بحث کر لینا۔''
وہ ہنسی تھی

''انسان، انسانوں کے متبادل نہیں ہوتے شاید ...... آپ بھی نہیں ہیں۔''

میں چپ بیٹھا رہ گیا تھا...... مجھے اسے سننا تھا تب تک جب تک وہ اپنی بات مکمل نہیں کر لیتی۔

وہ میری طرف سے نگاہیں چرائے دور کہیں نظریں جمائے ہوئی تھی...... اس نے شال اوڑھی ہوئی تھی۔ پشت پر لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔

''میں نے آپ کو پہلی بار کتابوں کے اسٹال پر دیکھا تھا...... اور میں بہت حیران ہوئی تھی کہ ایک مرد اتنا خوش شکل کیسے ہو سکتا ہے...... اس دن میں نے آپ کو بہت سوچا تھا...... آپ کی دی ہوئی کتاب میں نے سنبھال کر رکھی تھی کہ کب آپ کو دینی پڑ جائے...... پھر میں نے آپ کو یونیورسٹی میں دیکھا اور اس اتفاق پر میں حیران رہ گئی تھی...... مجھے جانے کیوں ایسا لگا۔ آپ کے وجود میں کوئی مقناطیس فٹ ہے جو دھیرے دھیرے مجھے کھینچ رہا ہے...... میرے نزدیک شاید محبت ''حادثہ'' تھی جو کبھی بھی، کہیں بھی، کسی بھی وقت ہو سکتی ہے...... اور کچھ کے خیال میں محبت تو کسی مریکل (معجزہ) کی طرح ہوتی ہے کب آپ کی روح کا تعلق کسی اور سے جوڑ دے پتا بھی نہیں چلتا...... سمجھ ہی نہیں آتی ......''

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ اسے مجھ سے محبت تھی ...... یا پھر جو بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جنہیں شاید وہ پونچھ رہی تھی۔

''اور اس دن کے حادثے نے مجھے توڑ کر رکھ دیا...... حماد ہمارا کلاس فیلو ایک بگڑا ہوا رئیس زادہ تھا جو پہلے بھی کئی بار میرا راستہ روکتا رہا مگر میں یہ سوچ کر خاموش رہی کہ کہیں کوئی تماشا ہی نہ بن جائے...... اماں کی وفات کے بعد ابا بہت کمزور پڑ گئے تھے...... انہیں نت نئی بیماریوں نے گھیر لیا تھا اسی لیے انہوں نے مجھے پڑھنے کی اجازت اس شرط پر دی کہ میں ان کی عزت کا پاس رکھوں...... اور ثابت قدم رہوں۔

میں ہمیشہ انہیں کہتی رہی کہ انہیں مجھ پر اعتبار نہیں تو وہ کہتے تھے کہ انہیں زمانے پر اعتبار نہیں ...... اور پھر میں نے اپنی خود اعتمادی کے بل پر جینا شروع کر دیا...... میں کسی بھی غلط بات پر خاموش نہیں رہی۔ میں نے ہر قدم پھونک، پھونک کر اٹھایا مگر پھر بھی اس دن حماد کی باتوں نے مجھے زندہ درگور کر دیا...... میں بے ہوشی کی حالت میں جب اسپتال پہنچی تو مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ ابا مجھ سے پہلے ہی وہاں زندگی کی جنگ ہار چکے تھے...... زندگی میں ویسا کبھی بھی نہیں ہوتا...... جیسا ہم چاہتے ہیں...... جیسا ہم سوچتے ہیں...... جو میں سوچتی تھی وہ کبھی نہ ہوا۔''

وہ اب آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

''اور آپ ...... آپ تو مجھے جانتے بھی نہیں تھے۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں آپ کا رتی برابر قصور بھی نہیں تھا مگر پھر بھی آپ نے ایسا کیوں کیا......؟''

وہ جواب مانگ رہی تھی مجھ سے ...... میں کرسی سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

ڈھلتی دوپہر کا وقت تھا...... ہلکی ہلکی ہوا سے پائن کے پتے ہل رہے تھے۔

''کیا پوچھ رہی ہو تم ...... یہی کہ میں نے تم سے شادی کیوں کی یا پھر میں نے تم سے محبت کیوں کی......؟'' میں نے پلٹ کر اس سے پوچھا تھا۔

''دونوں......'' وہ بولی تھی۔

میں نے سارے جمع شدہ لفظ کھنگالے تھے۔

''تمہیں شاید اب پتا چلا ہو کہ اوائل عمری سے ہی میں نے اکیلے زندگی بسر کی ہے...... والدین حیات نہ رہیں تو کیا ہوتا ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں...... جو کچھ بھی ہوا تھا اس کا مجھے گلٹ تھا کہ جو بھی ہوا کہیں نہ کہیں میری وجہ سے ضرور وقوع پذیر ہوا...... جب تم آئی سی یو میں تھیں تب عائشہ نے مجھے تمہارے بارے میں کافی کچھ بتایا تھا...... انسان کو کسی کو زیادہ خوشی میں دیکھ کر محبت ہوتی ہے یا پھر دکھ میں دیکھ کر۔

میں نے تمہیں دکھ میں دیکھا ...... جب تم کوریڈور کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی رو رہی تھیں اور رانیہ، عائشہ تمہیں حوصلہ دے رہی تھیں تو میں تمہارے سامنے کھڑا تھا...... مجھے اپنے اوپر بہت غرور تھا کہ میں پتھر دل ہوں مجھے اب کسی کا رونا، کسی کا غم نہیں پگھلا سکے گا...... دنیا کا سب سے بڑا غم ماں، باپ کا فوت ہو جانا ہوتا ہے اور میں غم کے اس فیز سے گزر چکا تھا...... اور تم اس وقت اس فیز میں داخل ہوئی تھیں...... مجھے تمہاری تکلیف پر تکلیف ہوئی تھی...... مجھے تمہارے آنسوؤں نے ساکت کر دیا...... میں سب بھول گیا۔ آس پاس کے لوگ ...... کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ میں صرف تمہیں دیکھ رہا تھا...... اور تب وہ ہوا جس کی اس دن سر کردیزی کی کلاس میں بحث چھڑی تھی...... ہاں پارسا۔

وہ محبت کا معجزہ تھا۔

میں پھر احمر جہاں زیب نہیں رہا...... میں تم ہو گیا۔ میں سمجھتا رہا کہ یہ گلٹ ہے جس نے مجھ سے اتنا بڑا فیصلہ کروایا مگر نہیں شاید یہ محبت تھی جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔

میں اس کی طرف مڑا تھا...... وہ ساکت کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ میں بالکل اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اس شادی پر راضی نہیں تھیں مگر عائشہ کے گھر والوں اور انکل واجد (پارسا کے والد کے دوست) نے تمہیں مجبور کر دیا...... میں جانتا ہوں یہ جو سب کچھ بھی ہوا، یہ سب حادثاتی طور پر ہوا...... میں اسی لیے تمہیں ڈائیورس کے لیے کہتا رہا کہ میں چاہتا تھا کہ تم سب کچھ جان لو...... اور پھر کوئی فیصلہ کرو...... اور میں اب یہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ تم آگے کیا کرنا چاہتی ہو۔ مجھے آج شام تک تمہارا جواب چاہیے پارسا۔''

میں یہ کہہ کر باہر آ گیا تھا...... میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی بھی فیصلہ دباؤ میں آ کر کرے۔ میں نے شام تک کا وقت بہت بے چینی میں گزارا تھا۔ کیا پتا پارسا ڈائیورس مانگنے پر اصرار کرے......؟

میں تب کیا کروں گا ...... میرے پاس کوئی چانس باقی رہے گی......؟

''یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔''

☆☆☆

میں چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھ کر لان میں چلی آئی جہاں وہ میرا منتظر بیٹھا تھا۔ ہم دونوں نے اپنے اپنے کپ اٹھا لیے اور خاموشی سے چائے پینے لگے۔

آج موسم کتنا اچھا ہے ناں ......'' وہ چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''کیا تم کل سے یونیورسٹی جوائن کرو گی......؟''
وہ پوچھ رہا تھا۔

''میں نہیں چاہتی تھی کہ میں لوگوں کے ڈر سے، خوف سے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دوں ...... عائشہ اور رانیہ بھی اتنا اصرار کر کے گئی تھیں۔''

''جی ...... میں کل سے کلاسز اٹینڈ کروں گی۔''
میں نے کہا تھا۔

''اس کا مطلب ہم روز یونی اکٹھے جایا کریں گے......؟''

بڑا اشتیاق تھا لہجے میں یہ سوال کرتے ہوئے...... میں نے بغور ان روشن آنکھوں والے شخص کی پیشانی کو دیکھا تھا۔

شاید وہ میرا جواب جاننا چاہ رہا تھا...... لان میں لگے رنگین بلبوں کی روشنی اطراف میں پھیل رہی تھی۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے یا نہیں۔'' میں نے براہ راست بات کی تھی۔ اس نے گڑبڑا کر کپ رکھ دیا اور خود کو آنے والے مرحلے کے لیے تیار کرنے لگا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ رہنا چاہوں گی...... مگر ایک شرط پر......" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" اس نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کی تھی۔

میں نے ہنسی دبائی تھی۔

"میں چاہتی ہوں میرا رشتہ ان لوگوں سے نہ ٹوٹے جنہیں میں پیچھے چھوڑ آئی ہوں...... میں نے زندگی کا بہت سارا وقت ان کے ساتھ گزارا ہے...... ہم ویک اینڈ وہیں ہمارے آبائی گھر میں گزاریں گے...... جہاں ہم نت نئی کتابوں پر بحث کریں گے...... ہر بحث میں جیت جاؤں گی...... رحمو چاچا سے کتابیں لینے اکٹھے جائیں گے۔ میں ڈھیر ساری بکس خریدوں گی...... تم مجھے لے کر دو گے ناں ؟"

میں نے ایک اہم سوال اٹھایا تھا۔

اور وہ رشتوں کو ترسا ہوا شخص کھل اٹھا تھا...... شاید میں غلط تھی کہ ہر ہنسنے، مسکرانے والا انسان خوش بھی ہوتا ہے...... بعض اوقات دوسروں کو دکھانے کے لیے ہنسی کے نقاب اوڑھنے ہی پڑتے ہیں...... اور وہ بھی تو کرتا تھا...... مجھے اس پل جانے کیوں وہ بہت اچھا لگا...... میرے دل میں اس کا احترام سر اٹھانے لگا تھا۔

"ہاں...... ہاں...... جو تم کہو گی وہی ہوگا۔"

یہ کہنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں پر رکھ دیا تھا...... جو میں ٹیبل پر رکھے بیٹھی تھی۔

"میں نے اپنی زندگی کا بہت عرصہ تنہا گزارا ہے۔ میں بہت خوش ہوں پارسا...... کہ تم میرے لیے اتاری گئیں...... ہم ایک چھوٹا سا سوئٹ ہوم بنائیں گے...... جہاں ہم، تم ہوں گے اور ہماری اپنی جنت ہو گی...... ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں گے...... ہر طرف خوشی کی بہاریں ہوں گی جن پر کبھی بھی خزاں نہیں آئے گی...... تم ایسا گھر بنانے میں میری مدد کرو گی ناں......؟"

وہ آس، امید سے مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

میں نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ہاں...... احمر...... ہم اپنا ایک سوئٹ ہوم بنائیں گے...... اتنی زندگی گزارنے کے بعد اب ہم تنہا نہیں رہیں گے۔"

میں کہہ رہی تھی تبھی ملازم نے آ کر مجھے فون تھمایا...... جانے کس کا تھا......؟ میں نے کان سے لگایا تھا۔

"پارسا...... میں نے جو ڈائیلاگ تمہیں لکھ کر دیے تھے...... تم نے بول دیے کیا......؟"

یہ رانیہ محترمہ تھیں...... میں ہنسی تھی۔

"ہاں...... رانیہ...... بول دیے۔"

میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا تھا...... تبھی ٹیبل پر رکھا احمر کا موبائل بجا تھا۔

"عمارہ کالنگ۔" میں دیکھ چکی تھی مگر انجان بن گئی۔ احمر نے چور نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کال پک کی تھی۔

"ہیلو...... ہاں، احمر جو تم نے مجھ سے ڈائیلاگ لکھوائے تھے پارسا کو سنا دیے کیا......؟ ایک تو تم فوراً بھول جاتے ہو۔"

آواز اتنی تھی کہ با آسانی میں سن سکتی تھی...... میں نے ہنسی دبائی تھی۔ احمر نے ہولے سے کہا تھا۔

"ہاں...... عمارہ...... کام ہو گیا تھینک یو......"

تبھی احمر نے موبائل رکھ کر مجھے دیکھا تھا......

میری نظریں اسی پر تھیں۔

ہماری نظریں چار ہوئی تھیں۔ ہم دونوں ایک جیسے تھے۔

اور ہم ایک ساتھ مسکرا دیے تھے۔

اور ہم دونوں ایک بات سوچ رہے تھے۔

محبت معجزہ ہے۔

سال نو مبارک

نادیہ جہانگیر

"کان کھول کر سن لو موحد۔ جب تک تمہاری بہن کی شادی نہیں ہو جاتی میرا سوچنا بھی مت۔" فون پکڑے وہ سختی سے بولی تو دوسری طرف موجود موحد پل بھر کے لیے خاموش سا ہو گیا۔

"بہت مشکل ہے ارم تم جانتی ہو یار! آپی کے سسر کو دو دن ہوئے ابھی بشکل سال پورا ہوا ہے۔ وہ ابھی وہاں ٹھیک سے سیٹ بھی نہیں ہو پائے، ایسے میں وہ کیسے واپس آ کر اتنی جلدی شادی کر سکتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، تم ان لوگوں کو فورس کرو، وہ اس سال یہ کام نبٹائیں۔"

"یہ کام نپٹانا آسان نہیں ہے ارم! تم کیوں بچوں جیسی باتیں کرتی ہو؟" موحد ذرا سا چڑ سا گیا جب ہی ایسا لہجہ اپنایا۔

"او کے، ٹھیک ہے جب یہ کام آسان ہو جائے تب مجھ سے رابطہ کرنا۔"

وہ غصے سے کہتی فون بند کر گئی۔ اسی وقت فون دوبارہ سے بج اٹھا۔ اس نے جان بوجھ کر کال کاٹ دی۔ کال دوبارہ سے آ گئی، اس نے پھر وہی حرکت کی

لیکن تیسری بار اس نے غصے سے فون اٹھالیا۔

''اب کیا بات کرنے کو رہ گئی ہے؟'' فون اٹھاتے ہی وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

''ایک تو تم غصہ بہت کرتی ہو۔'' جواباً موحد کا لہجہ نرم اور پیار بھرا تھا۔

''تو نہ کروں، میری کوئی بھی بات تم توجہ سے سنتے ہو نہ تسلی بخش کوئی جواب دیتے ہو۔'' وہ اب بھی بھڑکی ہوئی تھی۔

''تمہیں توجہ سے سننے کے لیے ہی تو فون کرتا ہوں یار۔'' وہ اب بھی نرم ہی تھا۔

''تو پھر آرام سے اپنی بہن کی شادی کا کچھ کرو۔'' اس کا انداز دوٹوک تھا۔

''یار! مجھ میں نہیں آتا تمہیں آخر ثمینہ آپی سے پرابلم کیا ہے؟''

''کیا یہ کافی نہیں، میں اپنے گھر میں کسی دوسرے کی مداخلت برداشت نہیں کرسکتی۔''

''ثمینہ آپی کوئی، دوسرا نہیں میری بہن ہیں۔ اور تمہاری پھوپھو زاد بھی۔'' اب کی بار اس کا لہجہ ذرا سا ناراضی لیے ہوئے تھا۔

''جو بھی ہو۔ میں چاہتی ہوں۔ میں جب بھی تمہارے گھر دلہن بن کر آؤں تمہارے سر پر کسی دوسرے کا بوجھ نہ ہو۔''

''ایسے تو میری ماں بھی ہیں۔'' وہ ذرا سا ترش ہوا۔

''آئی نو، لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں پھوپھو بھی کبھار تمہاری طرف تکتی ہیں۔ ان کا زیادہ جھکاؤ مسعود بھائی کی طرف ہے اور وہ مہینے کے بیس دن ادھر ہی گزارتی ہیں۔''

اس کے پاس ہر بات کا جواب موجود تھا۔ موحد گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''ایک بات کہوں ارم! تم سیلفش ہوتی جارہی ہو۔''

''تم جو بھی کہو، میں اپنے ذاتی گھر میں تمہارے اور اپنے سوا کسی کو برداشت نہیں کرسکتی۔ اور ہاں پھوپھو سے بات کرو اور اپنے چچا زاد کو جلدی واپس بلاؤ، بہتر ہے یہ کام جلدی ہوجائے۔''

وہ خود غرض تھی اسی لیے وہ کسی کی پروا نہیں کرتی تھی۔ اس نے موحد کو صاف لفظوں میں سب جتا دیا تھا۔ فون کے دوسری جانب بار بار چھا جانے والی موحد کی خاموشی کو جان بوجھ کر محسوس نہیں کررہی تھی۔

سب بہت دھڑلے سے کہہ کر۔ موحد کو خدا حافظ کہا، فون بند کرکے مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر آئی لیکن لاؤنج میں پہلا قدم رکھتے ہی بھائی کی آواز نے اس کا دوسرا قدم وہیں روک دیا تھا۔

''امی پلیز، جو بھی ہو آپ ان دو مہینوں کے اندر اندر ارم کا کام ختم کریں۔ اس کے بعد ہی میرا مسئلہ بھی حل ہوپائے گا۔'' اس کا بھائی کافی غصے میں لگ رہا تھا۔ انداز اور لہجے میں سرد مہری تھی۔

''لیکن ریمز، ایسے کیسے بیٹا، شادی کی تیاریوں میں تو سال لگ جاتا ہے۔''

''کوئی سال وغیرہ نہیں لگتا امی! بندے کے پاس پیسہ ہو تو دو دن میں بھی شادی کی تیاری ہوجاتی ہے۔''

اس کے بھائی کا انداز سپاٹ اور لہجہ دوٹوک تھا۔ وہ اس کا بھائی تھا تو بول چال بھی ایسی ہی رکھتا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

''پھر بھی ریمز! تمہاری پھوپھو بات کریں تو اور بات ہے ہم اپنے منہ سے کہتے اچھے لگتے ہیں بھلا۔'' ماں بے چاری ہچکچائی تھی۔

''امی! ارم کی شادی بعد میں بھی تو کرنی ہے نا تو ابھی کردیں گے تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔'' ریمز ہتھیلی پر سرسوں جمانے کو تیار بیٹھا تھا۔

''کیسی بات کررہے ہو بیٹا، ہم نے منگنی کے وقت تو ان لوگوں کو شادی کے لیے ڈیڑھ دو سال کا وقت دیا تھا۔''

''ہاں تو پھر کیا ہوا، اب تیاری ہوگئی تو بات ختم، آپ بس پھوپھو سے بات کریں، میں بھی موحد کو سمجھا

رہ گیا۔

''نہیں بیٹا۔''

''امی پلیز...... آپ جانتی ہیں عائقہ کس قدر ملنگ ہے۔ اس کی بھی شرط ہے کہ جب تک ارم کی شادی نہیں ہوجاتی، وہ اپنی رخصتی نہیں کروائے گی۔''

ریمز نے ہاتھ اٹھا کر ماں کو اصل بات بتائی تو ارم کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل تھا کہ ڈوبا جارہا تھا۔

''اسے آخر پرابلم کیا ہے میری بچی سے؟'' ماں کا لہجہ ترش ہوا، بیٹے کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

''آپ میرا گھر بسا ہوا جانتی ہیں یا نہیں......؟؟''

''کیوں نہیں بیٹا۔ ایک ماں کی اس سے بڑھ کر کیا خواہش ہوگی کہ اس کے بچوں کے گھر بسیں۔''

''تو پھر فضول کی بحث چھوڑیں اور چپ چاپ ارم کو چلتا کریں۔''

ریمز نے یوں تنفر سے کہا جیسے اس کی بہن نہ ہو بلا ہو۔ ارم کے کان سائیں سائیں کرنے لگے آنسو پلکوں کی باڑھ کو پھلانگنے لگے۔

''ریمز! میں عائقہ کو اچھی طرح جانتی ہوں، بچی ہے بچاری۔ اچھی خاصی اور سلجھی ہوئی بچی ہے، میں نہیں سمجھتی اسے ارم سے کوئی خار یا پرخاش ہوگی۔ صرف سال ڈیڑھ سال کی تو بات ہے۔''

''امی پلیز...... بس کردیں۔ یہ سب دکھاوے کی باتیں ہیں ورنہ اب کوئی بھی ایسی سلجھی ہوئی لڑکی نہیں جو اپنے گھر میں کسی دوسرے کی مداخلت برداشت کرے۔''

''ہمارے وقتوں میں تو دیور دیورانیاں جیٹھ جٹھانیاں، ساس سسر اور نندیں سب ایک ساتھ رہتے تھے ذرا جو کسی دوسرے سے منہ بگاڑے ہوں یا خار کھاتے ہوں۔''

''وہ آپ کا زمانہ تھا امی، اور یہ نیا زمانہ ہے۔'' بھائی کا انداز نیا نہ تھا۔

''زمانہ وہی ہے بیٹا، صرف بچوں کی سوچ بدل گئی ہے۔ ہر کوئی اپنا اور اپنے پیٹ کا ہے دوسروں سے محبت کا دعویٰ جھوٹا ہوگیا ہے اب سب کو اپنا فائدہ درکار ہے۔''

اس کی ماں کا لہجہ تاسف میں ڈوب گیا اور پیچھے کھڑی ارم کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا کہ وہ موحد کی بہن کے متعلق جو سوچ رکھتی تھی اب اس کی ہونے والی بھابھی اس کے متعلق بھی وہی سوچ رکھے ہوئے تھی۔

زمانہ واقعی وہی تھا، صرف سوچ بدل گئی تھی۔ سوچ ''میں'' سے شروع ہوکر ''میں'' پر ختم ہورہی تھی۔ اس پر جتنا رویا جاتا کم تھا اور پھر یوں ہوا وہ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزاری تھی اور جب صبح اٹھی تو سب سے پہلے موحد کو فون ملایا۔

''جب چاہو موحد، مجھے بیاہنے آجاؤ، مجھے ثمینہ آپی سے کوئی پرخاش نہیں۔ پرخاش صرف میری سوچ میں تھی۔ جسے میں نے اچھی طرح سے صاف کرلیا ہے۔ اور ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔ میں نے تمہیں اس لحاظ سے بہت تنگ کیا۔ بھول گئی تھی میں کہ جو گھر میرا ہونے چلا ہے وہ پہلے وہاں کی بیٹی کا ہے۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں موحد۔ آئی ایم سوری۔''

اور دوسری طرف موحد حیرت سے گنگ تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ کایا پلٹ، ہو کیسے گئی۔

''لگتا ہے نئے سال کی پہلی صبح نے تمہاری سوچ بھی نئی کردی ہے۔'' وہ ذرا سا مسکرایا کہ ایک دم سے ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

''ہاں، بہت کچھ نیا کردیا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کے لیے یہ نیا سال مبارک کرے۔'' اس نے بھر آنے والی آنکھوں کو سختی سے رگڑا تھا۔

''آمین۔'' موحد نے صدق دل سے آمین کہا تو وہ اندر تک سرشار ہوگئی۔ لبوں پر آپوں آپ نرم سی مسکان آن ٹھہری۔

''سال نو مبارک ہو۔''

بہت دیر بعد موحد نے کہا تو اس نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خیر مبارک کہا کہ نئے سال کے ساتھ اسے بہت کچھ نیا مل رہا تھا اور وہ اس نئے پن پر خوش نہ ہوتی تو کیا ہوتی؟؟؟

☆

صائمہ اکرم چوہدری

شہرزاد

شہرزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے پیچھے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثے کا شکار ہو گئی۔

میجر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں۔ ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام درشہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں اتابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے — ان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور درشہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا … رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر … گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

اتابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

مینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے … چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمٰن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہرزاد جسے اعلاتعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہرزاد کی آمد مینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔

شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبیٰ اور درشہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آ چکا ہے۔ محمد ہادی فاریسٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلاتعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا وہاج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور مینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

درشہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو درشہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

بائیسویں قسط





میر خاقان، میر حاکم علی کے ساتھ نور محل پہنچ چکے تھے۔
ان کا سارا دن مصروفیت میں گزرا اور شام سے شروع ہونے والی موسم سرما کی تیز بارش کے باعث وہ جلدی لوٹ آئے۔ نور محل بالکل ویرانے کا منظر پیش کر رہا تھا، یہاں وہاج اور فارحہ بھابھی کی حکمرانی تھی لیکن اب اس کے در و دیوار اس وقت اداسی میں لپٹے ہوئے تھے۔
برفیلی ہواؤں کے جھکڑ، درختوں سے گزرتی شائیں شائیں کی آوازیں اور ماضی کی بازگشت نے میر خاقان کی راتوں کی نیند اڑا دی۔ وہ اس وقت اپنے بیڈروم میں اکیلے تھے اور صبح سے ان کا دماغ ایئرپورٹ پر بیگم کے ساتھ دکھائی دینے والی شہرزاد کے نقوش میں الجھا ہوا تھا۔
وہی مغرور، تیکھی ناک اور شان بے نیازی جو میر خاقان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔
وہی پر اعتماد انداز میں یوں چلنا جیسے ساری دنیا اس کے قدموں کے نیچے ہو۔ انہیں لگا جیسے وہ اپنا ہی ماضی کا وجود شہرزاد کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھ آئے ہوں، شہرزاد نے محض ایک نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تھا جس میں صرف اجنبیت اور روکھائی تھی، شاید وہ ان دونوں کو کسی اور حوالے سے جانتی تھی اور وہ حوالہ یقیناً مثبت نہیں تھا، اسی لیے اس کے ماتھے پر ناگواری کی ایک شکن ابھری تھی۔
انہوں نے شل ہوتے دماغ کو سنبھالتے ہوئے کمرے کی کھڑکیوں کے پردے پیچھے ہٹائے، سامنے ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ زرد پتے فضاؤں میں ایسے ہی بکھر رہے تھے جیسے اس وقت ماضی کی فلم کی طرح ان کے دماغ کی اسکرین پر چل رہا تھا۔ جہاں انہوں نے محض خسارے کے سودے ہی کیے تھے جن کا حساب کتاب ان کے مستقبل کو بدصورت بنا رہا تھا۔
وہ کیوں بھول گئے تھے کہ وہ تانیہ فاروق سہگل کی اولاد تھی جو زندگی میں پہلی بار میر خاقان کے سامنے سرنگوں ہوئی تھیں اور یہ کیسے ممکن تھا وہ اس ہار کا بدلہ نہ لیتیں، ان کا دماغ اپنے ہی جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ انہیں لگا جیسے یہ سب تانیہ عرف نینا بیگم کی سازش ہو اور وہ جان بوجھ کر اپنی بیٹی کو ان کے مقابل لائی ہوں۔
خاقان علی نے خود پر قابو رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی، لیکن بے سود رہی۔
انہوں نے کچھ سوچ کر اپنے ایک قریبی دوست کو فون کر کے شہرزاد کا نمبر منگوایا جو اگلے پانچ منٹ میں ان کے ان باکس میں موجود تھا۔ انہوں نے ایک نگاہ اس نمبر کو دیکھا اور وہ انہیں حفظ ہو گیا، لیکن ان کی انگلیاں یہ نمبر ٹائپ کرنے سے انکاری تھیں۔ انہوں نے پورے بیس منٹ سوچا کہ وہ اسے کال کریں لیکن کال کرنے کے بعد کیا بات کریں، یہ بات ان کا دماغ بتانے سے قاصر تھا۔ تنگ آ کر انہوں نے فون ہی بیڈ پر اچھال دیا۔ ایسی بے چارگی، ایسی بے بسی انہوں نے زندگی میں پہلے کب محسوس کی تھی۔
دوسری طرف اسد چیمہ نے حراست کے صرف ایک ہفتے بعد میر وہاج کے قتل کا اعتراف کر لیا تھا اور اس کے قتل کے پیچھے چھپی وجہ نے صندل کے کردار پر لگے کالے داغ دھو ڈالے تھے اور اس کی طرف اٹھنے والی مشکوک انگلیاں اب جھک چکی تھیں۔
اس بار قدرت نے شہرزاد کا بھرپور ساتھ دیا اور وہ اگلی دو پیشیوں میں صندل کیس بہت آسانی سے جیت گئی، لیکن میر وہاج کی موت نے اس کی ساری خوشی کو ملیامیٹ کر دیا تھا کیونکہ اس سارے قصے کا اہم کردار خود اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا تھا۔ شہرزاد کو اس بات کا ساری زندگی افسوس رہنا تھا کہ وہ صندل کے ایک قاتل کو اپنی آنکھوں سے پھانسی کے پھندے پر چڑھتا ہوا نہیں دیکھ پائی۔
☆☆☆
رات سے ہونے والی بارش تھم چکی تھی۔

فضاؤں میں ابھی خاصی خنکی کا راج تھا اور پانی کے قطرے وقتاً فوقتاً درختوں کے پتوں سے ٹپک رہے تھے۔ منال پچھلے کئی دنوں سے یونیورسٹی جا رہی تھی لیکن اس کا ابھی تک برہان سے سامنا نہیں ہوا تھا وہ اپنے [illegible] کے قتل کے بعد دس دن کی چھٹی پر تھے۔
منال تو پہلے ہی اس شخص کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ رہی سہی کسر درشہوار والے واقعے نے پوری کر دی تھی، اسے اب اس پورے خاندان سے ہی چڑ ہو گئی تھی، اگرچہ مسز قریشی کی تمام تر ہمدردیاں اب درشہوار کے ساتھ تھیں اور یہی بات منال کے لیے تکلیف کا باعث بن رہی تھی، اس لیے وہ اپنا بیگ اٹھا کر تیسرے ہی دن یونیورسٹی کے ہاسٹل میں شفٹ ہو گئی۔
"آخر ہوا کیا ہے منو، ایک دم منہ اٹھا کر چل پڑی ہو ہاسٹل۔" ہادی نے اس کا بیگ گاڑی کی ڈگی میں رکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔
"کچھ نہیں، میرا دل نہیں لگ رہا اس بار گھر میں۔" وہ افسردگی سے فرنٹ سیٹ پر براجمان ہو گئی۔
"درشہوار کا آنا بہت برا لگا ہے نا تمہیں۔" ہادی اس کا بیسٹ فرینڈ تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ یہ وجہ جان نہ پاتا۔
"نہیں۔" منال نے خود کو سیل فون میں مصروف ظاہر کیا۔ لرزتی پلکیں اس کے جذباتی مد و جزر کا پتا دے رہی تھیں۔
"جھوٹ کیوں بول رہی ہو، سچ بتا کیوں نہیں دیتی ہو؟" ہادی نے اس کے ہاتھ سے سیل فون چھینا۔
"اس نے جو کیا اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا اور جو میں کر رہی ہوں، وہ اپنی اس خاندان سے نفرت کی وجہ سے کر رہی ہوں۔"
"درشہوار اتنی بری نہیں ہے منال۔" ہادی نہ جانے کیوں اس کی طرف داری کر گیا۔
"ہو گئی محبت تمہیں بھی اس سے۔؟" منال نے استہزائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "اس خاندان کے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کا ہنر آتا ہے، اس کا بھائی بھی ایسا ہی تھا، اچھی خاصی میری پرسکون زندگی کو برباد کر گیا۔"
"زندگی میں ہر شخص کے ساتھ ہمارا تعلق محبت کا نہیں ہوتا منال! کیا یہ بات بھی سمجھانی پڑے گی تمہیں؟" ہادی نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے لمبی سانس بھری اور اس کے افسردہ چہرے کو تاسف بھری نگاہوں سے دیکھا۔
"مجھے کچھ بھی مت سمجھاؤ، میرا دماغ اس وقت کسی بھی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔" وہ تندی سے بولی۔
"اچھا اس ویک اینڈ پر مری آؤ گی، اسنو فال دیکھنے چلیں گے، دونوں بہن بھائی مل کر خوب انجوائے کریں گے۔" ہادی کو اندازہ تھا کہ وہ ابھی تک خود کو اس فیز سے نہیں نکال پائی، اس لیے وہ اسے پرسکون کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔
ہادی کی بات پر منال نے گلے میں اٹکے ہوئے آنسوؤں کو اندر کی طرف دھکیلا اور بمشکل بولی "نیکسٹ ویک ماما آ رہی ہیں پاکستان۔"
"کیا واقعی پھپھو آ رہی ہیں۔ یہ تو بہت زبردست بات بتائی تم نے۔" ہادی ایک دم خوش ہوا۔ اسے اپنی اکلوتی پھپھو سے بے تحاشا محبت تھی۔
☆☆☆

منائل کو ہاسٹل آکر بھی خود کو اسٹڈیز کی طرف مائل کرنے میں کافی دن لگے، محبت میں بہت سی چیزیں اور جگہیں آپ کی رازدار ہو جاتی ہیں، کیفے ٹیریا کی وہ — میز جو ان دونوں کے لیے مخصوص تھی، منائل نے اس کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔

اپنے ڈیپارٹمنٹ کے احاطے میں لگا شیشم کا وہ درخت جس پر "ایم" اور "بی" انگریزی کے حروف برہان نے بڑی مشکل سے اسٹوڈنٹس سے نظر بچا کے لکھے تھے اور اس چکر میں منائل کے ہاتھ پر ایک نوکیلا کانٹا بھی چبھ گیا تھا۔ برہان نے خون کو روکنے کے لیے اس پر اپنا رومال باندھا تھا، وہ رومال آج بھی اس کے سامان میں محفوظ تھا۔

وہ سینٹرل لائبریری کی بے شمار کتابیں جو اس نے برہان کے نام پر ایشو کروائی تھیں، وہ ساری کی ساری واپس لوٹا دی تھیں، وہ اس کے حوالے سے کوئی بھی چیز اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی تھی لیکن بہت سالوں کی چیزوں اور یادوں کو چند دن میں ذہن سے اور زندگی سے نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

وہ کیمپس کی تنگ پگڈنڈی، جس پر چلتے ہوئے وہ شرارت سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر دوڑ لگا دیتے، وہ شرط لگا کر پہاڑوں پر کی جانے والی کٹھن ہائیکنگ، وہ بحث کے دوران ہونے والی جھڑپ پر چھوڑے جانے والے ادھورے کافی کے کپ، نوٹس بورڈ پر لگائے جانے والے معنی خیز اشعار، بارش میں ایک ہی چھتری کے نیچے بھیگنے سے بچنے کے بہانے ایک دوسرے کے بہت قریب ہو جانا، اور پیڑوں کے نیچے کیے گئے، ان کے اقرار اور وہ ڈوبتے سورج کی طرف دیکھ کر اپنی محبت کو کبھی زوال نہ آنے کی دعائیں، سب قسمت کے ایک وار پر وارے گئے۔ وہ اب صرف ماضی کے اوراق پر زندہ تھے اور کیمپس کے راستے ایسی بے شمار محبتوں کے امین تھے۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے پروان چڑھتیں اور پھر جھاگ کی طرح بیٹھ جاتیں، لیکن منائل نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ہو گا۔

برہان کو عادت تھی، وہ کام کے دوران لکھتے لکھتے اپنے بال پوائنٹ کو اچانک شرارت سے اس کے ہاتھ پر مارتے اور وہ ڈر جاتی، تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے، فضاؤں میں آج اس قہقہے کا گلابی رنگ، سیاہ ماتمی رنگ اوڑھ چکا تھا۔

اس کی نوٹ بکس پر لکھے ہوئے ان کے کئی معنی خیز جملے منائل کے کئی اگلے گھنٹوں کو برباد کرنے کے لیے کافی ہوتے۔ اس نے اس کا بہترین حل یہ نکالا کہ وہ ساری بکس نئی خرید کر لے آئی اور پرانی اٹھا کر اس نے الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں دوبارہ کبھی نہ کھولنے کے لیے پھینک دیں۔

اسائنمنٹس پر لکھے ہوئے برہان کے جملوں کو جب اس نے بے دردی سے کاٹا تو ایک لمحے کو اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل بھی آری سے کاٹ کر پھینک دیا ہو، لیکن یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جسے قبول کیے بغیر وہ زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔

اس دن وہ اپنی پہلی کلاس لے کر کوریڈور میں نکلی تو وہیں اس کے پاؤں تھم گئے، سامنے برہان، سیاہ رنگ کے ٹو پیس سوٹ میں افسردہ انداز کے ساتھ اپنے کچھ کولیگز کے ساتھ کھڑے تھے، منائل ان سے اتنے فاصلے پر بھی اندازہ لگا چکی تھی کہ وہاں ان کے بھائی کی موت پر اظہار افسوس کیا جا رہا ہو گا۔ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن ان کی ایک کولیگ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا تو منائل کو مجبوراً وہاں جانا پڑا۔

"السلام علیکم!" اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا، سب کی نظریں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں کیونکہ ان کے سب ہی کولیگ ان کے درمیان چلنے والے اس گہرے تعلق سے کچھ نہ کچھ ضرور آگاہ تھے۔

"افسوس ہوا آپ کے بھائی کی ڈیتھ کا۔" اس نے دل پر جبر کر کے ان کو مخاطب کیا، برہان نے نظر اٹھا کر

عجیب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے، منائل دو منٹ وہاں چپ کھڑی رہی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اپنے آفس میں چلی آئی۔

اسے اپنے پیچھے بہت سی حیرانگی میں ڈوبی ہوئی نگاہوں کا احساس ہوا لیکن وہ اس سے زیادہ اس شخص کے سامنے نہیں کھڑی رہ سکتی تھی، جسے اس نے کبھی ٹوٹ کر چاہا تھا، جس کے ہونے سے اسے زندگی خوبصورت لگتی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ اگلے چند منٹ میں وہ اس کے آفس میں موجود ہوں گے، وہ جو اسٹوڈنٹس کی اسائنمنٹس نکال کر چیک کر رہی تھی انہیں دیکھ کر ہلکی سی کوفت کا شکار ہوئی۔

"میں مانتا ہوں منائل قریشی! میں دنیا کا انتہائی گھٹیا ترین انسان ہوں، میں نے محض اس غلط فہمی میں اپنے جذبوں کا اظہار کیا کہ اپنے خاندان والوں کو تمہارے لیے منا لوں گا اور میرا اللہ گواہ ہے کہ میں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اپنے خاندان کی فرسودہ روایات کی بھینٹ چڑھ گیا، میں یہ بھی مانتا ہوں کہ میں انتہائی بزدل انسان ہوں، جو اپنی ماں کی پھیلائی ہوئی جھولی اور آنسوؤں پر اپنی محبت کو قربان کر گیا، میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کو اپنی مرضی سے جتنا جینا تھا وہ جی لیا، اب یہ محض تمہارے سامنے ایک جسم ہے، جس میں دھڑکتا ہوا مردہ دل، خواہشوں، امیدوں سے خالی ہو چکا ہے اور انابیہ کے ہاتھ صرف ایک ادھورا شخص آیا ہے، لیکن میں مر کر بھی اس بات کا یقین نہیں کر سکتا کہ وہ واحد لڑکی، جس کو میں نے ٹوٹ کر چاہا، جس سے زندگی میں محض ایک جھوٹ بولا اور وہ جھوٹ جس پر شاید میں اس سے کبھی زندگی بھر نظر ملا کر بات بھی نہ کر سکوں، وہ لڑکی میری بہن کو میرے خاندان کی عزت سے کھیلنے کے لیے استعمال کرے گی۔"

جذباتی لہجے میں بولتے ہوئے ان کی زبان ایک دفعہ بھی نہیں لڑکھڑائی لیکن منائل کو ان کی ذہنی حالت ابتر ہی لگی۔

"کیا درشہوار نے ایسا کہا ہے کہ میں نے اسے ورغلایا اس سارے معاملے میں اس کی سپورٹ کی ہے؟" وہ اپنے دونوں بازو سینے پر باندھ کر ان کے سامنے پر اعتماد انداز میں کھڑی ہوئی، اس کے انداز میں کچھ ایسا تھا کہ برہان ٹھٹک گئے۔

"تم نے اس پر احسان کیا، اسے اپنے ماموں ممانی کے گھر پناہ دی، وہ اب اتنی احسان فراموش تو نہیں کر سکتی۔" وہ تلخی سے گویا ہوئے۔

"دیکھو برہان غضنفر! ویسے تو ہمارے درمیان ایسا کچھ رہا نہیں، جس کو بچانے کے لیے میں اپنی صفائی پیش کروں لیکن تم اگر میرے حوالے سے کوئی گھٹیا بات سوچ ہی چکے ہو تو مجھ پر بھی لازم ہے کہ میں تمہیں اصل حقیقت بتاؤں۔" منائل نے غصے سے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

"ملازمادی کا نمبر اور پوچھو میں نے ان کا گھر اس بار کیوں چھوڑا؟ میں محض دو دن بعد ہی ہاسٹل کیوں شفٹ ہوئی؟ صرف اور صرف درشہوار کی وجہ سے۔"

برہان اس کی بات پر چونکے جو زہر میں ڈوبے ہوئے لہجے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

"کیونکہ درشہوار، اس شخص کی بہن تھی، جس نے مجھے دنیا جہاں کی اذیت دی، جس نے مجھے آسمان کی بلندیوں سے اٹھا کر زمین پر لا پھینکا، جس نے دن کی روشنی میں اسی آفس میں بیٹھ کر میرے ساتھ رہنے کے جھوٹے خواب بنے تھے۔" منائل کی باتوں پر برہان کا چہرہ سرخ ہوا لیکن وہ چپ رہے۔

"مجھے تم سے انتقام لینا ہوتا تو تمہاری شادی والے دن ہال میں پہنچ کر تمہاری محبت کی یادگاروں کی تمہارے خاندان کے سامنے نمائش لگا دیتی، ایک ہنگامہ برپا کر دیتی، اور پھر دیکھتی تم کیسے انابیہ خاقان کو بیاہ کر لاتے ہو۔" منائل کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔

"نفرت ہے مجھے آپ سے۔ آپ کی بہن سے...... اور آپ کے خاندان سے وابستہ ہر شخص سے۔ میری موجودگی میں وہاں آئی تو میں اسے ایک منٹ بھی رکنے نہیں دیتی، لیکن......" وہ بولتے بولتے سانس لینے کو رکی، اور برہان کو ایسا لگا جیسے کسی نے ان کے کانوں میں سیسہ ڈال دیا ہو۔

"لیکن مجھے اس بات کی یقیناً خوشی ہے، درشہوار آپ کی بہن ضرور ہے، لیکن آپ کی طرح بزدل نہیں، اپنی یک طرفہ محبت کی کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے اس نے جیسے بھی الٹے سیدھے ہاتھ مارے، لیکن مارے تو سہی۔ دعائیں دیجیے میرے بھائی کو، اس نے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا، جیسا کہ آپ کے خاندان کے لوگوں کو اٹھانے کی عادت ہے۔"

وہ بھگو بھگو کر ان کو مار رہی تھی، برہان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہ اس کی میز کے سامنے رکھی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئے۔

منال نے چونک کر ان کی طرف دیکھا، ان کا چہرہ زرد اور پسینے سے لبریز تھا۔ ان کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں اور وہ کھینچ کھینچ کر لمبے لمبے سانس یوں لے رہے تھے، جیسے یہ انتہائی مشقت والا کام ہو۔ اتنے بڑے انکشاف کے بعد وہ اپنے حواسوں میں رہ بھی کیسے سکتے تھے، منال کو لمحہ بھر کے لیے ان پر ترس آیا۔

اس نے انسانی ہمدردی کے تحت اپنی میز پر رکھے جگ سے پانی انڈیل کر گلاس ان کی جانب بڑھایا، جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئے، اس کے بعد انہوں نے دوسرا گلاس بھرا اور جب تیسرے کے بعد چوتھے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو منال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

اس نے جگ ان کے سامنے سے اٹھالیا، جس میں اب شاید آدھا گلاس ہی پانی بچا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے پیاسے ہوں، عجلت بھرے انداز میں پانی پینے کی کوشش میں کچھ پانی ان کی شرٹ پر بھی گر چکا تھا۔

منال کو وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگے، اس نے نظر بچا کر ایک ٹشو ان کی طرف بڑھایا، تو برہان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، منال کو کرنٹ لگا، ان کا جسم حرارت سے جھلس رہا تھا، وہ چاہ کر بھی ان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکی۔

"میں جانتا ہوں، اس ہاتھ کو چھونے کے سارے اختیارات کھو چکا ہوں، لیکن منال! میں تھک گیا ہوں اور تمہیں پتا ہے جب کوئی مرد ایسا کہتا ہے تو وہ حقیقتاً تھک چکا ہوتا ہے اور وہ یہ بات بھی بھول جاتا ہے کہ یہ اس کی مردانگی کی توہین ہے لیکن میں کیا کروں، میں جینے کی ساری خواہشیں وہاج بھائی کے ساتھ قبر میں دفن کر آیا ہوں۔" وہ اس کی کرسی کے قریب گھٹنوں کو جھکا کر بیٹھ گئے۔

دونوں نے پہلی بار ایک دوسرے کو اتنے قریب سے دیکھا تھا، منال کچھ لمحے کے لیے بھول گئی کہ اس شخص سے اس نے پچھلے کچھ دنوں سے کتنی بے تحاشا نفرت کی ہے، وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس شخص نے اس کا مان اور اعتبار تار تار کیا تھا۔ وہ چھ فٹ سے اونچا شخص اس کے سامنے بیٹھا ہوا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

منال کی آنکھوں نے بھی بغاوت کی اور گرم پانیوں کو تو جیسے باہر نکلنے کا راستہ مل گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے ان کا بازو پکڑ کر رو پڑی، برہان کو لگا جیسے اب وہ ساری زندگی اس کے سامنے کھڑے نہیں ہو پائیں گے۔ وہ اپنی خاندانی روایات اور والدین کی جذباتی بلیک میلنگ کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو رنج اس کی جھولی میں ڈال چکے تھے، وہ ساری زندگی ختم ہونے والا نہیں تھا۔

"آئی ایم سو سوری یار۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ ہاتھ اس کے آگے جوڑے بچوں کی طرح رو رہے تھے۔

انابیہ نے خوف زدہ انداز میں اپنے آفس کے دروازے کی طرف دیکھا، جو اس وقت بند تھا لیکن کسی بھی

لمحے کوئی بھی آ سکتا تھا۔ اس نے ہمت کر کے انہیں اٹھایا اور اپنے سامنے رکھی کرسی پر بٹھا دیا۔

"اللہ کی قسم میرا دل اب بھی تمہاری طرف لپکتا ہے، لیکن میں تمہارے بعد انابیہ کا گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔"

"آپ اگر ایسا چاہیں بھی تو میں اتنے کمینے پن کا مظاہرہ نہیں کر سکتی برہان! میں کسی لڑکی کو وہ اذیت نہیں دے سکتی، جو میں نے جھیلی ہے، اگر آپ کو ابھی بھی مجھ سے محبت ہے تو پلیز انابیہ کو خوش رکھیں، میں اسے خوش دیکھ کر مطمئن رہوں گی کہ کم از کم کوئی ایک تو ہے جو آپ کو پا کر خوش ہے۔" وہ چاہتے ہوئے بھی مزید اپنا لہجہ سخت نہیں کر پائی، برہان ٹشو سے اپنی نم آنکھیں صاف کر رہے تھے۔

"ویسے بھی ماما کچھ دن میں میرا کوئی رشتہ فائنل کرنے پاکستان آ رہی ہیں اور میں آپ کو اور انابیہ کو بلاؤں گی اپنی شادی میں۔" وہ دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

"میں نہیں آ پاؤں گا منال! میرا ظرف تمہارے جیسا بڑا نہیں۔" انہوں نے اذیت کی شدت کو کم کرنے کے لیے آنکھیں موند لیں، پلکوں پر اٹکا ہوا ایک آنسو ان کے گال پر گرا اور زمین میں جذب ہو گیا، منال چاہ کر بھی انہیں مزید کچھ نہیں کہہ سکی۔

☆☆☆

ساتوں آسمان بھی شہزاد کے سر پر گر جاتے تو شاید اسے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ جتنی تکلیف اسے میر ارسل کی تصویر کے پیچھے لکھے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے محض اس شجرہ نسب کو دیکھے جا رہی تھی۔

جو میر حاکم کے خاندان سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو رہا تھا۔ تقدیر اسے پھر ایک عجیب دوراہے پر لے آئی تھی، اپنے پروفیشنل کیریر کے آغاز میں ہی اس نے اپنا پہلا کیس جس خاندان کے خلاف لڑا تھا، اس کی زندگی کے اہم ترین معاملات اسی فیملی کے اردگرد گھومے چلے جا رہے تھے۔

"ٹیک اٹ ایزی اینڈ بی ریلیکس۔" حمزہ نے میز پر رکھے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

"کیوں اتنی ٹینس ہو رہی ہو شہزاد؟"

"حمزہ! یہ شجرہ نسب نہیں، مجھ پر ہماری آزمائش ہے، اور ماما تو مر کر بھی نہیں مانیں گی اس خاندان کے لیے۔" اس نے پریشانی سے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور یونہی اپنے سامنے بیٹھے میجر حمزہ کو دیکھنے لگی، جو آج وعدے کے مطابق ارسل کی ساری معلومات کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا۔

"میں تمہاری باتوں سے اتفاق کرتا ہوں شہزاد، لیکن۔" وہ اپنی بات کرتے ہوئے رکا۔

"لیکن کیا؟" وہ بے تاب ہوئی۔

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، وہاج کو چھوڑ کر اس فیملی کے سب لڑکوں کی ریپوٹیشن بہت اچھی ہے، ان کی نئی جنریشن اور پرانی میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اسپیشلی یہ لڑکا ارسل، ویل ایجوکیٹڈ، سینس ایبل اور ذہنی طور پر خاصا اسٹرانگ ہے، یہ جہاں چاہے رومیصہ کو الگ گھر لے کر بھی رکھ سکتا ہے۔" حمزہ کی باتوں پر شہزاد نے ہلکی سی ناک چڑھائی، وہ بھانپ گیا کہ اس کی باتیں شہزاد کو ناگوار گزر رہی ہیں۔

"ویسے بھی یہ اس کا ننھیال ہے اور اس کے والد کا خاندان خاصا ایجوکیٹڈ اور امریکہ میں سیٹلڈ ہیں۔ اس کی پہچان اور شناخت تو اپنے فادر کی طرف سے ہی ہوگی ناں۔" وہ اسے مطمئن کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

"کہیں رومیصہ نے تمہیں کوئی رشوت وغیرہ تو نہیں دی۔" اس کی اتنی طرف داری پر وہ مشکوک ہوئی تو حمزہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"تمہیں پتا ہے میں تمہارے معاملے میں کسی بھی قسم کی کوئی ڈیل نہیں کر سکتا۔ تمہیں ارسل کے ساتھ رہنا ہے؟"

"یہ لڑکا سونے کا بھی بن کر آ جائے تو مام نہیں مانیں گی اور سب سے بڑی بات میر فیملی کے حوالے سے بھی کوئی پوزیٹو رائے نہیں رکھتی۔ اپنی کرپشن اور آئے دن کے قصوں کی وجہ سے مجھے یہ خاندان سخت ناپسند ہے اس لیے میں ارسل کو کسی بھی قیمت پر رومیصہ کے لیے قابل قبول نہیں سمجھتی۔"

شہرزاد نے اس بار کھل کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اتفاق سے یہ رائے ارسل نے اس کے آفس میں داخل ہوتے ہوئے پورے ہوش و حواس کے ساتھ سنی۔ اس کے باوجود وہ مسکرا دیا۔

ارسل کو اپنے آفس میں اندر آتے ہوئے دیکھ کر شہرزاد کے ساتھ ساتھ حمزہ بھی چونکا، چونکہ اس کی تصویر ابھی تازہ تازہ ہی دیکھی تھی، اس لیے دونوں فوراً ہی پہچان گئے۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے دونوں کو مشترکہ سلام کیا۔

"آئی ایم سوری، آپ کے آفس میں بغیر اجازت آ گیا، ایکچولی باہر کوئی پیون مجھے نظر ہی نہیں آیا۔"

وہ سلجھے ہوئے انداز میں اپنی صفائی دے رہا تھا اس سے پہلے کہ شہرزاد اس سے اس کی آمد کا سبب پوچھتی ارسل کی نگاہ شہرزاد کی میز پر رکھی اپنی تصویر پر پڑی اور اس نے بے تکلفی سے اٹھا بھی لی۔ اس کی یہ حرکت بھی شہرزاد کو ناگوار گزری۔ بے شک تصویر اس کی ہی تھی لیکن کسی کی ٹیبل سے بغیر اجازت کوئی چیز اٹھانا بھی مناسب عمل نہیں تھا، اس لیے شہرزاد کے اعصاب تھوڑا تن گئے، اتنا تو اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ یقیناً رومیصہ کے کہنے پر اس سے ملنے آیا ہوگا اور بات کی نوعیت بھی وہ کسی حد تک جانتی تھی۔

"یہ تو بہت بے کار تصویر ہے، اس سے اچھی ہیں میرے پاس، آپ کو چاہئیں تو میں بھجوا دوں گا۔" اس کے دوستانہ انداز پر حمزہ نے اپنے ہونٹوں پر در آنے والی مسکراہٹ کا گلا بڑی مشکل سے گھونٹا اور گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی فرمائیے، کیسے آنا ہوا؟" شہرزاد روکھائی سے بولی۔

"کچھ بھی کہنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہوں گا کہ صارم خان میرا بیسٹ فرینڈ تھا، جس نے میرے کہنے پر رومیصہ کے حق میں گواہی دی اور اس کے نتیجے میں اس کا مرڈر کر دیا گیا تھا۔" وہ اتنے بے ساختہ لہجے میں بولا کہ شہرزاد کے منہ سے چند لمحوں کے لیے کچھ بھی نہ نکل پایا۔

"یقیناً، پھر آپ ان ہی چند لوگوں میں بھی شامل ہوں گے جنہوں نے رومیصہ کو کڈنیپ کیا ہوگا۔" حمزہ کی بات پر ارسل ہلکا سا گڑبڑایا۔

"ہاں اور وجیل محمود، میرا اور صارم کا مشترکہ فرینڈ تھا لیکن اغوا کے اس فیصلے میں میری رضامندی شامل نہیں تھی، لیکن رومیصہ کو وہاں سے نکالنے اور اس کے بعد اس کے ساتھ نکاح کرنے کا فیصلہ سراسر میرا اپنا تھا اور اس کے بارے میں سوائے میرے ایک دوست کے اور کوئی نہیں جانتا۔"

"آپ تشریف رکھیں، میرے خیال میں شہرزاد کو تمہیں اس سے بات کرنی چاہیے، اگر آپ لوگوں کو کوئی پرائیویسی چاہیے تو میں باہر جا سکتا ہوں۔" حمزہ کی بات پر شہرزاد نے اسے گھور کر دیکھا۔

"آپ کو یہاں سے جانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔" اس نے حسب توقع وہی جواب دیا جس کی حمزہ کو قوی امید تھی۔

"ہائی داوے، مجھے میجر حمزہ کہتے ہیں، میں شہرزاد کا بیسٹ فرینڈ ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروا دیا تاکہ اسے بات کرنے میں آسانی رہے۔

"میں بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں، رومیصہ بتا چکی ہے مجھے آپ کے بارے میں اور کانونٹ کے اس

کے بارے میں بھی، جب آپ نے اس کے لیے اسکول کے شرارتی لڑکوں کی پٹائی بھی کی تھی۔" اس کی اس بات پر حمزہ نے دوستانہ انداز میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا جبکہ شہرزاد نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔

"میں یہاں آپ سے رومیصہ کے سلسلے میں بات کرنے آیا ہوں اور مجھے یقین ہے آپ میری بات ضرور سنیں گی۔" وہ کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"سب سے پہلے آپ کو یہ بتانا ہوگا، آپ نے رومی سے شادی کا فیصلہ کیوں کیا؟" حمزہ کے اس سوال پر ارسل ہلکا سا مسکرایا۔

"اس کی دو وجوہات تھیں، سب سے پہلی یہ کہ مجھے روجیل کے معاملے میں اس کی بے گناہی کا سب سے پہلے پتا چلا کہ اس نے یا اس کی فرینڈ کنزہ وقار نے روجیل کو نہیں مارا تھا بلکہ وہ اپنی غلطی سے بائیک سے گرا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ مجھے ہر لحاظ سے اچھی لگی تھی۔"

اس کی بات پر شہرزاد اور حمزہ دونوں میں سے کسی نے بھی تبصرہ نہیں کیا اس لیے اس نے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

"مجھے لگا ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کی زندگیوں کے ادھورے پن کو ختم کر سکتے ہیں۔ اگر ماضی میں اس کے ساتھ کچھ مسائل رہے ہیں تو میں نے بھی والدین کی ڈیتھ کے بعد بہت سی چیزوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کیا ہے۔" ارسل کے لہجے کی سچائی کو کسی گواہ کی ضرورت نہیں تھی۔ شہرزاد نے جانچتی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، وہ اتنا بھی برا نہیں تھا، جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

"میں نے اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ اس کی سچائی کو دیکھ کر کیا، وہ ہر رشتے اور ہر معاملے میں بہت کلیئر ہے، اس نے مجھ سے اپنے ماضی کی کوئی چیز نہیں چھپائی، میں اس کی زندگی کے ہر معاملے کو جانتا ہوں اور مجھے ان چیزوں پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں، شاید میں اس کی جگہ ہوتا تو اس سے زیادہ ری ایکٹ کرتا، یہ بات اور ہر حادثے کا ایک فطری ردعمل تھا۔"

"کیا تم نے رومیصہ کو بتایا تھا کہ تمہارا تعلق کس فیملی سے ہے۔" شہرزاد کے انتہائی سنجیدہ انداز پر وہ متحمل انداز میں گویا ہوا۔

"وہ اگر پوچھتی تو میں ضرور بتا دیتا اور خود سے بتانے کی بھی میں نے ضرورت ہی نہیں سمجھی۔" اس نے بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔

"رومیصہ کے لیے کیا کر سکتے ہو تم؟" وہ عجیب سے انداز میں گویا ہوئی۔

"کس ریفرنس سے پوچھ رہی ہیں آپ؟" وہ ہلکا سا چونکا۔

"اگر تمہیں اس کے لیے اپنے خاندان کو چھوڑنا پڑے تو کیا چھوڑ دو گے۔" شہرزاد کا لہجہ تیکھی پڑتی تھا۔

"ہمارا خاندان وہ ہوگا جو میں اور رومیصہ مل کر بنائیں گے۔" اس کے انداز میں کمال کی برجستگی تھی۔ حمزہ نے توصیفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"شہرزاد کے کہنے کا مقصد ہے کہ اس کی مام کسی بھی قیمت پر نہیں مانیں گی کہ وہ تمہارے خاندان کا حصہ بنے۔ ایسی صورت میں تم کیا کر سکتے ہو، ہمیں پتا ہونا چاہیے تمہارا اگلا لائحہ عمل کیا ہوگا؟" حمزہ نے اس بار تفصیل سے بتایا۔

"میں اور رومیصہ پہلے ہی ملک سے باہر شفٹ ہونے کا پلان کر چکے ہیں اور الحمدللہ برطانیہ کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں میری جاب ڈن ہو چکی ہے اور ہم دونوں کے ویزے بھی آ چکے ہیں۔ مجھے بس اپنی اکلوتی بہن کے حوالے سے کچھ تحفظات ہیں، میری پوری کوشش ہے کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں لیکن اگر ایسا

سکا تو یہاں اس کے لیے کوئی نہ کوئی مستقل حل تلاش کر کے جاؤں گا۔"

ارسل کی باتوں نے شہزاد کو کافی حد تک مطمئن کیا، اس کے تنے ہوئے اعصاب اب کچھ ڈھیلے پڑ رہے تھے لیکن وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنی ہر لحاظ سے تسلی کرنا چاہتی تھی۔

"تمہاری فیملی کے لوگ رومیصہ کو اپنی بہو کے حوالے سے قبول کرلیں گے؟"

"وہ اسے قبول کریں یا نہ کریں، مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے، میری بیوی ہے، اس کو میں نے کھلے دل سے اپنایا ہے اور اس کے لیے مجھے جہاں جہاں اسٹینڈ لینا پڑا میں لوں گا، آپ کو اس حوالے سے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"آپ کو پتا ہے میرو باج اور اس سے پہلے شجاع غنی کے کیس کی پیروی میں نے کی تھی۔" اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل تھی۔

"بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔" وہ اس سوال کے پیچھے چھپی بات کو ایک سیکنڈ میں سمجھا۔

"آپ مستقبل میں بھی ایسا کرنا چاہیں تو ڈونٹ وری، آپ کی پروفیشنل لائف میں میری یا رومیصہ کی کسی حوالے سے مداخلت نہیں ہوگی، بالکل ایسے ہی جیسے میں چاہوں گا کہ ہم دونوں میاں بیوی کی پرسنل لائف میں کوئی انٹرفیرنس نہ ہو نہ میری فیملی کی اور نہ روحی کے خاندان کی۔"

"دیکھیں، میرا پروفیشن آپ کی اور رومیصہ کی لائف کو ڈسٹرب کرسکتا ہے، میرا نہیں خیال کہ آپ کے خاندان کے لوگ اس لڑکی کو اپنی بہو بنانے پر راضی ہوں گے جس کی بہن نے ان کی کرپشن کو ساری دنیا کے سامنے دکھانے کی کوشش کی تھی۔" شہزاد کی اس بات پر وہ ہلکا سا بے چین ہوا۔

"آپ کو مجھ سے جس قسم کی گارنٹی چاہیے میں دینے کو تیار ہوں، اور میرے ننھیال میں اگر کچھ مسائل ہیں تو میں ان کی غلط چیزوں کا دفاع نہیں کروں گا۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گیا۔ اسی وجہ سے جب وہ اگلے ایک گھنٹے کے بعد شہزاد اور حمزہ کو مطمئن کر کے ان کے آفس سے نکلا تو اپنا کیس نوے فیصد جیت چکا تھا اور اسے مکمل یقین تھا کہ اب شہزاد اس کا ساتھ ضرور دے گی۔

☆☆☆☆

درشہوار پر تو لگتا تھا کوئی دھن ہی سوار ہوگئی تھی۔

وہ دادی کے اسلام آباد سے نکلتے ہی ان کے کمرے میں جا گھسی، ان کی وارڈروب، الماریاں، دراز یں ہر چیز چھان ماری، ابھی تک اس کے گوہر نایاب ہتھے نہیں لگا تھا جس کی تلاش کا اس نے مسز عالیہ قریشی سے وعدہ کیا تھا۔

بڑی حویلی میں ان لوگوں کا آنا جانا ہمیشہ عید، بقرعید یا خاندانی تقریبات پر ہوتا تھا اور بہت سال پہلے جب حاکم صاحب نے اسلام آباد شفٹ ہونے کا مکمل ارادہ کیا تھا تب انہوں نے اپنا مستقل ٹھکانا مری میں ہی بنایا تھا جہاں سے خاقان صاحب بہت سالوں سے الیکشن جیتتے چلے آرہے تھے۔

اس کے بعد یہ لوگ صرف خاص مواقع پر ہی اس بڑی حویلی میں اکٹھے ہوتے یا پھر معتصم صاحب الیکشن کے دنوں میں یہاں ڈیرہ ڈال لیتے، ان کی ہمیشہ سے ایک آبائی سیٹ اس شہر کی بھی ہوتی تھی۔

درشہوار، دادی کے کمرے سے مایوس ہو کر اسٹور کی طرف چلی آئی، جہاں دیوار میں بنی ہوئی الماریوں میں پرانے کاغذات کا ایک انبار لگا ہوا تھا، کمرے کی دیواروں میں سیلن زدہ بو رچی بسی تھی، اور الماریوں میں ڈاکومنٹس، اہم اخبارات، فائلز اور الم غلم چیزیں ٹھونس ٹھونس کر بھری ہوئی تھیں، وہ ایک گھنٹہ تو ان کے ساتھ مغز

ماری کرتی رہی لیکن وہاں بھی اسے کوئی کام کی چیز نہیں ملی۔

اچانک اس کی نظر آخری کونے میں رکھے ایک پرانے بریف کیس پر پڑی، جس پر لگا زنگ آلود تالا تھوڑی مشقت کے بعد کھل ہی گیا، وہیں اسے زلفی چچا کے این سی اے دور کے کچھ پرانے خطوط ملے، وہ جیسے جیسے انہیں پڑھ رہی تھی، اس پر انکشافات کا ایک جہان کھل رہا تھا، زلفی چچا نے مونیکا نامی ایک عیسائی خاتون سے گھر والوں کی اجازت کے بغیر شادی کرنے پر معافی مانگی تھی، اور ساتھ میں اپنا نکاح نامہ بھی پوسٹ کیا تھا، جس میں مسلم خاتون کا نام خدیجہ کے طور پر درج تھا اور شہوار کے دماغ کی بند کھڑکی ایک دم کھلی۔

"اچھا تو خدیجہ زلفی چچا کی بیوی اور ان کی بچی تھی۔" درشہوار کو اپنی رگ و پے میں سنسنی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

زلفی چچا کے آخری خط میں باپ سے بے تحاشا نفرت کا اظہار کرتے ہوئے مونیکا کے خاندان کو تباہ و برباد کرنے کا الزام بھی لگایا گیا تھا، اور انہیں مونیکا کے والد کی کمرشل زمین پر پلازہ کھڑا کرنے کی مبارک باد دیتے ہوئے والدین کی ساری زندگی شکل نہ دیکھنے کی قسم بھی کھائی تھی۔

درشہوار تو مر کر بھی یقین نہیں کرسکتی تھی کہ اس کے پردادا کے مزار پر بیٹھنے والے زلفی چچا جن کو مجنوں بنا کر گھر میں لا کر نہلایا دھلایا جاتا ہے وہ این سی اے کے گریجویٹ تھے۔ اس گھر کے بچوں کو شروع سے بتایا گیا تھا کہ بچپن سے ان کی ذہنی حالت پسماندہ تھی اور حاکم صاحب کے والد کے انتقال کے بعد تو ان کا دماغ بالکل ہی الٹ گیا تھا، لیکن اسی شخص کے لکھے گئے خطوط اس بات کا چیخ چیخ کا اعتراف کر رہے تھے کہ ان کے خلاف پھیلائی جانے والی ساری باتیں غلط تھیں اور محض ایک پروپیگنڈا تھا، جسے ماضی کے اس بدصورت واقعے پر پردہ ڈالنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

اس بریف کیس میں سے اسے کچھ دیمک زدہ قانونی کاغذات، پرانی تصویریں، اور خبارات کی کٹنگز ہاتھ لگیں اور اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، جو بیس پچیس سال پہلے کے اخبارات جو خاصے بوسیدہ ہو کر پھٹنے کے قریب تھے، اس میں جارج کے خاندان کی بلیک اینڈ وائٹ تصاویر کے ساتھ چھپی ہوئی خبریں، حاکم اور علاقے کے کونسلر کے خلاف کاٹی جانے والی ایف آئی آر جو جارج کے چھوٹے بھائی ڈیوڈ نے کٹوائی تھی، اس کی کاپی اس کے ہاتھ لگی، سب سے اہم وہ رقم کی لین دین کا معاہدہ تھا جو حاکم علی اور اس وقت کے کونسلر عبداللہ کے درمیان ہوا تھا، اگرچہ اس میں جارج کے گھر کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا تھا لیکن عبداللہ کو دی جانے والی لاکھوں کی رقم کے اندراج میں ایسی کوئی بات بھی تحریر نہیں تھی، جس سے علم ہوتا کہ میر حاکم نے یہ رقم اسے کیوں دی تھی۔

اخبارات میں چھپنے والے اس روح کو لرزا دینے والے واقعے کو پڑھ کر درشہوار کا دل کانپ اٹھا، ان خبروں کی تفصیل سے اسے اتنا تو اندازہ ہو گیا کہ جارج کا سگا چھوٹا بھائی ڈیوڈ بوسن روڈ پر واقع کسی پرائیویٹ اسکول کا پرنسپل ہے اور اس کے احتجاج کی تصویروں میں اسے عیسائی کمیونٹی اسکول کے بہت سے بچے بھی نظر آئے، اس نے ایف آئی آر سے ڈیوڈ کے گھر کا ایڈریس لیا اور وہ تمام چیزیں جو اس کیس میں مسز عالیہ قریشی کی مدد کر سکتی تھیں، اس نے اکٹھی کیں اور ان کو احتیاط سے ایک لفافے میں ڈالا اور اسٹور سے نکل آئی۔

"تائی جی کہہ رہی ہیں، تیاری کرو کل شام ہم سب کی اسلام آباد کی فلائیٹ ہے۔"

کوریڈور میں اس کا طوبیٰ سے سامنا ہوا تو اس نے شعوری طور پر ہاتھ میں پکڑا لفافہ اپنی شال کے پیچھے کرنے کی کوشش کی جو طوبیٰ کی نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔

"یہ کیا چیز چھپا رہی ہو تم؟"

"کچھ نہیں یار، کچھ پرانے اخبارات اور میگزین ملے تھے، سوچا فارغ وقت میں دیکھوں گی۔"
درشہوار نے اپنے لہجے کو دانستہ سرسری بنایا۔ ویسے بھی وہ کتابوں اور ڈائجسٹ کی دیوانی تھی، اس لیے نمیرہ فوراً ہی مطمئن ہوگئی۔ اسی وقت حویلی کے کسی کونے سے نمیرہ نکلی، اس کے ہاتھ میں ایک [illegible] مزے سے کھا رہی تھی، اس نے درشہوار کو سر سے لے کر پاؤں تک مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔
"تم کیوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہی ہو مجھے؟" درشہوار بہت دن بعد اپنے مخصوص کٹ کھنے انداز میں بولی۔
"تم نے بتایا ہی نہیں، منورانی! شادی والی رات تمہاری شاہی سواری کہاں گئی تھی، اور کہاں قیام فرمایا، ذرا چٹخارے دار بتا دو یار۔" نمیرہ نے بھنویں اچکا کر اپنی کزن کو شرارت سے کریدنا چاہا تو وہ تپ گئی۔
"جو گھٹیا باتیں تمہارے دماغ میں کلبلا رہی ہیں، ایسا ویسا کچھ نہیں ہوا، سب جانتے ہیں میں اپنی دوست منال کے گھر تھی۔"
"جمعہ جمعہ آٹھ دن کی دوستی میں کون رکھتا ہے کسی کو اپنے گھر میں۔" نمیرہ کا طنزیہ انداز اسے سلگا گیا۔
"تم جیسوں کو تو کوئی آٹھ سال کی دوستی میں بھی اپنے گھر نہ رکھے، چاہے آزما کر دیکھ لو۔"
درشہوار اسے آگ لگا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، ویسے بھی اس کی تمام تر توجہ ہاتھ میں پکڑے اس لفافے کی طرف تھی، جس پر گھر کے کسی مرد کی نگاہ پڑ جاتی تو پھر درشہوار کی بھی وہاج کے ساتھ ہی کہیں قبر بنا دی جاتی۔
"آخر اتنا غرور کس بات کا ہے اسے؟" نمیرہ نے جھنجلا کر طوبیٰ کی طرف دیکھا اور مزید گویا ہوئی۔ "ہم میں سے کوئی ایسی حرکت کرتا تو اس گھر کے بڑے کسی نامعلوم قبر میں دفنا کر چالیسواں بھی کروا چکے ہوتے اور نواب زادی کو تو سو خون معاف ہیں۔"
نمیرہ اپنی بات کہہ کر جیسے ہی پلٹی، اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا، کیونکہ تاجدار بیگم انتہائی غصے سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ نہ جانے کب اس وقت اپنے کمرے سے نکل کر وہاں پہنچ گئی تھیں اور انہیں پتا ہی نہ چلا۔ یہ گستاخی چونکہ ان کی لاڈلی کی شان میں کی گئی تھی اس لیے ان کا برہم ہونا فطری تھا اور وہ تو ویسے ہی آج کل اپنی اولاد کے معاملے میں شیرنی بنی ہوئی تھیں۔
"تم ذرا آؤ میرے کمرے میں۔" وہ سرد لہجے میں پھنکاریں۔
پورے ایک گھنٹے بعد جب نمیرہ تاجدار بیگم سے اچھی طرح عزت افزائی کروا کے ان کے کمرے سے نکلی تو اس کی آنکھیں لال اور چہرہ ذلت کے گہرے احساس سے تپ رہا تھا، وہ دل ہی دل میں درشہوار کو بے شمار گالیاں اور کوسنے دے کر سخت خفا ہو چکی تھی۔



مری کے در و دیوار پر گویا سفید رنگ کا پینٹ کر دیا گیا تھا۔
جنوری میں ہونے والی اس شدید برف باری نے کئی سڑکیں بلاک کر دی تھیں، میر حاکم کا سارا خاندان وہاج کی تدفین کے بعد واپس آ چکا تھا۔ انہوں نے اپنے اختیارات کا استعمال کر کے اسد چیمہ کو عمر قید کی سزا دلوا دی تھی اور صندل کیس میں معاونت پر ان کو الگ سے جرمانہ اور سزا سنائی گئی تھی۔
درشہوار نے واپس آتے ہی مسز عالیہ قریشی کے ساتھ رابطہ کیا تھا اور انہوں نے وہ سارے ڈاکومنٹس پڑوس میں ہادی کے پاس پہنچانے کی ہدایت کی تھی، اس دن وہ بلے پاؤں اوپر نیچے گھوم رہی تھی۔
سخت سردی کی شدت نے سب مکینوں کو اپنے کمروں میں دبک کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا، سرد ہوا میں

[illegible] ہوئی محسوس ہوتی تھیں، وہ سیاہ رنگ کا لمبا کوٹ پہنے، ایک مفلر سے اپنے کانوں کو لپیٹے ہوئے اس [illegible] اپنے کمرے سے نکلی تو اس کے کوٹ کے اندر وہی لفافہ تھا جو اسے ہادی تک ہر قیمت پر پہنچانا تھا، جیسے ہی وہ [illegible] سامنے قدرت امی اپنے ہاتھوں کو رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کرتے ہوئے نظر آئیں۔
"تم رات کے اس وقت کہاں جا رہی ہو؟" اسے لاؤنج کی سیڑھیاں اترتے دیکھ کر وہ تھوڑا مشکوک [illegible]
"بھوک لگ رہی تھی، کوئی ملازم تو نظر نہیں آ رہا، سوچا خود ہی کچھ بنا لیتی ہوں۔"
"[illegible] رات کے دس بج رہے ہیں، سب سرونٹ کوارٹرز میں چلے گئے، میں تو خود خاقان صاحب کا انتظار کر رہی [illegible]"
"کیا چچا ابھی تک آئے نہیں۔" اس نے ہلکا سا چونک کر پوچھا۔
"نہیں، اسد چیمہ کا پورا خاندان آیا بیٹھا ہے اسلام آباد، وہاں کوئی مذاکرات چل رہے ہیں۔ معتصم بھائی، [illegible] ارسل، سب وہیں ہیں۔" قدرت امی روانی میں اسے کافی تفصیل بتا گئیں اور درشہوار نے سکون کا سانس [illegible] کا مطلب تھا کہ گھر میں کوئی بھی مرد موجود نہیں۔ وہ مزید مطمئن ہوگئی۔
"مجھے نہیں لگتا اس شدید موسم میں کوئی بھی واپس آئے گا اور پھر لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے روڈز بھی بند ہو [illegible] آپ بھی جا کر سو جائیں۔" درشہوار نے اپنے لہجے کو ہر ممکن سرسری بنانے کی کوشش کی۔
"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو، مجھے کتنے نفلوں کا ثواب مل رہا ہے یہاں بیٹھ کر۔ خود ہی آ کر جگا لیں گے۔" انہوں نے پیروں میں رکھا ہیٹر بند کیا اور کھڑی ہو گئیں۔
"چائے پینی ہے تو بھجوا دوں آپ کو بھی۔" درشہوار نے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں بھئی، میں تو اب سوؤں گی، ویسے ہی نیند سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔" قدرت بیگم بے زاری سے کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔
درشہوار نے کچن میں جھانکا، وہ خالی تھا۔ ہر طرف میدان صاف دیکھ کر وہ دبے پاؤں پچھلے لان کے دروازے کی طرف بڑھی، طویل کوریڈور عبور کر کے اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا، ٹھنڈی یخ ہوا نے اس کا استقبال کیا، اور اسے فوراً ہی ناک میں ہلکی سی خارش سی محسوس ہوئی، اس نے بہت تیزی سے آتی ہوئی چھینک کو بمشکل روکا۔
برابر میں ہادی کے گھر کی لائٹس جل رہی تھیں، پچھلے لان میں جگہ جگہ برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، وہ بمشکل چلتی ہوئی درمیانی دیوار کی طرف آئی، بھاری کوٹ کی وجہ سے اسے دیوار پر چڑھنا عذاب لگ رہا تھا، اس طرف کے ایک ڈھیر پر اپنا ایک پاؤں جمانے کی کوشش کی، اور وہ اندر تک دھنستا چلا گیا، حالانکہ اس نے اونی جرابوں کے ساتھ بند شوز پہن رکھے تھے لیکن وہ اندر تک گیلے ہو گئے، سردی کی شدت ایک دم ہی بڑھ گئی۔
اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔
صبح سے ہونے والی برف باری کا سلسلہ وقتی طور پر رکا ہوا تھا اور کسی بھی وقت دوبارہ جاری ہونے کا امکان تھا۔ اس لیے وہ زیادہ دیر یہاں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی، اس نے برآمدے میں رکھے جھولے کے پاس پڑا اسٹول اٹھایا، اسے دیوار کے پاس رکھا اور دوسری جانب کود گئی۔
ٹھنڈی یخ جرابوں کے ساتھ چلنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا، اسی لیے جب وہ ہادی کے گھر پہنچی تو سردی سے ٹھٹھر رہی تھی، اس نے پہلی ہی بیل پر دروازہ کھول دیا تھا، وہ شاید پہلے سے اس کا منتظر تھا کیونکہ درشہوار مسز قریشی کو کال کر کے نکلی تھی۔

وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ اسے قدرے سکون کا احساس ہوا کیونکہ آتش دان میں جلتی لکڑیوں کی وجہ سے اندر کا ٹمپریچر کافی بہتر تھا۔ صوفے پر ہادی کا کمبل اور جیکٹ پڑی ہوئی تھی اور پاس ہی خالی نگ اور چلغوزوں کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی، وہ شاید اس کے آنے سے پہلے ڈرائی فروٹس کھا رہا تھا کیونکہ ڈرائی فروٹس کا جار بھی پاس ہی رکھا ہوا تھا۔

"مجھے کال کر دیتیں تو میں لان کی دیوار کے پاس آ جاتا۔" وہ شکر گزاری کے احساس سے مغلوب ہو کر فکر مند انداز میں بولا تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دی، وہ جانتی تھی اہمیت اس کی نہیں اس کے ہاتھ میں موجود لفافے کی تھی، جسے مسز قریشی نے خصوصی طور پر منگوایا تھا۔

"چائے پئیں گی آپ، آئی ایم سوری، ملازم چھٹی پر ہے اس لیے آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔" اس کا فارمل انداز درشہوار کو تکلیف دے رہا تھا لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی، جو آج بھی اس کے نام پر دھڑکنے سے باز نہیں آتا تھا۔ وہ اس کی خاموشی کو اثبات سمجھا۔

"آپ کا دوست کہاں ہے؟" اس نے سعد کی تلاش میں دائیں بائیں دیکھا۔

"اس کی والدہ پاکستان آئی ہوئی ہیں ان سے ملنے گیا ہوا ہے چڑی۔ تم بیٹھو، میں پانچ منٹ میں آیا۔"

ہادی کے کمرے سے نکلتے ہی درشہوار نے اپنے جوتے اتارے اور موزے اتار کر آتش دان کے قریب پھیلا دیے، اس کے پاؤں سردی کی شدت سے سرخ ہو چکے تھے، جب تک ہادی چائے بنا کر واپس آیا اس کے موزے سوکھ چکے تھے اور وہ اب انہیں پہن رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ اکیلے ہو گئے تھے کیا؟" اس کی خاموشی سے خائف ہو کر اس نے گفتگو کا آغاز کیا تو درشہوار نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس نے چائے کی ٹرے سائیڈ میز پر رکھی، ٹرے میں دو چائے کے کپ، ایک پلیٹ میں کباب اور دوسری میں نگٹس رکھے ہوئے تھے، شاید انہیں فرائی کرنے میں اسے دیر ہوئی تھی۔ درشہوار نے چائے کا کپ اٹھا لیا جبکہ فائل میں موجود کاغذات کو دیکھ کر ہادی کے چہرے پر تغیر رونما ہوا۔ وہ سانس روکے ان کو پڑھ رہا تھا، اس سارے فساد میں آٹھ دس لوگوں کی ہلاکتیں ہوئی تھیں اور ان سب کی ایف آئی آر بھی الگ الگ کٹوائی گئی تھی لیکن سب سے اہم کسی ڈیوڈ نامی بندے کی ایف آئی آر تھی جس میں حاکم صاحب کو ڈائریکٹ ملزم نامزد کیا گیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے یہ سب چیزیں تمہارے خاندان کا سیاسی مستقبل تباہ کر دیں گی؟" ہادی کی جانچتی ہوئی نگاہیں اس کے زرد چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"ہاں میں جانتی ہوں لیکن ہم جرم کو زیادہ دیر تک چھپا نہیں سکتے اور کبھی نہ کبھی تو مکافات عمل ہونا ہی تھا تو اب کیوں نہیں۔" وہ اٹک اٹک کر کہہ رہی تھی۔

"اس سے پہلے تمہیں اس بات کا احساس کیوں نہیں ہوا؟" چائے کا پہلا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے درشہوار کے شفاف چہرے کو پہلی بار غور سے دیکھا، وہ سر جھکائے کسی مجرم کی طرح بیٹھی تھی۔

"اس سے پہلے کسی نے یہ احساس دلایا ہی نہیں اور اپنے سے وابستہ خونی رشتے تو ویسے ہی انسان کو دودھ سے دھلے ہوئے لگتے ہیں۔" وہ پست لہجے میں بولی۔ اس کے اندر دکھ کی دھند چھانے لگی۔

"کیا تم اس بات کو مانتی ہو کہ تمہاری فیملی ہر قسم کی کرپشن میں ملوث رہی ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں گویا ہوا۔

کمرے میں ایک لمحے کو سناٹا چھا گیا۔ یہ واقعی ایک تلخ سوال تھا اور درشہوار کو کم از کم اس وقت ہادی سے اس کی توقع نہیں تھی۔

"میں اس بات کو مانتی ہوں لیکن میرے پاس ان کو روکنے یا سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں، لیکن اگر کوئی ان کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہے تو مجھے اس بات پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔" وہ آنسوؤں کے پھندے کو جھٹکتے بمشکل بولتے ہوئے ہادی کو حیران کر گئی۔

"درشہوار!" ہادی کے نرم انداز پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

"کیوں کر رہی ہو تم ایسا؟" ہادی نے اس بار ہتھیار ڈالنے والے انداز میں پوچھا۔

"ک... کیا کر رہی ہوں میں؟" اس کی آنکھوں کی نرمی دیکھ کر درشہوار کی زبان ہکلا گئی۔ اس نے کہاں یہ روپ دیکھا تھا۔

"اپنے خاندان کے تابوت میں آخری کیل تم کیوں ٹھونکنا چاہتی ہو۔" ہادی کے اس سوال پر اس کا دل سینے میں کسی زرد پتے کی طرح لرزنے لگا۔

"میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔" اس کا نم لہجہ وہ محسوس کر چکا تھا۔ اس کی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اس نے اس کا ایک بھی گھونٹ نہیں بھرا تھا۔

اسے زندگی میں پہلی بار اس لڑکی پر غصے کے بجائے رحم آیا۔ وہ بہت اچھی طرح سے جانتا تھا کہ وہ یہ سب کس خاطر کر رہی ہے، اس سے محبت کی بہت بھاری قیمت تھی جو وہ ادا کر رہی تھی لیکن پھر بھی نارسائی اس کا مقدر تھی۔ درشہوار کو اس کا ترحم بھرا انداز اچھا نہیں لگا۔

"اگر آپ کو یہ سب ڈاکومنٹس نہیں چاہئیں تو اٹس اوکے۔ میں کسی اور کو دے دوں گی کیونکہ میں یہ چاہتی ہوں، خدیجہ جیسی بچی کو انصاف ضرور ملے اور اس کے لیے مجھے جس حد تک بھی جانا پڑا، میں ضرور جاؤں گی۔" اس کے اندر کی ضدی درشہوار ایک دم جاگی تو ہادی مسکرا دیا۔

"میرے خیال میں ممی اور شیری اس کیس کو زیادہ عمدہ طریقے سے ہینڈل کر سکتی ہیں، اگر ڈیوڈ کے ساتھ ان کا رابطہ ہو جائے۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں، اس ایف آئی آر میں ڈیوڈ کا ایڈریس لکھا ہوا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ اسکول ابھی بھی اسی روڈ پر موجود ہے اگر یہ وہاں نہ بھی ہوئے تو وہاں سے ان کا کوئی نہ کوئی اتا پتا ضرور مل جائے گا۔" درشہوار اپنی بات مکمل کر کے رکی نہیں اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"ایک منٹ میری بات سنو درشہوار!" اس نے بے اختیار اسے پکارا، درشہوار کے قدموں نے چلنے سے انکار کر دیا۔

"واپس آؤ اور یہ چائے پیو، بہت محنت سے بنائی ہے میں نے۔" اس کے ہلکے پھلکے انداز پر وہ پلٹی، تیزی سے چلتی ہوئی میز کے پاس آئی اور ایک ہی بڑے گھونٹ میں پورا چائے کا کپ پی گئی کیونکہ وہ سرد موسم میں پڑے پڑے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

"میں تمہیں لان تک چھوڑ آتا ہوں۔" وہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

جیسے ہی درشہوار ہادی کے ساتھ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکلی، یخ بستہ ہواؤں نے دونوں کا استقبال کیا۔ سامنے برف روئی کے گالوں کی طرح بہت تیزی سے گر رہی تھی، اس نے خوف زدہ انداز میں آسمان کی طرف دیکھا، موسم اس کے خلاف سازش کر چکا تھا۔

"میرے خیال میں آپ کچھ دیر انتظار کر لیں، اتنی برف باری میں دیوار پھلانگ کے جانا آسان کام نہیں۔" ہادی اس کے لیے فکر مند ہوا۔

"اٹس اوکے، مجھے عادت ہے خطروں سے کھیلنے کی۔" وہ لاپروائی سے گویا ہوئی۔

وہ آسمان سے گرتی ہوئی برف کے نیچے، اپنے گھر کے پچھلے لان کی طرف تیزی سے بڑھی اور ہادی کا اسے روکنے کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ فضا میں ہی معلق رہ گیا، وہ تیز تیز چلنے کی کوشش میں لڑکھڑائی اور اس کا پاؤں [illegible] تکلیف کے گہرے احساس سے وہ دوہری ہو گئی۔ ہادی گھبرا کر اس کے پیچھے لپکا، دونوں پر اولے برسنے لگے، ایک دم ہی ان میں شدت آ گئی۔

"او مائی گاڈ، واپس چلو۔" وہ زبردستی اس کا بازو پکڑ کر برآمدے میں لے آیا، چند منٹوں کی [illegible] دونوں کے ہوش اڑا دیے۔

"انسانوں سے تو جھگڑتی ہی ہو، اب کیا موسموں اور فطرت سے بھی لڑو گی؟" وہ خفا ہوا۔

"مجھے جانا ہے۔" وہ ضد پر اتر آئی۔

"اس موسم میں، میں تمہیں جانے دوں گا، اندر چلو میرے ساتھ۔" وہ خفگی سے بولا۔

سردی کی شدت سے درشہوار کے ہونٹ نیلے پڑ گئے، اور وہ مسلسل چھینکیں مار رہی تھی، وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر لاؤنج میں لے آیا اور ہلکی سی ناراضی کے ساتھ اسے آتش دان کے قریب بٹھایا۔ اس مختصر وقت میں ہادی کی اپنی حالت بھی بگڑ چکی تھی۔ وہ بھی چھینکنے لگا اور اس کی ناک سرخ ہو گئی تھی، اسے لگ رہا تھا جیسے برف اس کے پورے وجود پر جم گئی ہو۔

"پلیز مجھے جانے دیں، کسی کو پتا نہ چل جائے کہ میں اپنے روم میں نہیں ہوں۔" وہ پریشان ہوئی۔

"بے فکر رہو ایسے موسم میں کوئی بھی نہیں نکلے گا باہر اور اگر کوئی پوچھے بھی تو کہہ دینا منزل سے ملنے گئی تھیں۔ تمہارے پاس بہانوں کی کون سا کمی ہوتی ہے۔" وہ جلی کٹی سناتے ہوئے صوفے پر رکھا کمبل اس پر ڈال رہا تھا، جو اتنے بھاری کوٹ میں بھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے اس بار اپنی زبان بھی ملتان میں ہی چھوڑ آئی ہو۔" آتش دان کے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے درشہوار کی کم گوئی پر طنز کیا۔

"میں اگر بولتی ہوں تو تب بھی برا لگتا ہے آپ کو اور اگر خاموش رہوں تو تب بھی ہضم نہیں ہوتا۔" وہ نم سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے شکایتی انداز میں بولی۔

"اسی لیے تو بندے کو اعتدال پسند ہونا چاہیے تاکہ لوگ ان چیزوں کو نوٹس نہ کریں۔" وہ ہاتھوں کو رگڑ کر سردی کی شدت کم کرنے لگا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔

"تم ایسے خاموش بہت عجیب لگتی ہو۔" ہادی کے دل کی بات اس کے ہونٹوں پر آئی۔

"اچھا، پھر آج بتا دیں، وہ کون ہے، جس سے آپ محبت کرتے ہیں۔"

شہزادو نے اپنی خاموشی کو بہت تیکھے انداز میں توڑا، ہادی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے کمبل میں تقریباً گھسی بیٹھی تھی۔ اس کی صرف روشن آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔

"اس سوال سے اچھی تو تمہاری خاموشی ہی تھی۔" وہ نظریں چرا کر دوبارہ اپنے ہاتھ سینکنے لگا۔

"اب آپ کو کیوں چپ لگ گئی، اس سے پہلے تو مجھ پر بڑے طنز کیے جا رہے تھے۔" وہ کمبل اتار کر آتش دان کے عین سامنے آن بیٹھی اور ہادی دانستہ اس سے تھوڑا ہٹ کر بیٹھ گیا۔ دونوں زندگی میں پہلی بار بغیر لڑے گفتگو کر رہے تھے۔

"میں کس سے محبت کرتا ہوں، کیا کرو گی یہ پوچھ کر؟" وہ اس سے دانستہ فاصلہ رکھنے کو اٹھ کر کھڑکی سے جھانکنے لگا، برف باری ابھی نہیں رکی تھی۔

"اپنے آپ کو سمجھاؤں گی اور دیکھوں گی کہ آخر اس لڑکی میں ایسی کیا بات ہے جو مجھ میں نہیں۔" وہ آہستہ

[illegible] کے بولی۔

"کوئی فائدہ نہیں، میں بہت سالوں سے اسے چاہتا آ رہا ہوں لیکن اس کے سامنے کبھی اظہار نہیں کیا اور وہ مجھ سے محبت کرتی بھی نہیں، ورنہ اس کے کسی نہ کسی اسٹائل یا انداز سے کچھ تو پتا چلتا۔" ہادی نے آج سچ بول دیا۔

"بہت اچھا ہوا آپ کے ساتھ بھی۔" درشہوار کی زبان پھسلی اور نہ چاہتے ہوئے بھی ہادی کو ہنسی آ گئی، یہ اس کا بے ساختہ ردعمل تھا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"اٹس اوکے، تم کہہ سکتی ہو تمہارا حق بنتا ہے، ظاہر ہے تمہارا گناہ گار جو ہوں میں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"اپنے دوست سے بات کر کے پروپوزل بھجوا دیں اس کے لیے۔" درشہوار نے دل پر کڑا جبر کر کے یہ مشورہ دیا۔

"نہیں، مجھے ڈر ہے کہ اس کی دوستی کا مان نہ ٹوٹ جائے، وہ کیا سوچے گا میں نے اسی کے گھر میں نقب لگا دی، مجھے اپنی بچپن کی یہ دوستی کچھ سالوں کی محبت سے بہت زیادہ عزیز ہے۔"

"بہت ہی عجیب باتیں ہیں آپ کی، اس طرح تو آپ اسے کھو دیں گے۔" درشہوار نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، جو اسے خاصا افسردہ لگا۔

"محبت ہمیشہ پانے کا نام تھوڑی ہوتی ہے درشہوار محتشم علی۔" ہادی کے جتاتے ہوئے انداز پر اس نے بے ساختہ نظریں چرائیں، نہ جانے کیوں اسے لگا جیسے وہ اسے ہی سنانے کو کہہ رہا ہو۔ دونوں کے درمیان ایک اور طویل خاموشی کا وقفہ ٹھہر گیا۔

بیس منٹ بعد درشہوار نے خود اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا، برف گرنے کا سلسلہ رک چکا تھا، وہ فوراً کھڑی ہوئی، ہادی نے بھی اس بار اسے نہیں روکا، وہ نہ صرف اس کے ساتھ پچھلے لان کی طرف آیا بلکہ ہاتھ پکڑ کر اسے چڑھنے میں مدد بھی دی، اس کے ہاتھوں کی حرارت کو محسوس کرتے ہوئے جب وہ اپنے بیڈروم میں پہنچی تو پورا گھر گہری نیند سویا ہوا تھا اور کسی کو اس کی اس حرکت کا پتا نہیں چلا، وہ خود بھی خاموشی سے آ کر لیٹ گئی اور اب اسے اگلے کئی گھنٹوں اس شخص کو سوچنا تھا جس کی زندگی میں اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی۔

☆☆☆

شہزاد جیسے جیسے اس فائل کا مطالعہ کر رہی تھی اس کی آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

مسز عالیہ قریشی نے کافی کا مگ میز پر رکھ کر بڑی جانچتی ہوئی نگاہوں سے شیری کی طرف دیکھا، اس نے فائل اب بند کر دی تھی۔ اس کا چہرہ زیادہ تر پرسکون ہی رہتا لیکن اس وقت وہ بھی اپنے تاثرات نہیں چھپا پائی۔

"میم، لوگ اتنا ظلم کیسے کر سکتے ہیں، فرعون بنتے ہوئے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ان کے لیے بھی کوئی نہ کوئی موسیٰ ضرور رکھا ہوگا۔"

شہزاد کو اس فائل میں موجود حقائق جان کر دلی افسوس ہوا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خدیجہ کی فیملی کے مجرموں کو پھانسی کے کٹہرے میں لا کھڑا کرے۔

"یہ سب پڑھ کر مجھے خود بھی بہت دکھ ہوا اور حاکم صاحب کے بارے میں تو میری رائے پہلے ہی اچھی نہیں تھی لیکن اس کیس کو پڑھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا اپنے پروفیشنل کیریئر میں اتنا بے رحم بندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

"نہ صرف بے رحم بلکہ انتہائی خود غرض انسان جس نے اپنی انا کی خاطر اتنے لوگوں کی جان لے لی۔"



شہزاد نے مزید لقمہ دیا۔

''ہاں مونیکا کے خاندان سے تو چلو ان کا کوئی ذاتی عناد تھا لیکن اس واقعے میں کرسچن کمیونٹی کے جو باقی لوگ مارے گئے ان بے چاروں کا کیا قصور تھا۔'' مسز قریشی افسردہ ہوئیں۔

''اور میں حیران ہوں کہ ان لوگوں کے خاندان والوں نے احتجاج کیوں نہیں کیا۔'' شہزاد کی بات پر ایک تلخ مسکراہٹ مسز قریشی کے لبوں پر ابھری۔

''ہمارے ملک میں کہاں لوگوں کو اتنی آسانی سے انصاف ملتا ہے، اور پھر اتنے اثر و رسوخ والے خاندان پر ہاتھ ڈالنے کے لیے بہت بڑا اسٹیمنا چاہیے، خیر چھوڑو یہ بتاؤ، پھر کیا سوچا ہے تم نے۔ اس کیس کو لڑو گی یا میں جبران کے ذمے لگاؤں۔'' مسز قریشی نے گیند اس کے کورٹ میں ڈالی۔

''یہ تو پکی پکائی کھیر ہے میم، اور میں یہ کسی اور کی پلیٹ میں کیسے ڈال سکتی ہوں، میرا خیال ہے مجھے کل ہی ملتان جا کر ہر حال میں جارج کے بھائی ڈیوڈ سے ملنا چاہیے، کیونکہ جو بندہ اتنے سال پہلے بھی اپنے بھائی کے خاندان کے لیے احتجاج کر سکتا ہے، وہ اب کیوں نہیں ہمارا ساتھ دے گا۔''

''ارتضیٰ تو آج کل بزی ہے لیکن تم ہادی کو لے جا سکتی ہو۔'' انہوں نے پرخلوص انداز میں مشورہ دیا، وہ شیری کو ہمیشہ بیٹیوں کی طرح اہمیت دیتی تھیں۔

''تھینک یو میم اس چیز کی ٹینشن مت لیں، حمزہ بھی آج کل چھٹیوں پر آیا ہوا ہے، وہ چلا جائے گا میرے ساتھ۔''

''ایک بات تو بتاؤ شیری، اگر تم مائنڈ نہ کرو تو۔'' مسز عالیہ قریشی کی بات پر اس کا دل بے اختیار دھڑکا، وہ سمجھ گئی کہ وہ حمزہ کے سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہیں۔

''جی ضرور۔''

''ایکچولی، ارتضیٰ تمہیں پرپوز کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں اس نے مجھ سے بات کی ہے، جیسا کہ تم جانتی ہو کہ اس کے پیرنٹس کی ڈیتھ ہو چکی ہے اور اسے اس کی خالہ نے پالا ہے تو وہ ان کو بھیجنا چاہ رہا ہے تمہارے گھر۔''

مسز قریشی کی خلاف توقع بات نے شہزاد کو حیران کیا، اور کچھ لمحوں کے لیے تو وہ بول ہی نہیں پائی، اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور پھر کھل کر ان کے ساتھ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اس کے بغیر اب کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔

''ارتضیٰ بلاشبہ ایک ڈیسنٹ بندہ ہے، اور کوئی بھی اچھی لڑکی ڈیزرو کرتا ہے، لیکن آئی ایم سوری میم، میری کسی کے ساتھ کمٹمنٹ ہے اور اس حوالے سے میں کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' شہزاد معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ ارتضیٰ اسے پسند کرتا ہے لیکن وہ اپنا پرپوزل ہی بھجوا دے گا، اس بات کا اسے گمان تک نہیں تھا۔

''میں جانتی ہوں شیری، ہادی نے ایک بار ذکر کیا تھا میرے سامنے۔'' وہ متانت بھرے انداز میں مسکرائیں۔

''ہادی نے میرے بارے میں ذکر کیا تھا؟'' شہزاد تعجب میں مبتلا ہوئی۔

''تمہیں شاید علم نہیں، تمہیں ہمیشہ میں نے ہادی کے حوالے سے دیکھا تھا لیکن جب اس سے تمہارے سلسلے میں بات کی تو اس نے مجھے حمزہ کی پسندیدگی سے آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کس طرح اس کی ہیلپ سے تمہیں تنگ کرتا رہا ہے۔'' مسز قریشی کی بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ہاں جب ہادی اور حمزہ کی دوستی کا مجھے علم ہوا تو تب ہی میں نے سارے کنکشن آپس میں جوڑے
ان کے پیچھے کون ہو سکتا ہے، لیکن ارتضیٰ نے ایسی بات کیوں کی، میرا خیال تھا کہ شاید اسے بھی اندازہ ہو
کہ میرے اور حمزہ کے بیچ کیا چل رہا ہے۔" شہزاد نے سنجیدگی سے کہا اور اگر اس وقت حمزہ یہ ساری باتیں
کے منہ سے سن لیتا تو شاید اسے خوشی سے پورا ہفتہ نیند ہی نہ آتی۔

"اگر اس چیز کا یقین ہوتا تو وہ کبھی بھی اپنے پروپوزل کی بات نہ کرتا، بہرحال میں اسے طریقے سے
دوں گی، تم حمزہ کو کال کرو اور ملتان پہنچنے کا پلان کرو، میرے خیال میں ہمیں اس الیکشن سے پہلے پہلے یہ بدلہ
لینا چاہیے۔"

"ان شاء اللہ اس بار حاکم علی کو عوام خود مسترد کرے گی، ان کے کالے کرتوت دیکھ کر کون ان کو ووٹ دے
گا۔" شہزاد نے میز سے اپنے مطلوبہ کاغذات اٹھائے اور مسز قریشی کے آفس سے نکل آئی۔ اسے اب جلد از جلد
اس کیس پر کام کرنا تھا۔



"تم نے کیا قسم کھائی ہے، اس خاندان کے خلاف ہر کیس لڑنے کی؟"
الف سیون سیکٹر میں موجود "چائے خانہ" میں بیٹھے ہوئے حمزہ نے اسے چھیڑا جو اس وقت خاصی ...
دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان اپنے کیس کی طرف تھا، اس لیے اس نے حمزہ کی بات کا ...
ملا۔ ویسے بھی وہ صبح کی فلائیٹ سے اس کے ساتھ ملتان جا رہا تھا اور رات کو ان کی واپسی بھی تھی۔

"شجاع علی کیس کی شکست میرے دل پر لکھی ہوئی ہے حمزہ خالد۔" اس نے اپنے اندر کی یہ بات آج اس
کے سامنے بھی کی تھی۔

"دوسروں کے بارے میں ایسے بغض پالنے والی تم لگتی تو نہیں ہو۔" نہ جانے کیوں آج حمزہ شرارت کے
موڈ میں تھا۔

"آپ کچھ بھی کہیں، میرا آج لڑنے یا فضول بحث کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔" شہزاد کی بات پر وہ قہقہہ لگا
کر ہنسا۔

"تو کبھی تمہاری بہن کے سسرالی رشتے دار یہاں بھی پہنچ گئے۔" حمزہ نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ میز پر
رکھتے ہوئے اسے مزید چھیڑا تو شہزاد نے غیر ارادی طور پر مڑ کر دیکھا، سامنے میر خاقان، کسی بیورو کریٹ کے
ساتھ سگار پیتے ہوئے اسی طرف ہی آ رہے تھے۔

"یہ انکل سمیع کیا کر رہے ہیں ان کے ساتھ۔" حمزہ ان کے ساتھ موجود شخص کو دیکھ کر حیران ہوا، دوسری
طرف خاقان صاحب کے ساتھ گرے سفاری سوٹ میں ملبوس شخص، حمزہ کو پہچان کر بڑی بے تکلفی سے اسی
جانب چلا آیا۔

"ہیلو مائی سن؟ کیسے ہو؟ تمہارا باپ تو آج کل لفٹ ہی نہیں کروا رہا اور آج کل کلب میں بھی ان کی آمد نہ
ہونے کے برابر ہو گئی ہے، ایک سوال ڈالا تھا اس کی طرف، اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملا، لگتا ہے تمہاری آنٹی کو
ہی دوبارہ مجبور کرنا پڑے گا۔"

وہ حمزہ کو پرجوش انداز میں گلے لگا کر شکوے کر رہے تھے جبکہ خاقان صاحب شہزاد کو سامنے دیکھ کر پھر سے
مگن ہوئے، جو حیرانی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر نو لفٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔

"آپ کو پتا تو ہے انکل، حریم کے پاکستان آنے کے بعد ابی کہاں لفٹ کرواتے ہیں کسی کو، اور آج کل
دونوں باپ بیٹی پشاور کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔" حمزہ نے مسکرا کر انہیں بتایا اور ساتھ ہی تعارف کی رسم

"شہزاد ان سے ملو یہ انکل سمیع ہیں، میرے والد کے بچپن کے دوست اور ہمارے پڑوسی بھی، اور انکل یہ
میری فرینڈ ہے بیرسٹر شہزاد۔"

"نائس ٹو میٹ یو۔" وہ بڑے پروقار انداز میں مسکرائے تو شہزاد کو محسوس ہوا کہ ان کی پرسنالٹی میں ایک
... جانے والا وقار تھا، جبکہ وہ اب اپنے ساتھ کھڑے شخص کا تعارف کروا رہے تھے، جس سے ان دونوں
کی ... ہو چکی تھی۔

"اور ان سے ملو یہ خاقان صاحب ہیں۔ ان کا نام تو میرے خیال میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، میرے
... کالج دور کے کلاس فیلو اور بہت اچھے دوست ہیں۔ آج یونہی پارکنگ میں ملاقات ہوئی تھی تو زبردستی پکڑ
کر لے آیا کہ ایک چائے کے کپ کے ساتھ ماضی کے قصے بھی دہراتے ہیں۔"

وہ اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں اپنے ساتھ کھڑے خاقان صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولے تو
... نے انہیں رسماً سلام کیا، ان کی گہری نظریں اسے خاصی کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں، وہ ٹکٹکی باندھے اس کی
... بارے تھے اور ان کا یہ انداز حمزہ کو بھی سخت ناگوار گزر رہا تھا۔

"ان کو کون نہیں جانتا۔ ماشاء اللہ اس ملک کی مشہور و معروف پرسنالٹی ہیں۔" حمزہ کے لہجے میں طنز کی
... شامل ہوئی، اسی وقت شہزاد کے سیل فون پر مینا بیگم کی آنے والی کال پر انہوں نے مضطرب انداز میں
... کی طرف دیکھا، جو کال اٹینڈ کر چکی تھی۔

"جی مام، کیسی ہیں آپ؟ جی جی میں حمزہ کے ساتھ ہوں، خیریت تو ہے ناں؟ کب آ رہی ہیں آپ
واپس؟"

وہ کال اٹینڈ کر کے دانستہ دوسری طرف چلی آئی اور جب وہ پانچ منٹ ان سے گفتگو کر کے واپس آئی تو
خاقان صاحب اور ان کے دوست سمیع خان اب ان کی ٹیبل پر بیٹھ چکے تھے، شہزاد کو کوفت کا بھرپور احساس
ہوا اور اس نے حمزہ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹا کس فیملی سے تعلق ہے آپ کا؟" سمیع صاحب کے تجسس بھرے انداز پر وہ خاصی بےزار ہوئی کیونکہ
وہ نہ تو خود دوسروں کی ذاتیات میں گھسنے کی قائل تھی اور نہ اپنے بارے میں ڈسکس کیا جانا اسے پسند تھا، اس لیے
اس نے بادل نخواستہ انداز میں جواب دیا۔

"فاروق سہگل، میرے نانا تھے، سہگل گروپ آف کمپنیز کے مالک اور میری مدر تانیہ خان فیشن ڈیزائنر اور
... کے نام سے اپنی بوتیک، بیوٹی سیلون اور جم وغیرہ کی چین چلا رہی ہیں۔"

"تم مینا کی بیٹی ہو۔ مینا سہگل کی؟" ان کی بوکھلاہٹ حمزہ اور شہزاد کے لیے تعجب کا باعث بنی۔

"جی، اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟" اس بار وہ اپنی ناگواری چھپا نہیں پائی۔

"اچھی ٹی شوبز کا خاصا بڑا نام ہیں وہ اور آپ کے والد؟" وہ خود کو سنبھال چکے تھے۔

"ڈیتھ ہو چکی ہے ان کی۔ حمزہ چلیں، مام کو ائیرپورٹ سے پک کرنا ہے مجھے۔" شہزاد کے صبر کا پیمانہ
لبریز ہوا، اور ویسے بھی مینا بیگم کی کال کے بعد تو وہاں بیٹھنے کا کوئی جواز بنتا ہی نہیں تھا۔

"او کے انکل، پھر ملاقات ہو گی۔ نائس میٹنگ ود یو۔" حمزہ دونوں سے باری باری ہاتھ ملا رہا تھا لیکن سمیع
خان اس وقت جنونا الجھن بھرے انداز کے ساتھ کبھی شہزاد اور کبھی میر خاقان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں
"چائے خانہ" سے نکل آئے۔

"کیا ضرورت تھی ان کے سامنے میرا تعارف کروانے کی؟" شہزاد گاڑی میں بیٹھتے ہی اس سے الجھ

پڑی۔
"شہرزاد، مسیح انکل کے بیٹے رمیز کے ساتھ بات چیت چل رہی ہے حریم کی۔ میں کیسے ان کو انکار کر سکتا تھا۔" حمزہ کی اس اطلاع پر وہ حیران ہوئی۔
"میر خاقان کے دوست ہیں وہ، خود سوچ لو کیسی فیملی ہو سکتی ہے وہ؟"
"کم آن یار، ہمارے پڑوسی اور فیملی فرینڈ ہیں، بہت اچھے طریقے سے ہم لوگ جانتے ہیں انہیں، بلکہ ہو سکتا ہے پاپا کے آنے کے بعد اگلے ہفتے کوئی انگیج منٹ یا نکاح کے فنکشن کی ڈیٹ بھی اناؤنس ہو جائے اور میں ملواؤں گا تمہیں اپنی ساری فیملی سے۔" حمزہ نے اسے مطمئن کیا۔
"اچھا ٹھیک ہے، اب جلدی چلیں، ماما ویٹ کر رہی ہوں گی اور پھر صبح مجھے بھی نکلنا ہے ملتان کے لیے رو کے پاس۔" حمزہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا، اس کی کوئی بات وہ بھلا کیسے ٹال سکتا تھا۔
اگلی صبح وہ گیارہ بجے ملتان میں جارج کے چھوٹے بھائی ڈیوڈ کے اسکول میں تھے اور وہاں جا کر پتا چلا کہ ڈیوڈ کا تو کچھ سال پہلے انتقال ہو چکا ہے اور یہ اسکول اب اس کا بڑا بیٹا روحان چلا رہا ہے اور روحان نے یہ سنسنی خیز انکشاف کیا کہ اس سارے قضیے میں جارج کا بیٹا دلاور جھلسنے سے بچ گیا تھا اور خوف زدہ ہو کر اسی علاقے میں اپنی خالہ کے گھر چھپ گیا تھا، جو امریکہ سے پاکستان آئی ہوئی تھیں اور وہ اسے اپنے ساتھ کینیڈا لے گئی تھیں اور وہ دو سال پہلے ہی اپنی فیملی کے ساتھ پنڈی شفٹ ہوا ہے۔
روحان نے وہیں بیٹھے بیٹھے مونیکا کے بھائی دلاور سے شہرزاد کی فون پر بات بھی کروا دی اور وہ یہ ساری بات سننے کے بعد خود ان سے ملنے کے لیے خاصا بے چین ہو گیا تھا، کیونکہ اپنے باپ اور دو کزن بھائیوں کے جھلسے ہوئے چہرے آج بھی اس کی راتوں کی نیند برباد کر دیتے تھے۔
اور اسی رات شہرزاد، حمزہ کے ساتھ واپس لوٹ آئی۔ اگلے دن دلاور ان کے آفس میں موجود تھا۔ اس کی عمر اس وقت چالیس کے قریب تھی، جس وقت یہ حادثہ ہوا اس وقت وہ چودہ یا پندرہ سال کا تھا اور اس حادثے کو چوبیس پچیس سال گزر چکے تھے۔
"مجھے لگتا ہے اگر قدرت نے اتنے سال بعد اس کیس کو کھولنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یقیناً اس میں کچھ نہ کچھ مصلحت ہو گی۔" دلاور کے پاس اب امریکن نیشنلٹی تھی اور اسے اپنی ایجنسی پر بھی پورا بھروسا تھا کہ وہ کسی بھی مشکل میں اس کا ساتھ ضرور دے گی۔
لیکن شہرزاد نے اسے یہ بالکل نہیں بتایا کہ یہ سارے ثبوت اور اس کیس سے متعلق چیزیں اس کے ہاتھ کہاں سے لگی ہیں بلکہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کیونکہ قریشی نے اس کے سامنے بھی درشہوار کا نام نہیں لیا تھا۔
اسی رات اس نے سارا کیس فائل کر کے اگلے ہی دن میر حاکم کو قانونی نوٹس بھجوا دیا۔
☆☆☆
"ارسل اور فارحہ کا نکاح۔"
میر ہاؤس میں ناشتے کی ٹیبل پر حاکم صاحب کی طرف سے گرائے جانے والے اس بم کے بعد بھلا کس کے حلق سے نوالہ گزر رہا تھا۔
ارسل پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا، اس کا خیال تھا شاید وہاج کی اس ناگہانی موت کے بعد ان میں کچھ تبدیلی آئے گی لیکن ان کے چہرے کی رعونت میں آج عجیب طرح کی سفاکی بھی شامل تھی۔
"بابا! یہ کیسے ممکن ہے بھلا؟" خاقان صاحب کو یہ بات انتہائی بے تکی لگی۔
"فارحہ گھر کی بچی ہے اور عدت کے بعد میں چاہتا ہوں کہ وہ اسی گھر میں رہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص

انداز میں فیصلہ سنایا۔
"آپ ہمیشہ وہی کیوں کرتے ہیں جو صرف "آپ" چاہتے ہیں؟" ارسل کے ہونٹوں پر یہ سوال آتے آتے رہ گیا۔ برہان بھی آج گھر موجود تھے۔ انہوں نے تاسف بھری نگاہوں سے اپنے اس کزن کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر گہرے صدمے کی کیفیت تھی۔
"مجھے تو یہ رشتہ کچھ مناسب نہیں لگ رہا۔" ندرت بیگم، اپنے سسر کی آنکھوں میں ناگواری بھانپ کر جلدی صفائی دینے کے انداز میں گویا ہوئیں۔
"اصل میں اباجی، ان دونوں کی عمروں میں اچھا خاصا فرق ہے۔"
"فرق تو تمہاری اور خاقان کی عمروں میں بھی اچھا خاصا ہے، تب اپنی باری میں یہ کیوں نہیں سوچا۔" وہ مخصوص ہٹ دھرم انداز میں بولے تو ندرت بیگم چپ کی چپ رہ گئیں۔ تاجدار بیگم نے طنزیہ نگاہوں سے شوہر کی طرف دیکھا جو حسب عادت سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے، وہاج کی موت کے بعد تو ان کو عجیب سی چپ لگ گئی تھی۔ چونکہ یہ معاملہ تاجدار بیگم کی اولاد کا نہیں تھا، اس لیے انہوں نے مصلحتاً چپ رہنے میں عافیت جانی۔
"آئی ایم سوری، مجھے یہ فیصلہ منظور نہیں۔" ارسل کرسی پیچھے کر کے فیصلہ کن انداز میں کھڑا ہوا اور اس بار اس نے اپنے نانا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کمالی سے جواب دیا۔
"وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" حاکم صاحب کو اس کی آنکھوں کی سرکشی نے تھوڑا ہوشیار رہنے پر مجبور کیا۔
"اس لیے کہ میں نکاح کر چکا ہوں۔" اس بار اصل بم حاکم صاحب پر گرا، وہ ایک دم غصے سے اٹھنے کی کوشش میں ہلکا سا لڑکھڑائے۔ شاک تو وہاں موجود سب ہی لوگوں کو لگا تھا اور سب سے پہلے حواسوں میں بھی تاجدار بیگم ہی آئیں۔ انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے اپنے سسر صاحب کو دیکھا۔
"اباجی! اب حالات بدل چکے ہیں، آپ میں بھی پہلے والا دم خم نہیں رہا، اس لیے تھوڑی لچک کا مظاہرہ کریں، جوان خون ہے، پوچھیں اس سے کہاں کیا ہے نکاح؟ کون ہے ہماری بہو رانی؟ شکر ہے اخبار کے ذریعے اس شادی کی اطلاع نہیں ملی، اس سے پہلے تو اس گھر کے مردوں کی خبریں ایسے ہی پہنچا کرتی تھیں، کیا بھول گئے آپ؟" تاجدار بیگم کا اشارہ خاقان کی طرف تھا، اور حقیقتاً انہیں ارسل کی دلیری نے لطف دیا تھا۔
"تم چپ رہو، میں تمہاری اولاد کی بات نہیں کر رہا، اس لیے زیادہ زخموں پر نمک چھڑکنے کی ضرورت نہیں۔"
انہوں نے تاجدار بیگم کو بُری طرح سے جھڑکا، لیکن ان کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا، وہ مزے سے اپنے چائے کے کپ میں مزید چینی گھولنے لگیں۔ ویسے بھی دونوں سسر اور بہو کے اختلافات اب کسی سے ڈھکے چھپے نہیں رہے تھے۔ طوبیٰ، نمیرہ، انابیہ اور درشہوار نے خوف زدہ انداز میں ارسل کی طرف دیکھا، وہ تن کر حاکم صاحب کے سامنے کھڑا تھا۔
"یہ تربیت کی ہے تم نے اس کی؟ اس لیے تمہاری گود میں ڈالا تھا اسے؟" حاکم صاحب نے اپنا غصہ ندرت بیگم پر اتارا۔
"تربیت تو آپ نے بھی کی تھی زلفی کی، وہ کیوں نکل گیا تھا ہاتھوں سے؟" تاجدار بیگم نے بھی آج ان کا دل جلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔
"بکواس بند کرو تم اپنی۔" وہ ایک دم چیخے تو برہان نے پریشانی سے ماں کا ہاتھ دبا کر ان کو چپ رہنے کا

اشارہ کیا۔ جو استہزائیہ نظروں سے اپنے سسر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان پر آج کسی بھی بات کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

"ارسل، ابھی اور اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے اور دوبارہ اپنی منحوس شکل دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ تم جیسی احسان فراموش اور نافرمان اولاد کی مجھے ضرورت نہیں اور یاد رکھنا اس چیز کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔" اپنی شہادت کی انگلی سے ارسل کو دھمکا رہے تھے اور ان کے یہ جملے ہال میں داخل ہوتے ہوئے شاہ میر نے مکمل ہوش و حواس کے ساتھ سنے۔

اس کے ہاتھ میں کورٹ کی طرف سے موصول ہونے والا ایک نوٹس تھا، جسے وہ کھول کر پڑھ چکا تھا۔ تبھی اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ طوبیٰ نے نفی میں سر ہلا کر اسے خاموش رہنے کی التجا کی لیکن وہ بھی آج اپنی ماں کی طرح کشتی میں تھا۔

"واجی، پہلے اس نوٹس سے تو نبٹ لیں پھر ارسل کو بھی گھر سے نکال دیجیے گا۔ یہ بیرسٹر شیری نے اپنے کلائنٹ کی طرف سے بھیجا ہے۔" شاہ میر کا انداز سراسر دل جلاتا ہوا تھا، خاقان صاحب کا رنگ اڑا، اور چونکے معتشم بھی تھے اور ٹھیک ٹھاک پریشان ارسل بھی ہوا، اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور اسے سب سے پہلے خیال رومیصہ کا آیا تھا کہ کہیں شیری نے اس کے حوالے سے تو کوئی کیس نہیں کر دیا۔

"کیا نام لیا تم نے؟ کس نے بھجوایا ہے یہ نوٹس؟" حاکم علی کا دماغ بھک کر کے اڑا، ان کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

"کوئی خدیجہ، عرف مونیکا نامی خاتون کا بھائی دلاور ہے، جس نے دعویٰ کیا ہے کہ آج سے پچیس سال پہلے اس کے پورے خاندان کو آپ نے ایک کمرشل زمین کی خاطر جلا کر بھسم کر دیا تھا اور اس مقصد کے لیے قرآن پاک کی بھی توہین کے مرتکب ہوئے اور کافی بے گناہ لوگ بھی مروا دیے۔" شاہ میر کے جتاتے انداز پر حاکم صاحب کا رنگ فق ہوا۔

"کون دلاور؟ کون مونیکا؟ میں نہیں جانتا کسی کو۔" ان کے دماغ پر گویا کسی نے ہتھوڑا برسایا تبھی وہ بوکھلا گئے۔

"وہ خود کو دو الکفل چچا کا سالا بتاتا ہے اور اس نے آپ پر اپنے باپ اور بہن بھائیوں کے قتل کا الزام لگایا ہے۔" شاہ میر کی بتائی جانے والی تفصیل سن کر دُر شہوار کا دل بری طرح سے دھڑکنے لگا، اس نے بے اختیار اپنی نگاہیں پاؤں کے انگوٹھے پر جما دیں، دل و دماغ میں ایک حشر سا برپا ہو گیا تھا، اس کے پھینکے ہوئے ثبوت اب تیر کی طرح بالکل درست نشانے پر لگے تھے۔

"دماغ تو نہیں خراب ہو گیا اس کا؟ کوئی پاگل تو نہیں ہے یہ، چیک کرواؤ۔" میر حاکم تو حواس باختہ ہو کر انہیں پہچاننے سے ہی انکاری ہو گئے، ان کی کتابوں میں تو خدیجہ کا سارا خاندان جہنم رسید ہو چکا تھا اور ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنے سال بعد کوئی اس خاندان کا فرد ان کے سامنے آن کھڑا ہو گا۔

"بتایا تو ہے نوٹس میں، ذوالکفل کی بیوی کا چھوٹا بھائی ہے وہ۔"

تاجدار بیگم نے اپنے مخصوص تیکھے انداز میں انہیں یاد دلایا، جبکہ ان کے سسر کچھ دیر پہلے ارسل کے قصے کو بھلائے اب اس نئی مصیبت پر اچھے خاصے گھبرائے ہوئے تھے کیونکہ اس بار ہاتھ سیدھا ان کے گریبان پر ڈالا گیا تھا۔

"یہ بیرسٹر شیری وہی ہے ناں شجاع غنی اور صندل کیس والی؟" معتشم علی نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

"لگتا ہے اس شیری کا بھی اس خاندان سے کوئی پرانا ہی حساب کتاب نکلتا ہے ورنہ کوئی کسی کے پیچھے

تو محنت دھوکے تھوڑی پڑتا ہے۔" تاجدار بیگم طنزیہ انداز میں بولتی ہوئی اس بار خاقان صاحب کو بے چین کر گئیں۔

نوٹس اب حاکم علی کے ہاتھ میں تھا اور وہ جوں جوں اسے پڑھ رہے تھے، ان کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت رونما ہو رہی تھی۔ اس سارے ہنگامے میں ارسل چپکے سے اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور بڑے سکون سے اپنی ضروری چیزیں اور ڈاکومنٹس ڈال کر نمیرہ اور عدرت آپی کو تسلی دے کر گھر سے نکل آیا، اس سارے واقعے کے بعد اس گھر میں مزید رہنے کا کوئی جواز اسے نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اس نے فوراً آن لائن اپنی اور رومیصہ کی دوبئی کی ٹکٹس کی بکنگ کروائی، وہ اب جلد از جلد ان سب کی نظروں سے دور اپنی ایک نئی دنیا سکون سے بسانا چاہتا تھا۔

"پرابلم کیا ہے اس بیرسٹر شیری کو ہم سے؟ اس نے کیا ٹھیکہ اٹھا رکھا ہے ہمارے خاندان کے خلاف ہر کیس لینے کا؟" معتشم صاحب کو نہ جانے کیوں ایک دم غصہ آیا۔ ویسے بھی وہاج کی موت کے بعد ان کا مزاج عجیب سا دھوپ چھاؤں جیسا ہو گیا تھا۔

"مجھے یہ لڑکی اب زیادہ دیر تک زمین پر چلتے پھرتے ہوئے نظر نہیں آنی چاہیے۔ بہت دے دی اس کو ڈھیل۔ اب معاملہ آر یا پار کرنا ہی ہو گا۔" حاکم صاحب نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ان کی آنکھوں میں لہو اتر آیا۔

"نہیں بابا جان! اس معاملے کو پہلے مجھے ہینڈل کرنے دیں، میرے خیال میں اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" خاقان بوکھلا کر کھڑے ہوئے اور ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے وہاں موجود سب لوگوں کو چونکا دیا۔ خواتین ہال کمرے سے جا چکی تھیں اور اس وقت وہاں صرف میر ہاؤس کے مرد موجود تھے۔

"شرم کرو، تمہاری بیٹی کی عمر کی ہے وہ۔" حاکم صاحب ان کی بات کا غلط مطلب سمجھے۔

"خدا کے لیے بابا جان، ہر چیز کا حل، افیئر یا شادی نہیں ہوتی، میں اس کے ساتھ بیٹھ کر کوئی ڈیل کروں گا اور آپ لوگوں میں سے کوئی بھی اس معاملے میں مجھ سے پوچھے بغیر قدم نہیں اٹھائے گا، ورنہ یہ کسی کے بھی حق میں بہتر نہیں ہو گا۔"

خاقان صاحب اپنی بات مکمل کر کے ہال سے نکل گئے، معتشم علی نے الجھن بھرے انداز سے اپنے والد کی طرف دیکھا، جو اس وقت مزید جھنجلائے ہوئے لگ رہے تھے اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مونیکا کے بھائی دلاور اور بیرسٹر شیری کو اس زمین پر دوبارہ سانس بھی نہ لینے دیں۔

☆☆☆

نینا بیگم پھٹی پھٹی نگاہوں سے کبھی شہزاد اور کبھی رومیصہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"تم دونوں بہنوں کا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ یہ کیا اول فول سنا رہی ہو مجھے؟"

نینا بیگم نے بات کے آغاز میں ہی ایک دم چیخنا شروع کر دیا تو رومیصہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کی تو ویسے ہی آج کل طبیعت خراب رہتی تھی، جبکہ شیری بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دو دن پہلے ہی وہ کراچی سے فیشن ویک اٹینڈ کر کے واپس آئی تھیں اور ان دنوں خوب خبروں میں تھیں، شہزاد نے بہت سوچ سمجھ کر ان سے یہ بات شیئر کرنے کا فیصلہ کیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ ایک دم ہی پھٹ پڑیں۔

"تو کیا ہوا ماما، نکاح ہی تو کیا ہے۔" شہزاد نے ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ دہرایا تو رومیصہ نے مشکور نگاہوں سے بہن کی طرف دیکھا، جو اس سے ناراضی کے باوجود اس کا مقدمہ ماں کے سامنے لے آئی تھی۔

"آخر کون ہے وہ؟ کوئی والی وارث تو ہو گا اس کا؟ یا پھر ڈائریکٹ آسمان سے کودا ہے یا زمین میں اگا

ہے، اور روی اتنی عقل والی کب سے ہو گئی کہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے خود سے کرنے لگے۔" بیٹا بیگم
نہیں چل رہا تھا روبیعہ کے حلق میں انگلی ڈال کر ساری تفصیلات ایک ہی بار میں نکلوا لیں اور ان کی ان تلخ باتوں
نے روبیعہ کے اندر کی منہ پھٹ لڑکی کو بھی جگا دیا۔

"مام، میں نے یا شیری نے کبھی آپ سے پوچھا کہ یہ ہارون رضا کون تھا؟ اس کا بیک گراؤنڈ کیا تھا؟ آپ نے اس سے کیوں شادی کی؟ یا سیف الرحمٰن کے ساتھ میڈیا آپ کے بارے میں کیا اوٹ پٹانگ چھاپ رہا ہے۔" اس نے تو سیدھا ماں کے گریبان میں ہی ہاتھ ڈال دیا اور ان سب باتوں کے بعد بیٹا بیگم کا پارہ ہائی ہونا ایک فطری بات تھی، ان کا چہرہ سرخ ہوا اور آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

"شٹ اپ، میں تمہاری ماں ہوں، تم میری ماں بننے کی کوشش مت کرو۔"

"آپ اگر میری ماں ہیں تو اپنی شادیوں کی فکر کرنے کے بجائے ہمارے بارے میں کچھ سوچتیں۔ شیری کو تو اٹھا کر بھجوا دیا تھا لندن اور میں نے تو سارے عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بھگتے ہیں۔" وہ بھی آج کوئی ادھار رکھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"کول ڈاؤن روبی! مام میں مل چکی ہوں ارسل سے اور وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے روبی کے لیے۔" شہزاد نے ان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"تو یوں کہو نا، یہ تم دونوں بہنوں کی ملی بھگت ہے اپنی ماں کو نیچا دکھانے کی۔" وہ بھڑک اٹھیں۔

"فار گاڈ سیک مام! کیوں ہر بات کا غلط مطلب نکال رہی ہیں۔" شہزاد نے ہلکا سا جھنجلا کر ان کی طرف دیکھا، جو اس وقت کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھیں اور یہ بات ان دونوں کے حق میں غلط جا رہی تھی۔

"بتاؤ کس فیملی سے تعلق ہے اس کا؟"

"میر حاکم علی کا نواسا ہے وہ۔ اب بتائیں؟" روبیعہ کی اطلاع پر بیٹا بیگم کا کھلا منہ بند ہونا ہی بھول گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورے جسم کا خون سمٹ کر ان کے چہرے پر آ گیا ہو۔ ان کے ماتھے کی شکنیں، ان کے اندرونی مزاج کی بھرپور عکاسی کر رہی تھیں۔

"گندا خون، گند نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔" وہ ہوش میں آ کر ہذیانی انداز میں چیخیں۔ انہوں نے اپنے پاس رکھا کشن پوری قوت سے زمین پر مارا اور مشتعل انداز میں روبی کے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔

"تمہیں پورے شہر میں وہی منحوس خاندان ملا تھا جس نے اتنے لوگوں کو اجاڑ دیا، جن کے کرپشن کی کہانیاں آئے دن میڈیا کے لیے چسکے کا سامان بنتی ہیں، جن کے گھر کے گیٹ کے سامنے سے بھی گزرتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں، جن کے ہاتھوں پر نہ جانے کتنے لوگوں کا خون ہے۔ اوہ میرے خدایا، روبی یہ تم نے کیا کیا، مجھے تو جیتے جی ہی مار دیا؟" وہ دانت بھینچ کر اٹھتے ہوئے طیش کو دبانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ روبی کا منہ تھپڑوں سے لال کر دیتیں۔

روبیعہ نے گھبرا کر شہزاد کی طرف دیکھا، جس نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس سے پہلے کہ وہ بولتی، بیٹا بیگم فیصلہ کن انداز میں کھڑی ہوئیں۔ ان کا چہرہ غصے کی زیادتی سے بگڑا۔ انہوں نے شہزاد کی طرف دیکھ کر حکمیہ لہجے میں کہا۔

"شیری تم سب سے پہلا کیس آج روبی کی طرف سے خلع کا دائر کرو گی، ورنہ میرا تم دونوں سے کوئی لینا دینا نہیں، میں زہر کھا کر خودکشی کر لوں گی۔" ان کی سانسیں بے ہنگم انداز میں بے ربط ہو رہی تھیں، اس لیے وہ جذباتی انداز میں پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

روبیعہ نے ایک بار پھر پریشانی سے اپنی بہن کی طرف دیکھا، جو ابھی بھی پرسکون تھی، روبی کو اس پر بے

ساختہ رشک آیا، وہ چاہ کر بھی اس جیسی نہیں بن سکتی تھی، شہرزاد اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ڈائل کر رہی تھی دوسری طرف سے کال اٹینڈ کر لی گئی۔

"ارسل تم نے بتایا تھا تمہارا اور رومیصہ کا ویزا آچکا ہے، تم کتنے گھنٹوں میں روحی کو لے کر پاکستان سے باہر جاسکتے ہو؟"

اس کی بات پر رومیصہ پر بدحواسی طاری ہونے لگی جبکہ شہرزاد فون کے دوسری طرف موجود ارسل کی بات غور سے سن رہی تھی۔

"بس تم دونوں کل شام یہاں سے نکلو، باقی چیزیں میں ہینڈل کرلوں گی اور جب حالات بہتر ہوں تو واپس آجانا۔" اس نے بات مکمل کر کے فون بند کر دیا۔

"شیری یہ تم کیا کر رہی ہو، مام ہنگامہ کھڑا کر دیں گی۔" وہ خوف زدہ انداز میں اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا، ابھی تمہارا اور ارسل کا پاکستان میں رہنا بہتر نہیں اور ویسے بھی اس کی ڈیل بھی ہاتھ سے نکل چکی ہے، اس لیے بہتر ہوگا کہ تم دونوں کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہو جاؤ اور رہی بات مام کی، میں ان کو تم سے زیادہ جانتی ہوں اور ہینڈل کر سکتی ہوں۔"

"لیکن شیری!" وہ تذبذب کا شکار ہوئی۔

"میں نے کہا ناں روحی، تم یہاں نہیں رہو گی، میں تم سے زیادہ ان حالات کو سمجھتی ہوں اور میں نہیں چاہتی ان سب چیزوں کا اثر تمہارے بچے پر پڑے، اس لیے پلیز میری بات مانو اور یہاں سے نکل جاؤ۔" اس نے نرمی سے بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے سمجھایا اور روحی کی سمجھ میں بھی بات آگئی۔

"تھینک یو شیری۔ آئی لو یو سوچ۔" رومیصہ بے اختیار انداز میں اس کے ساتھ لپٹ گئی، شیری نے محبت بھرے انداز میں اس کے بالوں کو سہلایا۔

"میرے پاس بہت کم رشتے ہیں رومیصہ، میں ان کو کھونا نہیں چاہتی، اپنا بہت خیال رکھنا، میں اور حمزہ بہت جلد تمہارے پاس آئیں گے۔" شہرزاد کی بات پر رومیصہ نے خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس کا مطلب ہے تم بھی اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکی ہو۔ ٹرسٹ می، حمزہ تمہارے لیے ایک بہترین انتخاب ہوگا، میں بہت دعا کروں گی تم دونوں کے لیے" روحی جذباتی ہوئی۔

"تم جا کر اپنی پیکنگ کرو، مجھے اپنے کیس پر تھوڑا کام کرنا ہے۔۔" اس نے مسکرا کر رومیصہ کا گال تھپتھپایا تو وہ ایک بار پھر محبت سے اس کے گلے لگ گئی۔ شہرزاد اس کی دلی کیفیت کو بہت اچھی طرح سے سمجھ رہی تھی، اس نے زندگی کے بہت سال، بہن اور ماں کے ہوتے ہوئے تنہائی کا ایک لمبا عذاب کاٹا تھا۔ اس لیے اسے اپنی زندگی میں اچانک آنے والی خوشیوں کو سنبھالنا نہیں آ رہا تھا۔ اگلے دن شام کی فلائیٹ سے وہ ارسل کے ساتھ برونائی کے لیے نکل گئی اور حمزہ ان کو ایئرپورٹ ڈراپ کر کے آیا تھا۔

☆☆☆

حریم کے نکاح کی خبر ہادی کو اسلام آباد ایکسپریس ہائی وے پر ملی۔

ایک لمحے کو تو اس کی گاڑی کا اسٹیئرنگ بے قابو ہوا لیکن اس نے جلد خود کو سنبھال لیا، دل کی دنیا میں ایک حشر تو برپا ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسری طرف حمزہ بڑے خوش گوار موڈ میں اس کو اپنی بہن کے نکاح کی تفصیلات بتا رہا تھا، جو اچانک ایمرجنسی میں کرنا پڑا۔

"وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے یار اس لیے ابی نے بھی کچھ نہیں سوچا، آناً فاناً نکاح پڑھا دیا، کسی کو بھی انوائیٹ نہیں کر سکے، بس شہرزاد کو دس منٹ کے نوٹس پر اس کے گھر سے اٹھا کر لایا تھا میں، لیکن اچھے

ہے کہ تم اس وقت مری میں تھے اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔" حمزہ اپنی طرف سے اسے صفائی دے رہا تھا جبکہ ہادی کے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں، اس کے ذہن میں بس ایک ہی فقرے کی تکرار ہو رہی تھی۔

"وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔"

اس فقرے کے بعد تو کسی بات یا گلے شکوے کی گنجائش ہی نہیں نکلتی تھی، ہادی کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک طرفہ محبت کا اختتام بہت ہی بھونڈے طریقے سے ہوا تھا اور حریم اب اس کے دل میں ایک خوب صورت یاد بن کر رہنے والی تھی۔ اسے خود پر قابو پانا دشوار لگا۔

"ابی کو اور حریم کو مبارک باد دینا میری طرف سے۔" ہادی کا لہجہ بھرا گیا۔ اس نے گلے میں اٹکے نمکین آنسوؤں کو بمشکل نگلا، وہ کیسے حمزہ کے سامنے اپنے ضبط کا بندھن توڑ سکتا تھا، کیونکہ وقت کی ڈور اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔

"ہاں یار اور دو دن لگا، ابھی تو وہ اپنی ہی ہواؤں میں ہے، تم بھی چکر لگانا ہماری طرف۔" حمزہ رسمی گفتگو کے بعد فون بند کر چکا تھا۔

ہادی نے گاڑی ایک سائیڈ پر لگائی اور بازو کی پشت سے اپنی نم آنکھوں کو بری طرح سے رگڑا، اسے پہلی بار احساس ہوا کہ یک طرفہ محبت سے بڑی دنیا میں کوئی سزا نہیں ہوتی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ناکام محبت کا مزید ماتم منانا، مسز عالیہ قریشی کی کال نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ کچھ تھکی تھکی سی لگ رہی تھیں اور اسے آفس سے پک کرنے کی درخواست کر رہی تھیں کیونکہ ان کی گاڑی مناہل کی والدہ کو ایئرپورٹ سے پک کرنے گئی ہوئی تھی۔

وہ نڈھال قدموں اور افسردہ دل کے ساتھ مسز قریشی کو لینے ان کے آفس پہنچا تھا وہ بھی اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر تھوڑی پریشان تو ہوئیں لیکن ہادی نے ان کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کر ہی دیا۔

وہ دونوں ماں بیٹا گھر پہنچے تو مسز قریشی کی گاڑی پہلے سے پورچ میں موجود تھی، اس کا مطلب تھا کہ مناہل کی والدہ ایئرپورٹ سے گھر آچکی تھیں۔ دونوں جیسے ہی گھر کا اندرونی دروازہ کھول کر کوریڈور میں پہنچے، مناہل کی والدہ کی بلند آواز دونوں کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ شاید اس وقت عبداللہ قریشی کے ساتھ سٹنگ روم میں موجود تھیں۔

"میرے خیال میں بھائی جان آپ کو بتا دینا چاہیے عالیہ بھابھی کو ہادی کی حقیقت کا، ابھی میں تو اس دفعہ بھی سوچ کر آئی ہوں۔"

اس جملے نے دونوں کے قدم ساکت کر دیے، ہادی نے الجھن بھری نگاہوں سے مسز عالیہ قریشی کی طرف دیکھا، جو منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔

"خدا کے لیے فائزہ، کبھی مر کر بھی عالیہ کو مت بتانا کہ اس رات آپریشن تھیٹر میں کیا ہوا تھا اور ہادی اس کی سگی اولاد نہیں۔"

یہ ایک جملہ نہیں، ایک نشتر تھا جو دونوں ماں بیٹے کے دلوں میں ایک ساتھ آکر چبھا، ایک آری تھی جو ان کے دل و جان کو کاٹتی چلی گئی۔ وہ ششدر نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے چلے گئے۔

آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ

عنبرین ولی

ہمارا آشیانہ



آج موسم کافی خوش گوار تھا۔ نیلے آسمان پر سفید بادل چھائے تھے اور ٹھنڈی ہوا یہاں سے وہاں اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ ماہرہ دو بجے اسکول سے واپس آئی تھی، کھانا کھا کر جو سوئی تو عصر کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھلی۔ کچھ دیر وہ یونہی کسل مندی سے بستر پر پڑی رہی۔ اس کی چارپائی کمرے کی کھڑکی کے برابر ہی رکھی ہوئی تھی۔

ان کا گھر پرانے زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔ یہی کوئی پچاس سال پہلے اور اسی طرز کا، سوا ایک بار کی تعمیر کے بعد دوبارہ اس میں کوئی بھی اضافہ یا تبدیلی نہیں ہوئی۔ بدرنگا سا بڑا سا دالان، بڑے بڑے کمرے اور بڑی بڑی ہی کھڑکیاں۔ کمرے کے فرش سے تقریباً پانچ فٹ اونچی کھڑکی تھی، چارپائی اس کے ساتھ جوڑ کر رکھ دی جاتی، ٹھنڈی ہوا اسی راستے اندر داخل ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ برآمدے کا پورا منظر صاف اور واضح دکھائی دیتا۔ حتیٰ کہ گھر کا دوسرا چھوٹا بیرونی دروازہ بھی۔

ماہرہ کی ادھ کھلی آنکھیں برآمدے پر تھیں، جو اس وقت خالی تھا۔ ساتھ والے کمرے سے ٹی وی کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ انگلیوں سے آنکھیں رگڑیں۔ دوپٹا گردن میں لپیٹا۔ کھڑے ہو کر چارپائی پر پڑی چادر کو جھاڑ کر دوبارہ سمیٹ کیا اور باہر آگئی۔ ایک کونے میں پڑی جھاڑو اٹھائی۔ اسی وقت اس کی امی دوسرے کمرے سے باہر آگئیں۔

''تم کب جاگیں؟'' کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی ذرا سا اونچا جسے نہ تو چبوترہ کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ ہموار فرش تھا۔ بس چپل رکھنے کی جگہ تھی۔ وہاں پڑی چپل پیروں میں اڑستے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''وہ بھی ابھی جاگی ہوں۔'' ماہرہ نے بھاری آواز میں جواب دیا۔ دوپٹا کمر سے باندھا۔ دبلی پتلی سی ماہرہ جس کی پشت پر بالوں کی لمبی سی چوٹی جھول رہی تھی۔ اس پر ایک نگاہ ڈال کر وہ نیم کے پیڑ تلے بچھی چارپائی پر جا بیٹھیں۔ ان کے ہاتھ میں کنگھی تھی، دوپٹا اتار کر نیچے رکھا اور بال کھول لیے۔ ماہرہ کے بال ماں پر تھے، لمبے، گھنے اور گھنگریالے، بس ماں کے بال شہد رنگ تھے جبکہ اس کے بالوں کا رنگ کالا تھا۔

''اماں عصر کا وقت ہے، کچھ دیر میں مغرب ہو جائے گی۔ ابھی کیوں بال کھول لیے؟ دادی نے دیکھا تو پھر باتیں سنائیں گی۔'' ماہرہ کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔

''ابھی مغرب میں بہت وقت پڑا ہے، جلدی سے گھر سمیٹو اور اس نحمش کو کمرے سے باہر نکالو۔ پوری دوپہر گزر گئی ہے مگر مجال ہے جو ٹی وی سے نظریں ہٹائی ہوں۔ برتن بھی ویسے ہی پڑے ہیں۔ اسے بولو تیل کی شیشی لے کر آئے اور پھر آکر کام کرے۔'' انہوں نے چوٹی کے بل کھولتے ہوئے کہا۔

''اور یہ منحوس نوید صبح سے غائب ہے۔ بس دوپہر کو آیا کھانا ٹھونسا اور دوبارہ شکل غائب کر دی۔ آج گھر تو آئے اس کی خبر لیتی ہوں۔'' ان کے لہجے میں غصہ تھا۔

''جب دوپہر کو گھر آیا تھا تو اسے واپس باہر کیوں نکلنے دیا، دو چار لگا کر اندر کمرے میں اپنے پاس بٹھا تیں۔'' وہ برآمدے میں جا بجا بکھرے کھلونا برتن اٹھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ ماں کو مفت مشوروں سے بھی نواز رہی تھی۔

''لو جی اس کی نرالی باتیں سنو۔ وہ کوئی چھ سات سال کا بچہ ہے جسے دو لگا کر اندر بٹھا دوں اور وہ بیٹھ بھی جائے۔ جوان جہان ہے، اس عمر کی اولاد کو قابو کرنا، قابو میں رکھنا بہت مشکل ہے۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کروں تو کیا کروں؟'' وہ بے حد پریشان رہتی تھیں۔

اس سے پہلے کہ ماہرہ کوئی جلا کٹا جواب دیتی، چھوٹے دروازے سے ان کی کرائے دار خاتون داخل ہوئیں۔

''السلام علیکم۔'' انہوں نے وہیں سے سلام کیا۔

ماجدہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھیں اور کھڑی ہو گئیں، گھر آنے والے مہمانوں کی وہ بے تحاشا عزت کرتی تھیں۔

''وعلیکم السلام! آئیں اندر آجائیں۔'' آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا اور چارپائی کے پاس آگئیں۔ بجلی جا چکی تھی۔ نادرہ بھی بجلی جاتے ہی

ناولٹ



کمرے سے نکل آئی۔ ماجدہ نے فوراً ہی بال سمیٹ کر دوپٹے سے سر ڈھانپا۔ دونوں بہنوں نے انہیں سلام کیا۔ نادرہ ان کے لیے پانی لے آئی اور پھر دونوں ہی تیزی سے اپنا کام نمٹانے لگیں۔ ماہرہ نے جھاڑو دے کر غسل خانے کا رخ کیا۔ رگڑ رگڑ کر ہاتھ، منہ، پاؤں دھوئے۔ کچے برآمدے کی وجہ سے اس کے ہاتھ جھٹ پٹ میلے ہو جاتے تھے۔ وہ دن میں چھ چھ بار ان کو دھوتی۔ مگر پھر بھی مطمئن نہ ہوتی۔

ان نئی کرائے دار کا نام ریحانہ تھا۔ وہ ماجدہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ماہرہ باورچی خانے میں آگئی اور چائے بنانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دادی بھی باہر کی سیر سے واپس آگئیں اور وہیں ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ سب کو چائے پیش کر کے وہ اپنا کپ ــــ لے کر کمرے میں آگئی۔ اسے ماں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"یہ میری بیٹی ماہرہ ہے، ایم اے کر چکی ہے۔ ایک اسکول میں پڑھاتی ہے۔" ماجدہ نے تعارف کروایا۔

"ماشاء اللہ۔ آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔" اپنی براہ راست تعریف سن کر ماہرہ سرخ ہوگئی۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے آوازیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں، سو وہ ہر بات آسانی سے سن رہی تھی۔ ماہرہ اچھی خاصی منہ پھٹ اور بدتمیزی تھی مگر تھی تو مشرقی، شرمانے والی بات پر سرخ انار بن جاتی۔ دیکھنے والا مسحور ہو کر رہ جاتا۔

عصر اب مغرب میں ڈھلنے والی تھی۔ اس کے ابا حضور کی آمد ہونے والی تھی۔ ریحانہ کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی ماجدہ بھی اٹھیں۔ زلفیں سنوارنے کا وقت ہی ختم ہو گیا تھا۔ ــــ کنگھی کمرے میں رکھ کر وہ باہر آگئیں، تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھلا اور نوید اندر داخل ہوا۔

الجھے بے ترتیب بال، کھلا ہوا گریبان، عجیب بے ہودہ انداز تھے اس کے۔ ماجدہ اسے دیکھتے ہی کھول کر رہ جاتیں۔ ابھی بھی انہیں ایک دم ہی غصہ آگیا۔

"کہاں تھا تو؟" انہوں نے غصے سے پوچھا۔

"یہیں تھا دوستوں کے ساتھ۔" کسی چور کی طرح یہاں وہاں آنکھیں گھماتے ہوئے اس نے گلا پھاڑ کر جواب دیا۔

"آہستہ آواز میں بکواس کیا کر۔ اتنا گلا پھاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لفنگا گیری کے بعد گھر آ کر دماغ خراب کرتا ہے۔ آنے دے باپ کو، ایسی پٹائی کرواؤں گی نا یاد رکھے گا۔ جا، جا کر منہ دھولے، ہاتھ پاؤں دیکھ مٹی سے اٹے پڑے ہیں۔ ایسی حالت تو تیرے باپ کی بھی نہیں ہوتی جو بارہ بارہ گھنٹے مزدوری کر کے آتا ہے۔" وہ اسے جھاڑتے ہوئے باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔ جب کہ نوید اسی حالت میں جا کر بستر پر گر گیا۔ سفید چادر پر دھبے پڑ گئے۔ پھر ماہرہ نے ایسا شور مچایا کہ ماجدہ کو اٹھ کر اندر آنا پڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایکشن لیتیں نوید باہر بھاگ گیا، مگر ماہرہ کو اب کون خاموش کرواتا، اتنا وقت لگا کر وہ کمرے اور گھر کو صاف کرتی تھی، نوید جوتوں سمیت کمرے میں گھس کر فرش گندا کر دیتا، ماہرہ کی برداشت ختم ہو جاتی پھر اس کی چیخیں، ہنگامہ، اب بھی یہی ہوا۔ وہ کان لپیٹ کر کام کرنے لگیں۔ یہ روز روز کا تماشا ان کا بی پی ہائی کرنے کا باعث بنتا تھا، مگر کسی کو فکر نہیں تھی۔ ان کے اندر ویرانی سی اتر آئی۔

☆☆☆

ابا کو اس مہینے کی تنخواہ ملی تو ماہرہ کی خواہش تھی کہ سورۂ یٰسین کا ختم کروائیں اور صدقہ بھی دیں۔ تو ماجدہ اگلے ہی دن محلے کی چند خواتین کو سورۂ یٰسین پڑھنے کی دعوت دے چکی تھیں جن میں ریحانہ بھی شامل تھیں۔ ماہرہ اسکول سے جلدی آ کر ایک بار پھر سارا گھر صاف کر کے سفید چاندنی بچھا کر پرسکون تھی۔ آج نوید بھی گھر پر موجود تھا مگر صاف ستھرے حلیے میں اور شرافت سے برآمدے میں ہی بیٹھا تھا۔ وجہ یہ بھی کہ اسے وہاں سکون سے بٹھانے کے لیے اس نے اپنا ٹچ موبائل اس کے حوالے کیا تھا، جس میں گیمز اور گانے بھرے ہونے کی وجہ سے وہ

اس میں مصروف تھا۔ تین بجتے ہی عورتوں کی آمد شروع ہوگئی۔ ماجدہ نے نوید کو پیسے دے کر علاقے کی سب سے اچھی بیکری میں بھیجا۔ تاکہ تازہ اور اچھا سامان ملے۔ سورۂ یٰسین پڑھی جا چکی۔ تین سے پانچ بج گئے۔ مگر نوید کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔

ماہرہ جلے پیر کی بلی کی طرح یہاں سے وہاں چکرا رہی تھی۔ آنکھیں دروازے سے چپکی تھیں، جب بھی دروازہ کھول کر باہر جھانکتی، مگر مایوسی ہی ہوتی۔

چولہے پر رکھی چائے پک پک کر کالی ہو چکی تھی۔ کمرے میں موجود خواتین پہلو بدل کر اب باتوں میں مگن تھیں۔ باورچی خانے میں بیٹھی ماجدہ سرخ آنکھیں لیے چولہے کو گھور رہی تھیں۔ ان کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ کیا نہ کر ڈالیں۔ مگر ضبط پر مجبور تھیں۔

"ایک بار یہ لڑکا آ جائے واپس تو اماں بعد میں کچھ کہیں گی پہلے میں اس کی جان نکالوں گی۔" غصے سے ماہرہ کی حالت غیر تھی۔ تین بار تو دادی آ کر پوچھ چکی تھیں۔ وہ خود پریشان تھیں مگر ان کا پوچھنا ماہرہ کو تپا دیتا تھا۔ مزید آدھا گھنٹہ گزر جانے کے بعد شہزادہ نوید کی آمد ہوئی۔ ہاتھ میں پکڑا بڑا سا شاپر، کھلا ہوا گریبان جس میں سے سفید بنیان دکھائی دے رہی تھی۔ خراماں خراماں چلتا نوید بڑے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ اس کی لہراتی چال دیکھ کر ماہرہ کا فشار خون اس قدر بلند ہوا کہ پاؤں میں پہنی چپل اتار کر اس نے وہیں سے تاک کر ایسا نشانہ لگایا جو سیدھا نوید کے چہرے پر لگا۔

"بے غیرت انسان، ڈھائی گھنٹوں سے تمہارے انتظار میں سوکھ رہے ہیں ہم۔ کب سے مہمان آئے بیٹھے ہیں اور تم یہ دلہنوں والی چال چل کر اب آ رہے ہو؟ کہاں رہ گئے تھے؟ اپنے کس رشتہ دار کے ساتھ گھوم رہے تھے؟" وہ وہیں دروازے کے پاس آ کر غرائی اور نوید کا گریبان پکڑا، وہ ماہرہ سے چار سال چھوٹا تھا مگر قد میں اس سے اونچا۔ سدا کا بدتمیز۔ اس نے بالکل لحاظ نہیں کرنا تھا مگر اسی وقت ماجدہ آ گئیں اور رکھ کے ایک تھپڑ نوید کو لگایا۔

"کیا مسئلہ ہے تم دونوں کو؟" وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں اس کی آواز میں بھاری پن پیدا ہو رہا تھا اور مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اپنی بھاری بدلی عجیب آواز میں وہ جتنی بلند آواز میں دھاڑ سکتا تھا، دھاڑا اور شاپر زمین پر پھینکا۔

"منہ بند رکھو اور دفع ہو یہاں سے، تجھے تو میں آج زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ بس مہمانوں کو جانے دے۔" ماجدہ نے اسے خوں خوار نگاہوں سے دیکھا اور زمین پر گرا شاپر اٹھایا جس میں خون پسینے کی کمائی سے خریدی گئی کھانے کی اشیاء موجود تھیں۔ ماجدہ کی دھمکی کارگر ثابت ہوا کرتی تھی۔ ماں کا اچھا خاصا رعب تھا اس پر، ماہرہ پر غصیلی نگاہ ڈالتا وہ وہیں اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ اس وقت اگر اس نے منہ سے آواز نکالی تو وہ بنا لحاظ کیے اس کی دھلائی شروع کر دیں گی۔

"چل اب اندر، پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے ماہرہ کو ٹہوکا دیا اور آگے بڑھ گئیں۔ ماہرہ کا غصہ اس کے آ جانے کے بعد کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ماں کے پیچھے چلتے ہوئے بھی اس نے رخ اس کی جانب کر کے لعنت دی۔ ماہرہ کی یہ حرکت ہمیشہ ہی اسے آگ لگا دیا کرتی تھی۔ وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

ماجدہ کپوں میں چائے انڈیل رہی تھیں جب ان کی سماعتوں نے ماہرہ کی درد بھری آواز سنی۔ وہ گھبرا کر پلٹیں۔

"اماں۔ یہ کیا؟ سارے رول اور سموسوں کا چورا ہو چکا ہے اور یہ مٹھائی۔ وہ بھی ملیدہ بن گئی ہے۔" اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا تھا۔ اور آواز میں شدید دکھ۔

"مہمانوں کو کیا کھلائیں گے؟" وہ رونا قابو کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ماجدہ کے چہرے کا رنگ بالکل ہی اڑ گیا۔

"یہ اولاد نہیں میرے ناکردہ گناہوں کی سزا ہے۔" سر پر افسوس سے ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے دکھ سے کہا۔

"اماں اب کیا کروں؟" اس نے شاپر قریب

رکھی ٹرے میں الٹ دیا۔ نوید پورے ڈھائی گھنٹے بعد واپس آیا تھا اور واپس آنے کے بعد لوازمات کو اس بوسیدہ حالت میں پہنچا کر گیا۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ نیا سامان وہ منگوا نہیں سکتی تھیں کہ محلے کے کسی اور لڑکے کو بھی وہ پکڑ کر بھیجتیں تو گھنٹہ تو ضرور ہی لگا کر آتا۔ اور اب تو خواتین بے زار ہو کر اٹھنے کو پر تول رہی تھیں۔ سات ساڑھے سات تک انہیں رات کا کھانا بھی بنانا تھا۔ ماجدہ نے خود ہی قریبی دکان کی طرف دوڑ لگائی۔ بسکٹ، نمکو لے آئیں۔ اور اسی چورے میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر قابل شناخت حالت میں موجود رول، سموسوں اور مٹھائی کو پلیٹوں میں سجایا۔

نوید آج تو تو میرے ہاتھوں سے نہیں بچے گا۔

دونوں ماں بیٹی اس وقت ایک ہی بات سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

مدثر کچھ دیر پہلے ہی گھر لوٹا تھا۔ صبح کا گیا اب واپس آیا۔ پسینے میں شرابور، شرٹ بھی میلی ہو چکی تھی۔ ریحانہ اس کے لیے پانی لے آئیں۔

"کتنی بار کہہ چکی ہوں اتنی جان نہ مارا کرو۔ دیکھو کتنے کمزور ہوتے جا رہے ہو۔" ریحانہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔ وہ مسکرایا۔

"جان تو نہیں ماری۔ محنت کرنے لگا ہوں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔" اس کی بات سن کر ریحانہ اداس ہو گئیں۔

"پسینہ سوکھ جائے تو نہا لو۔ میں کھانا گرم کرتی ہوں۔" وہ ہدایت دے کر اٹھ گئیں۔ مدثر قمیص اتار کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔ ابھی وہ نہا رہا تھا کہ مالک مکان کے گھر سے چیخوں اور گالیوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ وہ جلدی سے نہا کر باہر آیا۔

"اماں۔ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟ کون چیخ رہا ہے؟" وہ گیلے جسم پر ہی قمیص پہننے لگا۔

"ماجدہ اپنے بیٹے کو مار رہی ہوگی۔" ان کے لہجے میں افسوس تھا۔

"شور سے تو یہ لگ رہا ہے کہ وہ مار نہیں رہیں بلکہ تشدد کر رہی ہیں۔" وہ پریشان ہو گیا۔ ریحانہ بھی تشویش میں تھیں کہ جائیں کہ نہیں۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھیں اور چار قدموں کے فاصلے پر موجود ماجدہ کے گھر آ گئیں۔

"تو ناسور ہے ناسور۔ میری جان کا عذاب۔ پتا نہیں کون سے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ایسی اولاد میرے نصیب میں لکھی گئی۔" نوید برآمدے میں زمین پر بیٹھا چہرہ گھٹنوں میں چھپائے رو رہا تھا۔ جب کہ وہ بھی چارپائی پر بیٹھی ہاتھ سے ماتھا پیٹتے ہوئے اپنی قسمت کو کوس رہی تھیں۔ ریحانہ پریشان سی وہیں کھڑی ہو گئیں۔ ماجدہ کی نظر ان پر پڑی تو وہ اٹھیں۔ جلدی سے آنسو صاف کیے۔

"آئیے۔" انہیں لے کر وہ کمرے میں آ گئیں۔

"میں شور سن کر گھبرا گئی تھی۔ اس لیے سوچا کہ پوچھ آؤں۔" انہیں خواہ مخواہ ہی پشیمانی ہو رہی تھی۔

"آپ ابھی یہاں نئی آئی ہیں۔ اسی لیے پریشان ہو گئی ہیں۔ جب روز ایسی چیخ و پکار کی آوازیں آپ کے کانوں میں پڑیں گی تو آپ بھی عادی ہو جائیں گی۔" بظاہر وہ مسکرا کر بولی تھیں مگر ریحانہ ان کا دکھ بھانپ گئیں۔

"آپ نے نوید کو اتنا اور اس قدر کیوں مارا؟ جوان ہوتا بچہ ہے۔ کچھ تو احتیاط کیجیے۔" وہ آہستگی سے بولیں۔

"نہ ماروں تو کیا کروں؟ اس لڑکے نے مجھے دنیا بھر میں ذلیل کروا رکھا ہے۔ کوئی ایک بھی دن ایسا نہیں جسے میں کہہ سکوں کہ میں نے یہ دن سکون سے گزارا۔" وہ سر پہ ہاتھ رکھے بول رہی تھیں۔ پھر آج کا قصہ سنایا۔ وہ خود وہاں موجود تھیں۔ عورتوں کی باتیں ان کے کانوں میں بھی پڑی تھیں۔ ماہرہ کی شکن آلود پیشانی کو انہوں نے بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ ماجدہ کو کیا تسلی دیں۔ تھوڑا بہت سمجھا بجھا کر وہ گھر واپس آ گئیں۔ مدثر ان کا ہی منتظر تھا۔

"کیا ہوا تھا؟" اس نے ان کو دیکھتے ہی سوال کیا۔ ریحانہ نے تفصیل بتائی۔

"مارنے سے تو مسئلہ بگڑ جاتا ہے۔" مدثر نے خیال ظاہر کیا۔

"میں بھی ان سے یہی کہہ کر آئی ہوں کہ روز روز کی مار دھاڑ بچے کو خراب کر دیتی ہے۔ پر وہ کہتی ہیں کہ نوید کو ہر طریقے سے سمجھا چکی ہیں۔ ماں، باپ، دادی، بڑی بہن کسی کا لحاظ نہیں اسے وہ کوئی سیدھی بات بھی کریں تب بھی تڑخ کر جواب دیتا ہے۔ بہت پریشان ہیں وہ۔" ان کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"کتنے سال کا ہے؟" اس نے لیٹتے ہوئے پوچھا۔

"سترہویں سال میں ہے۔ دینی تعلیم بھی مکمل نہیں کی۔ پہلے پارے سے آگے بڑھ نہیں پایا۔ کچھ اسکول تبدیل کروائے کہ شاید کچھ پڑھ لے۔ ایک دو جماعتیں پاس کر لے اردو ہی سہی کچھ تو آئے لیکن اسے ایک لفظ نہیں آتا۔ ہر سال دل لگا کر فیل ہوتا رہا ہے۔ خاندان والوں سے لے کر پورا سسرال سب ہی ماجدہ کو قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ ارے بھئی ماں بھی اپنے بچے کا مستقبل تاریک کرنے کا سوچ سکتی ہے؟ ابھی چالیس کی بھی نہیں ہوئی اور حال دیکھو۔ اس اولاد نے اس کا کیا حال کر دیا ہے۔ اوپر سے اس کا شوہر توبہ توبہ۔ آج یہ ساتھ والی بتا رہی تھیں کہ بات بے بات جھگڑتا ہے۔ مہینے دو مہینے بعد اسے پیٹتا بھی ہے۔ اف کیسی دنیا ہے۔" وہ بات ختم کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مدثر چپ رہا۔ اسے اپنے مالک مکان سے شدید ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ پر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔

☆☆☆

وہ گہری نیند میں تھی جب الارم کی چنگھاڑتی آواز پر ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ سرہانے رکھا الارم بند کیا اور ایک سیکنڈ میں ہی بستر چھوڑا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے۔ تکیے کے ایک طرف پڑا دوپٹا اٹھا کر حسب عادت گلے میں ڈالا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ اس کمرے میں اس کی، نادرہ، نوید اور دادی کی رہائش تھی۔ الارم کی آواز نے کمرے میں موجود کسی ایک بھی ذی روح پر اثر نہ کیا تھا، مجال ہے کسی نے کروٹ بھی لی ہو۔

اس نے ماں کو جگایا، ساڑھے چھ بجے قیوم کو گھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ اس آدھے گھنٹے کے دورانیے میں ماجدہ ناشتا بناتیں۔ رات کے کھانے میں سے بچا کر رکھے گئے حصے کو اچھی طرح گرم کر کے روٹیاں بنا کر ٹفن تیار کرتیں۔ جبکہ ماہرہ کمرہ صاف کر کے موٹر چلاتی۔ پھر وسیع و عریض برآمدے کو صاف کرتی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھی۔ آج بھی اس نے یہی کیا۔ صبح سویرے ہی اس گھر کا وہ چھوٹا دروازہ کھول دیا جاتا تھا جہاں سے پورے محلے کی رسائی اس گھر تک ہوتی۔ یہ دروازہ رات دیر تک کھلا رہتا۔ محلے کی عورتیں کسی بھی وقت ٹپک جاتیں اور ماہرہ اپنے باپ کی ہی طرح ان کی بے وقت آمد سے چڑتی تھی۔

واحد ریحانہ تھیں جو وقت اور موقع دیکھ کر آیا کرتیں۔ مخصوص وقت کے لیے آتیں اور چلی جاتیں جبکہ کچھ تو ایسی تھیں کہ گھنٹوں بیٹھ کر وقت برباد کرتیں۔ ان بن بلائے مہمانوں کی وجہ سے گھر کے معمول میں خلل پڑتا تھا اور اکثر اسی وجہ سے قیوم اور ماجدہ کا جھگڑا ہوتا۔

قیوم کام کے لیے گھر سے نکل چکے تھے۔ باپ کو خدا حافظ کہہ کر وہ دروازے پر آئی تو اس چند فٹ کی گلی میں ٹھیک ٹھاک کچرا پڑا تھا۔

"یہ کیا؟ میں نے کل ہی تو گلی صاف کی تھی۔ راشدہ خالہ کے بچے بھی ناں۔" اس نے غصے سے دیکھا۔ اس چھوٹی سی گلی کا فائدہ یہ تھا کہ کرائے پر چڑھے مکانوں کا دروازہ بھی اسی گلی میں کھلتا تھا، سو ماجدہ کرائے داروں پر با آسانی نظر بھی رکھ سکتی تھیں۔ کہ کہیں برے یا خراب لوگ نہ آ گئیں اور محلہ خراب ہو اور ان کے گھر کا چھوٹا دروازہ بھی اسی سمت میں تھا۔

ماہرہ دل ہی دل میں بچوں کو کوستی جھاڑو اٹھا کر لائی کہ گلی کی بھی صفائی کر دے۔ وہ بڑبڑاتی جاتی اور

جھاڑو لگائی جاتی اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ بڑبڑانے کی عادت اسے باپ سے ملی تھی۔ اسے نہیں علم تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے اور دیکھتے رہنے پر خود کو مجبور پا رہا ہے۔ پھر اسے ویسٹ کرشاپر میں ڈالا اور تھیلا اٹھا کر اندر لے آئی۔ ایک کونے میں کوڑے دان موجود تھا۔

''اف۔ یہ نوید تو پھر اچھالنے کے لائق بھی نہیں رہا۔ اماں...... اماں میں کہہ کر گئی تھی ناں کہ نوید سے کہہ کر کوڑا دان خالی کروالینا۔ کچرے سے ابل رہا ہے۔ اس لڑکے سے اتنا سا کام بھی نہیں کیا جاتا۔'' اس نے غصے سے ڈبے کو لات ماری۔ ماہرہ کی تیز آواز گھر سے باہر بھی جا رہی تھی۔ اور ''کسی'' کے کانوں میں پہنچ رہی تھی۔

''ہائے کیا سریلی آواز ہے۔ واہ...... سن کر ہی مزا آگیا۔'' ماہرہ کی آواز سن کر کوئی سر دھن رہا تھا اور وہ بے خبر تھی۔

گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر نہائی۔ پھر باورچی خانے میں جھانکا جہاں گرما گرم پراٹھے پک رہے تھے۔

''جا...... جا کر نوید کو اور نادرہ کو جگا۔ ساتھ ہی دادی کو ناشتا بھی دے آ۔'' انہوں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ ناشتے کی ٹرے اٹھائی اور کمرے میں آگئی جہاں دادی اماں سکون سے بیٹھی تھیں۔

''دادی ناشتا۔'' ان کے سامنے ناشتا رکھ کر اس نے اپنے نارگٹس کو دیکھا۔ نادرہ اور نوید دونوں ہی گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔

''ناشتا بن گیا ہے اٹھ جاؤ۔'' اس نے باری باری دونوں کو ہلایا، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ نادرہ کے پاس آئی، اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ وہ بری طرح ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی ہونق شکل دیکھ کر ماہرہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''کیا ہوا ہے؟'' یہ جملہ اس گھر کے مکینوں کا پسندیدہ جملہ تھا۔

''صبح ہو چکی ہے۔ اسکول کالج جانے کے اوقات شروع ہو گئے ہیں۔ بستر چھوڑو اور ہاتھ منہ دھو کر فوراً کچن میں جاؤ۔'' اسے ہدایات دے کر وہ نوید کے پاس آئی اور اس کے ساتھ بھی یہی حرکت کی مگر اس کا ناتواں وجود ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس نے کروٹ لی اور پھر سے سو گیا۔ نوید کو چھوڑ کر وہ کمرے میں آئی، ناشتا کیا، تیار ہوئی اور اسکارف لپیٹ کر بلند آواز سے خدا حافظ کہتی تیر کی تیزی سے گھر سے نکلی۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی وہ کسی سے ٹکرا گئی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ایک اجنبی آنکھیں پھاڑے منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ اسکارف میں لپٹا چمکتا گندمی چہرہ، وہ مبہوت سا رہ گیا۔

''دیکھ کر چلنا نہیں سیکھا کیا؟'' وہ غصے سے دھاڑی۔ ماہرہ کو اس کے ٹکرانے سے زیادہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے پر غصہ آرہا تھا۔

''بدتمیز، جاہل، گدھا۔'' یہ وہ گالیاں تھیں جو اس کے کانوں نے سنی۔ سارا راستہ وہ بڑبڑاتی اور اسے کوستی رہی تھی، وہ ایسی ہی تھی، بالکل اپنے باپ جیسی۔ بس ابھی اس بات کا احساس صرف اس کی ماں کو ہی ہوا تھا۔

☆☆☆

''صابر کا فون آیا تھا۔'' مدثر ابھی کھانا کھا کر پلیٹ کھسکا کر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا ہی تھا کہ ریحانہ نے اسے اطلاع دی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سخت ہو گئے۔

''کیوں؟'' بے لچک سی کیوں۔ انہوں نے گہری سانس بھری۔

''اب اس کیوں کا علم تو اسے ہی ہوگا۔ میری خیریت پوچھ رہا تھا۔ پھر تمہارے بارے میں تفصیلات پوچھنے لگا۔''

''آپ نے کیا کہا؟'' وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

''میں نے کیا کہا ہوگا؟'' انہوں نے الٹا اس سے ہی سوال پوچھ لیا۔ وہ مسکرایا۔

''وہ میرے بارے میں آپ سے کوئی بھی سوال کرے تو بس اتنا کہہ دیجئے گا کہ مدثر ان کا کچھ

نہیں لگتا اور وہ غیر متعلقہ لوگوں کے بارے میں آپ سے تفصیلات نہ ہی مانگیں تو بہتر۔'' وہ غصے سے بولا۔

''میں ہر کسی لحاظ کے سبب کہہ چکی ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔'' انہوں نے اسے تسلی دی۔

''بات پریشانی کی نہیں۔ آپ ہر بات سے واقف ہیں امی۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ اب ان دو لوگوں کا سایہ بھی ہماری زندگی پر نہ پڑے۔ نفرت ہے مجھے ان سے۔'' ریحانہ کے چہرے پر دکھ پھیل گیا۔

''میں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ ہم وہ شہر چھوڑ چکے ہیں۔ اس نے بہت کریدنے کی کوشش کی، پتا مانگتا رہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔'' ریحانہ نے مزید تفصیلات بتائیں۔

''اب جب ضرورت پڑ رہی ہے تو روز فون کریں گے ملنے کے لیے پر بھی تولیں گے۔'' مدثر کی بات نے انہیں چونکا دیا۔

''کیا مطلب؟ کیسی ضرورت؟''

''وہ آپ کو خود بتا دیں گے ذرا صبر کر لیں۔ اچھا ایک بات تو بتائیں۔ ماجدہ خالہ کی کوئی بیٹی بھی ہے؟'' روشن چمکیلا سا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔

''ہاں ان کی دو بیٹیاں ہیں۔ کیوں کیا ہوا؟'' وہ الرٹ سی ہو گئیں۔

''کیا ہوگا امی؟ بس صبح جب جا گا تو ان کے گھر سے کسی لڑکی کے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہی نوید کو کوسنے میں مصروف تھی۔ اس لیے پوچھا۔'' اس نے سرسری سا انداز اپنایا۔

''ہاں۔ ماہرہ ہوگی۔ بڑی ہے نوید سے۔'' انہوں نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

''اچھا نام ہے، ماہرہ۔'' اس نے زیر لب نام دہرا کر خود سے کہا۔

☆☆☆

آج اتوار کا دن تھا۔ اس کی صبح معمول سے ایک گھنٹہ تاخیر سے ہوئی۔ قیوم کام پر جا چکے تھے۔ ماجدہ معمول کے کاموں میں مصروف تھیں۔ پورے ہفتے میں اتوار وہ واحد دن تھا جب گھر کا کام عام

دنوں کے مقابلے زیادہ ہونے کے باوجود وہ خود کو پرسکون محسوس کرتی تھی۔ آرام سے ناشتا کرتی مگر اس سے پہلے ہی مشین لگا لیتی۔ گھر کے کام نمٹا کر دونوں ماں بیٹی مل کر کپڑے دھوتیں۔

اس کی زندگی ایک بنے بنائے چارٹ کے مطابق چل رہی تھی۔ کوئی ہل چل نہیں تھی۔ اپنے ابا کے غیر متوازن رویے اور نوید کی حرکتوں کو وہ زندگی کا سکون درہم برہم کرنے والی ہواؤں سے منسلک کرتی تھی۔ اسے ہر وقت کھٹکا لگا رہتا کہ اب گھر میں ڈرامہ ہوگا تو تب ہوگا۔ لیکن وہ خود یہ بھول جاتی تھی کہ اس کا اپنا رویہ کس قدر غیر متوازن ہے۔ وہ ماں کی بھی صرف تب سنتی تھی جب وہ سننا چاہتی۔

اس گھر میں سب سے زیادہ دباؤ کا شکار عورت صرف ماجدہ ہی تھی۔ ماجدہ کوئی فرشتہ نہیں تھیں، بشری کمزوریاں ان میں بھی موجود تھیں۔ ایکشن کا ری ایکشن وہ بھی دیتیں اور بھرپور دیتیں مگر بے حس نہیں تھیں۔ رشتوں کا احترام، ان کا تقدس ان کے اندر موجود تھا، جبکہ ان کی اولاد اس معاملے میں کافی حد تک بے حس واقع ہوئی تھی، ماسوا نادرہ کے، ابھی اس کی عمر بھی کم تھی لیکن انہیں اس سے امید تھی کہ وہ ان دونوں سے بہتر ہی ہوگی۔

صبح کے گیارہ بج رہے تھے اور وہ کپڑے دھو کر انہیں رسیوں پر پھیلا کر فرش پر بچھے گدے پر لیٹی ٹی وی پر چلنے والے انڈین گانوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ موبائل بجا۔ فون اس کے ننھیال سے تھا، ماجدہ کے فون اٹھاتے ہی اس نے آواز ہلکی کر دی۔ اس کی ساری توجہ چارپائی پر بیٹھی ماجدہ پر تھی۔ ان کے چہرے پر پریشانی تھی۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی بند کیا اور ان کے پاس آئی۔

''اماں کیا ہوا؟ خیر ہے؟'' اس سے صبر نہ ہوا تو اس نے پوچھ لیا، ابھی وہ فون پر ہی مصروف تھیں، اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا کہا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے فون رکھ دیا۔

''زوہا ریہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔'' انہوں

نے افسردگی سے بتایا۔

"خیریت کیا ہوا؟ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو مل کر آئے ہیں اچھی بھلی تھیں خالہ۔" وہ حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ ماہرہ اپنے ننھیال سے بہت قریب تھی۔ خصوصاً اپنی خالاؤں سے اس کی بہت دوستی تھی۔

"ہونا کیا ہے۔ وہی الٹیاں، بخار۔ بھابھی کہہ رہی تھیں کہ سوکھ کر کانٹا ہو چکی ہے۔ دو دن سے الٹیاں رکنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔" ان کے لہجے میں فکر گھلی تھی۔

"اب؟" اس کے لہجے میں سوال تھا۔

"اب یہ کہ میں جا کر ذرا خیر خیریت پوچھ لوں۔ کچھ دیر میں نکلتی ہوں میں۔ رات کا سالن موجود ہے، اسے گرم کر لینا اور نوید سے کہہ کر ہوٹل سے روٹیاں منگوا لینا۔" وہ فون چارج پر لگاتے ہوئے بولیں۔ "میں بس نکلتی ہوں اب صبر نہیں ہو رہا۔" انہوں نے منہ دھونے کی بھی زحمت نہیں کی۔

"نوید روٹیاں لا کر دے گا؟" ماہرہ کے تیور اک دم بدل گئے تھے، اس کا یہ انداز انہیں بہت ناگوار گزرتا تھا۔ مگر کیا کرتیں وہ اس گھر میں شاید برداشت کرنے کے لیے ہی لائی گئی تھیں۔ مگر بھی کبھی غصہ چھلک جاتا جس کے جواب میں ماہرہ بی بی ناراض ہو کر بیٹھ جاتیں۔

"بات تو تم ایسے کر رہی ہو جیسے آج تک اس نے کوئی کام کیا ہی نہیں، ہر وقت پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑی رہتی ہو۔ کبھی پیار اور تمیز سے بھی بات کر لیا کرو اس سے۔" وہ جذباتی ہو گئیں۔

"بہت کیا ہے لاڈ۔ نخرے بھی بہت اٹھائے ہیں۔ اب بھی میں ہی اس کے سارے کام کر کے دیتی ہوں اور کیا سر پر بٹھا کر رکھوں؟ پچھلی بار کی جانے والی حرکت آپ بھولی ہوں گی میں نہیں۔" وہ بھی ایک دم غصے میں آ گئی۔ چلا کر بولی۔

"تو یہ سب کر کے احسان مت کرو، میرے کہنے پر نہیں اپنی مرضی سے کرتی ہو سب۔ بھائی ہے وہ تمہارا،

کوئی غیر نہیں ہے۔" انہوں نے صاف گوئی سے حقیقت بھی بتائی تھی، وہ اپنی مرضی سے ہی اچھائی بھی تھی اور برائی بھی۔ ایسے پھر وہ لیے بھی تنی رہتی تھی مگر اس وقت انہوں نے یہ بات کیوں چھیڑی؟

"اس وقت اس تقریر کا مقصد پوچھ سکتی ہوں میں؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ماہرہ نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"اگر دوبارہ بیٹے تک گھر نہ آیا تو بتا دے گی اور گالیاں دیے روٹیاں بنانا۔ میں شام تک آ جاؤں گی۔" انہوں نے ماہرہ کے سامنے بم پھوڑا۔ منہ دھونے کے بعد وہ اتنا تھک گئی تھی کہ بل کر پانی بھی اسے مصیبت لگ رہا تھا۔ اس آرڈر پر وہ تلملا گئی۔ وہ گھر کے کام کرتی تھی لیکن جب زائد کرنا پڑتا تو وہ سخت چڑتی اور شور مچاتی۔ ماجدہ تو اپنی کہہ کر باہر نکل گئیں۔ وہ غصے سے بلبلاتی رہ گئی۔

جس اسکول میں وہ پڑھاتی تھی وہاں ٹیسٹ چل رہے تھے، ان کی وجہ سے اچھا خاصا کام بڑھ جاتا۔ باقاعدہ ہر بچے کی رپورٹ تیار کرنا پڑتی۔ اسکول ریکارڈ کے لیے الگ محنت، کام اٹھا کر گھر لانا پڑتا۔ اس وجہ سے گھر کی روٹین بھی ڈسٹرب ہو جاتی تو اسے شدید غصہ آتا۔ غیر سے غصے میں آنا ان کا خاندانی وصف تھا۔ ماہرہ کی شخصیت میں شدت پسندی کا بڑا ہاتھ اس کے گھر کا ماحول تھا کچھ اپنا مزاج بھی تیکھا تھا۔ وہ بدلحاظ اور بدتمیزی کرتے اس بات کا بالکل بھی ادراک نہ تھا۔ ضدی اور بھی کی خود غرض۔

اس کی ماں ایک حسین عورت تھی۔ اور حسن پر ناز بھی تھا۔ خواب و خیال میں رہنے والی ایک نازک دوشیزہ مزاج مگر شادی قیوم سے ہو گئی۔ سخت کام کرنے والے، سخت جان اور سخت مزاج۔ ان سے نرمی کی توقع رکھنا فضول تھی، وہ ان پڑھ تھے، کوئل نرم جذبوں سے کوسوں دور۔ انہوں نے ماجدہ کا مزاج نہ سمجھا وہ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔ انہیں بس اس بات کا علم تھا کہ بیوی شوہر کے آرام کے لیے ہوتی ہے۔ اس سے آگے بھی شاید وہ سوچتے ہوں گے مگر ماجدہ

بھی محسوس نہیں کیا۔ ان کا خیالی بت پہلی رات ہی پاش پاش ہو گیا۔ قیوم ان سے پورے دس سال بڑے تھے، دونوں ایک دوسرے سے تھے۔ قیوم کی بدمزاجی سے ان کا گھر بنا وہ اپنی محبت بھری طبیعت سے ان کے مزاج کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتیں مگر قیوم سے نہیں۔

بچپن سے ہی وہ ہاتھ چھٹ تھے۔ قیوم کی ماں کی زبردستی کی حامی۔ بیٹا، بیٹی میں بھی فرق کرنے والی۔ ان کی نرم مزاجی نے اس کی منہ زوری کو ہوا دی اور ذرا ذرا سی بات پر بہنوں پر ہاتھ اٹھاتے۔ والد کے بعد بیوی میسر آ گئی۔ کبھی ماجدہ برداشت نہ کر پاتیں گھر چھوڑ کر چلی جاتیں، قیوم کوئی برے انسان نہیں تھے۔ حلال رزق کمایا۔ جتنی سخت محنت وہ کی اور کر رہے تھے، کم ہی لوگ کر پاتے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی فطری کمزوریوں پر بھی قابو پانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہر وقت غصے میں رہنے والی عادت نے بہت سے لوگوں کو ان سے دور کر دیا تھا۔ ان کی اپنی اولاد بھی ان کی عزت نہیں کرتی تھی۔

اس بے حد روایتی ماحول میں جہاں دادی پھپھوں میں بھید بھاؤ کرتیں۔ ساس بہو کے روایتی جھگڑے۔ باپ کی طرف سے فساد کا خوف البتہ ماجدہ نے پوری کوشش کی تھی کہ ان کی اولاد پرسکون رہے۔ بلکہ اضافی کوشش اور اضافی ڈھیل نے ان کو ان سے بھی کافی حد تک غافل کر دیا تھا۔ اس پر رشتہ داروں کے مشورے اور ہر بات کا الزام ماجدہ پر۔ ان سب عوامل اور اس کی فطرت نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ ماہرہ کو جب غصہ آتا وہ بھی ماں اور باپ کی طرح گالیاں دیتی۔ لیکن یہ صرف چھوٹے بہن بھائیوں تک ہی محدود تھا۔ باہر کم ہی کسی سے جھگڑتی تھی مگر اب کچھ عرصے سے وہ رشتہ داروں سے بھی الجھنے لگی تھی۔ ایک کی دس سناتی۔ وہ ایک پرسکون زندگی کی خواہش رکھتی تھی مگر اسے رتی بھر بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ اور ماں کی

عادتوں کا امتزاج بنتی جا رہی ہے بلکہ بن چکی ہے۔

جبکہ ماجدہ قیوم کے ہاتھ اٹھانے اور مغلظات بکنے والی عادت کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھیں مگر جب قیوم کا غصہ اترتا تو وہ اسے خوب طعنے مارتیں۔ وہ شرمندہ بھی ہوتے مگر فطرت بدلنے پر قادر نہیں تھے۔ وہ بھی انہیں بے عزت کر کے اپنا غصہ ہلکا کرنے کی کوشش کرتیں مگر نجانے کیا بات تھی کہ سب کچھ کر کے بھی انہیں سکون نہیں تھا۔ گھر کے کسی ایک فرد کو بھی نہیں۔

ماہرہ کا دل چاہتا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بھی ایسی ہی ہے۔ نوید کی حرکتوں اور زبان درازی پر وہ کڑھتی مگر خود غصے میں نوید سے بھی وہ ہاتھ آگے چلی جاتی۔ گھر کی بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے وہ ماں کے ہر کام میں ہاتھ بٹاتی تھی۔ پریشانی میں ماں سے بڑھ کر پریشان ہوتی مگر جب اس کا اپنا مزاج برہم ہوتا تب وہ کسی کی بھی نہیں تھی۔ اس کی شدت پسندی نے اس کی تمام خصوصیات کو گہنانا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

اس نے آٹا گوندھ کر رکھا۔ نوید غائب تھا۔ مارے باندھے روٹیاں پکا کر وہ باورچی خانے سے باہر آ کر لیٹ گئی۔ تھکاوٹ سے برا حال تھا۔ بجلی نہیں تھی مگر ٹھنڈی ہوائیں اسے لوری سنا رہی تھیں تھوڑی ہی دیر میں وہ سو گئی۔

"ماہرہ! اٹھو۔" اس کے کانوں میں اس کے نام کی پکار گونجی۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے دادی موجود تھیں۔

"جی دادی۔" اس نے آنکھوں کو انگلیوں کی پوروں سے رگڑا۔

"ابھی میں ریحانہ کے گھر سے آ رہی ہوں۔ بیمار ہے بے چاری۔ اس کا بیٹا ہوٹل سے کھانا لینے گیا تھا مگر ہوٹل بند، میں ان سے کہہ آئی کہ ماجدہ بنا دے گی کھانا۔" وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہے کدھر تمہاری ماں؟ نظر نہیں آ رہی۔" انہوں نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ماہرہ

نے بے دلی سے تفصیل بتائی۔

"جانے سے پہلے کم از کم بتا تو دیتی لیکن اس گھر میں میری کیا حیثیت۔" وہ غصے سے بولیں۔ ماہرہ کے تیور ایک دم بدلے۔

"جلدی میں گئی ہیں وہ۔ آپ گھر پر نکلیں گی تو آپ کو کوئی کچھ بتائے گا۔ کھانے کے اوقات میں بھی ڈھونڈ کر بلانا پڑتا ہے۔" اس نے بدتمیزی سے کہا دادی کو شدید غصہ آیا۔

"گھر پر بیٹھ کر میں کیا کروں؟ تم لوگ کون سا مجھ سے بات کرنا پسند کرتی ہو، صرف زبان چلانا ہی سیکھی ہے ماں سے۔" کوئی اور وقت ہوتا تو وہ خوب ہی اس بات پر ہنگامہ کرتی مگر نجانے کیا سوچ کر جھٹکے سے اٹھی اور پیر پٹختی چلی گئی۔ بگڑے مزاج کے ساتھ دادی کو کھانا دیا اور پھر سے کمرے میں گھس گئی۔ دادی نے خود ہی ریحانہ کے لیے کھانا بنانے کا سوچا مگر ماہرہ نے چپ کر کے ان کے ہاتھ سے سامان لیا۔

اسے دادی کی ہر جج اور غلط بات پر غصہ آتا تھا۔ وہ بھڑک جاتی، کیا ماں، کیا دادی، کیا باپ۔ مگر دادی کو لگتا کہ وہ صرف ان سے اور اپنے باپ سے زبان لڑاتی ہے۔ ماں کی سکھائی ہوئی ہے۔ ماں کو لگتا کہ سب بے وجہ ہی اس کی اولاد کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ قیوم کو لگتا کہ وہ محنت کر کے آ رہے ہیں تو اس گھر اس دھرتی پر ان کا احسان ہے۔ ماہرہ سمجھتی کہ ان کی ماں اور وہ تینوں بہن بھائی زیادتیاں سہہ رہے ہیں۔ وہ سب کے سب لوگ خود کو مظلوم سمجھتے تھے اور یہی سب سے بڑی غلطی تھی۔

وہ کھانا بناتے ہوئے کچھ دیر پہلے کے گئے لفظوں کو سوچ سوچ کر سلگ رہی تھی، اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالے۔ ہر ایک میری ماں کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کھانا بنا کر وہ اٹھی اور کمرے میں جھانکا۔ دادی سو رہی تھیں۔ اس نے خود ہی کھانا ان کے گھر پہنچانے کا سوچا۔ ویسے بھی ریحانہ اسے کافی اچھی لگی تھیں۔ سلجھی ہوئی سی۔ وہ پسینے سے شرابور تھی۔ کالے رنگ کا بڑا سا دوپٹا اٹھا کر اوڑھا تاکہ اس کا نازک اور پُرکشش جسم چھپ جائے۔ سامان اٹھا کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولنے والے کو دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"یہ منحوس۔ گھوریں مارنے والا بگڑا۔" اسے دیکھتے ہی دماغ جل اٹھا، جبکہ گھور مارنے والا بگڑا اسے دیکھتے ہی نہال ہو گیا۔

"ریحانہ خالہ ہیں؟" اس نے انتہائی سنجیدگی اور تیکھے انداز میں پوچھا، وہ بنا کچھ کہے ایک طرف ہو گیا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی کمرے میں وہ بستر پر لیٹی تھیں۔ چہرے سے نقاہت جھلک رہی تھی۔ ماہرہ کو عیادت کرنا نہیں آتی تھی، وہ پریشان ہی ہو گئی کہ کیا کہے اب، بڑی مشکل سے دو چار جملے بولے۔ وہ اس کی بہت مشکور ہو رہی تھیں کہ اس نے ان کا خیال کیا اور زحمت پر شرمندہ بھی۔ وہ انہیں تسلیاں دے کر واپس آ گئی۔ اس دوران مدثر مستقل بہانے بہانے سے کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ آج کا دن ماہرہ کو بدترین دن لگا۔

"چھچھورا.....شکل سے کتنا سیدھا لگتا ہے اور حرکتیں دیکھو اس موصوف کی۔ میرے باپ کی بھی توبہ جو دوبارہ اس لفنگے کی موجودگی میں، میں ان کے گھر گئی، اماں آجائیں اس کی بے غیرتی کی شکایت لگاؤں گی۔" وہ کھولتی رہی سوچتی رہی۔

شام کو ماجدہ زوباریہ کے ہمراہ آئیں۔ اس کی طبیعت شدید خراب تھی۔ پیلا زرد چہرہ، آنکھوں کے نیچے حلقے۔ نادرہ اور ماہرہ دونوں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"جاؤ جلدی سے لیموں پانی بنا کر لاؤ۔" زوباریہ کو بستر پر لٹا کر انہوں نے نادرہ سے کہا۔ وہ باہر دوڑی۔ ماہرہ آنکھوں میں آنسو بھرے اسے دیکھ رہی تھی۔ عجیب ہی شے تھی ماہرہ، اس کی خالہ کے ہونٹ بالکل سیاہ ہو چکے تھے۔ ان پر پپڑی جمی تھی۔ حلق سے آواز بھی اس قدر دھیمی نکلتی کہ کان لگا کر سننا پڑتی۔ ماہرہ اس کے قریب بیٹھ کر پاؤں دبانے لگی۔

بس ماجدہ اس کا سر دبا رہی تھی۔

"انہیں ہسپتال نہیں لے کر گئے؟" وہ ماجدہ سے پوچھنے لگی۔

"دو دن سے ہسپتالوں کے چکر ہی لگ رہے ہیں، ابھی بھی کلینک سے یہاں آئی ہوں۔ مجال ہے پل بھر کے لیے بھی اسے آرام ملا ہو۔ کیسی حالت ہو گئی ہے اس کی۔" وہ خود بہت پریشان تھیں۔ زوباریہ کی آنکھیں نقاہت کے مارے بند تھیں۔

شام ہوتے ہی قیوم بھی آگئے۔ سب اسی کے گرد جمع تھے۔ دونوں بہنیں اس کے دکھتے جسم کو اپنے ہاتھوں سے دبا کر سکون پہنچانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ماجدہ نے نوید کو دودھ لینے بھیجا تھا، وہ اس کو گرم تھیں اور بغیر دودھ کے کھلانے سے منع کیا تھا مگر ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اس کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ ماجدہ تیزی سے گزرتے وقت کو دیکھ رہی تھیں۔

قیوم زوباریہ کی عیادت کرنے کے بعد سے ٹی وی دیکھنے میں مگن تھے۔ انہیں علم ہی نہیں ہوا کہ نوید غائب ہے۔ ماجدہ دوسرے کمرے میں تھیں، انہوں نے کئی بار اسے فون کیا مگر اس نے کال ریسیو کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ رات کے گیارہ بج گئے۔ وہ بے چینی اور شدید پریشانی میں قیوم کے پاس آئیں۔

"نوید کو دودھ لینے بھیجا تھا۔ ذرا جا کر دیکھو تو۔ اب تک واپس نہیں آیا۔" ان کی گھبرائی ہوئی آواز پر وہ چونکے۔

"وہ اب تک نہیں آیا؟ اور میں سمجھا کہ وہ سو چکا ہے۔" وہ ایک دم ہی چارپائی سے اٹھے۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" انہوں نے غصے سے کہا۔ اسی غصے کی وجہ سے ہی تو وہ اب تک انہیں بتا نہیں رہی تھیں، وہ چپ رہیں۔ قیوم چلے گئے۔ گھر کے تمام لوگوں کے رنگ اڑ چکے تھے۔ متوقع ہنگامے نے نادرہ کو زرد کر دیا۔ وہ وہیں زوباریہ کے پاس دبک گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد گلی میں شور اٹھا۔ وہ سمجھ گئیں کہ نوید باپ کو دستیاب ہو چکا ہے۔ وہ اسے مارتے ہوئے اندر لے کر آئے۔

"کیا کام تھا ان کے ساتھ؟ کتنی بار بکواس کروں کہ ان لڑکوں کے ساتھ دوبارہ دکھائی مت دینا۔" اس جملے کو ادا کرنے کے دوران انہوں نے لاتعداد تھپڑ اسے مارے۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ سب کو سانپ سونگھ گیا۔ ماجدہ کا اپنا چہرہ پیلا ہو گیا۔ وہ دودھ ہی لینے گیا تھا قریب کی دکان پر دودھ ختم ہو گیا تو وہ آگے نکل گیا جہاں پہلے تو رش کی وجہ سے اسے دیر ہوئی پھر دوستوں کے مل جانے پر وہ بھول ہی گیا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا؟ قیوم کو اس کے دوست بالکل پسند نہیں تھے، وہ اتنے برے نہیں تھے جتنا کہ ان کے رشتہ داروں نے ان کی برائیاں کر کر کے ان کو غلط ثابت کر رکھا تھا۔ بس ہاتھوں میں فون، بائیک اور رات گئے تک گھومنا یا ایک جگہ جمع ہو کر باتیں بگھارنا۔ ان میں سے ایک آدھ نشے کی طرف بھی مائل تھا، مگر نوید کو ایسی کسی بھی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس کی دلچسپیاں گاڑی، موبائل فونز اور بائیک تک محدود تھی۔

"آج تو میں اس کو نہیں چھوڑوں گا۔ ختم کر دوں گا۔" وہ یہاں وہاں کوئی چیز تلاشنے لگے۔

"اسے جان سے مارو گے کیا؟ بس کر دو اب۔" انہوں نے جیسے ہی ڈنڈا اٹھایا، ماجدہ نے نوید کو اندر بھگایا۔

"بند کرو اپنی بکواس۔ ساری غلطی تمہاری ہے۔" اس جملے کے دوران انہوں نے تین چار بھاری بھرکم گالیاں بھی دیں۔ جیسے وہ پلٹیں۔ اس وقت وہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہیں مار سکتی تھیں۔

"یہاں بیٹھو۔" انہیں کرسی پر بٹھایا اور پانی لے آئیں۔ وہ اس بات سے بھی واقف تھیں کہ وہ کچھ ایسا ویسا بول گئیں تو ان کی اپنی خیر نہیں ہوگی۔ انہوں نے پانی پیا۔ غصہ کچھ کم ہوا۔ غصہ ایک دم آتا اور ایک دم ہی اتر جاتا۔

"کہاں تھا یہ؟" انہوں نے ان کی پشت سہلاتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

"علاقے کے جتنے گھٹیا لڑکے ہیں ان سے اس

کی وہ حق ہے۔ اپنے ہی کے ساتھ وہاں بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا۔" انہیں پھر سے غصہ چڑھنے لگا۔

"یہ لڑکا عذاب ہے عذاب۔" وہ دکھ سے بولیں۔ نوید کے معاملے میں وہ بالکل بے بس تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہوئے تو جا کر سو گئے۔ جبکہ وہ نوید کے جسم پر پڑنے والے نشانات کو دیکھے بغیر بھی اذیت محسوس کر رہی تھیں۔

☆☆☆

زوبار یہ کی طبیعت سنبھلنے میں ایک ہفتہ لگا تو وہ اسے گھر چھوڑ آئیں۔ زندگی کا وہی معمول تھا۔ بھی جھگڑے، بھی نرمیاں۔

البتہ مدثر کی روٹین میں واضح فرق آیا تھا۔ وہ صبح سویرے جاگتا اور دروازے سے کان لگا لیتا تاکہ ماہرہ کی کھنکتی آواز اس کے کانوں میں اترتی رہے۔ ماہرہ جب گھر سے نکلتی تو وہ اسے چھپ کر دیکھتا۔ اس کے دلکش چہرے پر ہمہ وقت سنجیدگی یا غصہ رہتا۔ تنے ہوئے ابرو، پیشانی پر بل۔ راہ سے گزرتے چہرے پر مسکراہٹ تو دور ہلکی سی نرمی کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر لگتا کہ شعلے نکلیں گے۔ وہ اس غصے بھرے چہرے کے ساتھ ہی اس کے دل میں اتر گئی تھی اور ایسی اتری کہ وہ سترہ اٹھارہ سال کے لڑکوں والی حرکتیں کرنے لگا۔

ایک دوست کے بچے کو پکڑ کر وہ اس کے اسکول جا پہنچا۔ اسے دیکھ کر ماہرہ چونک گئی اور وہ ماہرہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس اس کی دلکش رنگت بہت کھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے ڈورے نجانے کیوں سرخ ہو رہے تھے مگر مدثر کا تو حال ہی خراب ہو گیا۔ ساری حاضر دماغی، غائب دماغی میں بدل گئی۔ وہ منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ صاحب ایک ایسے علاقے سے آئے ہیں جہاں میٹھا پانی بھی میسر نہیں۔ سادگی تو تھی ہی مگر اس کے ساتھ ہی کچھ اور بھی تھا جو اسے کسی اچھے گھر کا فرق بتاتا تھا، عجیب سی بے نیازی تھی جو خود کی پیدا کردہ نہیں فطری تھی۔ مدثر تو بس اسے دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ ماہرہ نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب کہ اس آنے والے کو اسے ہی ڈیل کرنا تھا۔

"جی۔ فرمائیے؟" وہ سنجیدہ مگر دھیمے لہجے میں بولی۔

"ایڈمیشن کی تفصیلات معلوم کرنی ہیں۔" اس نے گھبرا کر کہا۔ رعب حسن تھا یا کیا تھا وہ گھبرا گیا۔

"آپ یہاں بیٹھیے پلیز۔ میں داخلے کی تفصیلات بتاتی ہوں۔" وہ شائستگی سے بولی اور ایک طرف نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ تو نہیں ایک اور لڑکی آئی جس نے اسے بڑے ہی پیشہ وارانہ انداز میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ شکریہ ادا کرتا باہر آیا تو وہ اسے جھولے کے پاس کھڑی دکھائی دی۔ اس کے ارد گرد بچے تھے وہ شاید انہیں کوئی ایکٹیویٹی کروا رہی تھی۔ اس کی طرف ایک بھی نگاہ غلط ڈالے بغیر وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ کچھ دیر وہ بھی اسے دیکھتا رہا اور پھر باہر چلا گیا۔

مدثر کے دل میں نئی نئی خواہشیں جنم لینے لگی تھیں۔ اپنی ماں کی زبانی اسے ان کے گھر کی باتوں کا علم ہوتا رہتا تھا۔ ماہرہ کا ذکر وہ بہت محبت سے کرتیں۔ ان کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اسے بہت پسند کرتی ہیں۔ اس لیے وہ ان کی طرف سے مطمئن تھا کہ اگر وہ ماہرہ کے ساتھ شادی کی خواہش کرتا ہے تو انہیں اعتراض نہیں ہوگا۔ سارا مسئلہ قیوم کا تھا۔ وہ تو لائحہ عمل ٹریٹمنٹ بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ کیا خبر یہ بات سن کر وہ ان کو گھر سے ہی نہ نکال دیں۔ عجیب عجیب خدشات نے اسے اچھا خاصا ڈرا دیا تھا۔ ابھی تو اس کا گھر بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس کی تکمیل میں ابھی وقت تھا۔

جبکہ اسے جاتے دیکھ کر ماہرہ الجھ گئی۔

"وہ یہاں کیوں آیا تھا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔

☆☆☆

وہ بہ ابھی ڈھلی نہیں تھی کہ ریشماں چچی کی آمد ہوئی۔ وہ اس کی سگی چچی نہیں تھیں۔ اس کے ابا کے کزن کی بیگم تھیں۔ اس ہفتے میں یہ ان کا دوسرا چکر تھا۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا جن کو ماہرہ کی پسند کرتی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی ماہرہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ وہ ان سے مل کر چائے بنانے آ گئی۔ بسکٹ، نمکو کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ اٹھی اور گلی میں جھانکنے لگی کہ شاید کوئی بچہ مل جائے۔ کوئی نہ ملا البتہ مدثر اسے دکھائی دے گیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں دبے نوٹ دیکھ چکا تھا۔

"کچھ منگوانا ہے؟" وہ شرافت سے بولا۔

"جی۔"

"میں لے آتا ہوں۔" ماہرہ نے اسے سامان بتایا۔ وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ یہ بے ضرری ملاقاتیں اسے بڑی ہی دل فریب محسوس ہوتی تھیں جبکہ ماہرہ اسے کسی میں نہیں لاتی تھی۔ وہ اس کے لیے ایک کرائے دار سے زیادہ کی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں چمکتی خوشی اسے حیران ضرور کرتی تھی۔ کوئی بے وجہ اتنا کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ مدثر کو ذہن سے جھٹک کر وہ اندر آ گئی۔

ریشماں کی آوازیں اس کے کانوں میں اتر سیسہ پگھلا رہی تھیں۔ وہ اپنے دیور کے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگنا چاہتی تھیں اور اسی وجہ سے آج کل وہ ان کے گھر آنا جانا بڑھا رہی تھیں۔ لڑکے کا نام قاسم تھا۔ اس کی ماں تو تھی نہیں سو لڑکی ڈھونڈنے اور شادی کی ذمہ داری بھی ریشماں پر تھی۔

ان کی اپنی بھی تین بیٹیاں تھیں اور ان کے خاندان کے رواج کے حساب سے پہلا حق چچا یا تایا کی بیٹیوں کا تھا مگر قاسم بہت غصیلا اور چڑچڑا مزاج رکھتا تھا۔ ہاتھ چھٹ بھی۔ قیوم سے دو ہاتھ آگے ہی تھا، خاندان میں اکثر لوگ یہی کہتے تھے کہ اس نے قیوم کی فطرت چرائی ہے۔

دروازہ بجنے پر ماجدہ اٹھیں اور مدثر سے سامان لے کر شکریہ ادا کر کے اندر آ گئیں۔ ماہرہ کھولتے دماغ کے ساتھ چائے لائی اور ان کے سامنے رکھ کر بنا کچھ کہے چلی گئی۔ ریشماں کو اس کے مزاج سے بھی اچھی خاصی واقفیت تھی سو کوئی بھی توجہ دیے بنا انہوں نے رشتے کی بات ماجدہ کے کان میں ڈالی اور چلی گئیں۔ ماہرہ اس دوران جلے پیر کی بلی کی طرح یہاں سے وہاں چکراتی پھر رہی تھی۔

ماجدہ اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئیں۔ قاسم اچھا خاصا خوش شکل اور ٹھیک ٹھاک کمانے والا لڑکا تھا۔ اگر اس میں غصہ اور سختی نہ ہوتی تو ریشماں اسے داماد کی کرسی دینے کے بارے میں لمحہ بھی سوچنے پر ضائع نہ کرتیں۔ اس کے اندر اور کوئی بھی بری عادت نہیں تھی۔ نہ سگریٹ پان نہ ہی محفل پسندی کی خصلت۔ لیکن پھر وہی بات کہ ان دو عادتوں نے ہر خاصیت کو گہنا دیا تھا۔ وہ اپنی نازوں پلی بیٹی کو ایسا وحشیانہ رویہ رکھنے والے قاسم کی بیوی کیسے بنا سکتی تھیں۔

ماجدہ اس رشتے کے لیے بالکل راضی نہیں تھیں۔ مگر قیوم نے اسے طعنہ مارا کہ تمہارے بھائیوں نے کون سا اپنی بھانجی کو پوچھ لیا۔ خاندان کا سب سے شریف لڑکا یہی ہے۔ تم اپنا منہ بند رکھو۔ کوئی ڈھنگ کا رشتہ نظر میں ہوا تو منہ کھولنا۔ تب میں تمہاری ذمہ داری پر ماہرہ کو اس کے ساتھ بیاہ دوں گا۔

ماجدہ کے پاس کون سا کوئی رشتوں کی زنبیل تھی جس میں سے وہ رشتے نکال کر پیش کرتیں۔ چپ ہو رہیں۔ ماہرہ کو ان کی خاموشی پر شدید حیرت ہوئی۔

"آپ اتنی آسانی سے کیسے مان سکتی ہیں؟" وہ حیرت زدہ تھی۔

"دیکھو ماہرہ! شادی بیاہ کے معاملات اور گھر کے چھوٹے موٹے معاملات میں ضد اور بحث بازی دو مختلف چیزیں ہیں۔ تمہارے باپ اور دادی بلکہ پورے خاندان کی پہلی ترجیح ہمیشہ اپنے لوگ رہے ہیں۔ باہر سے کوئی شہزادہ بھی آئے تو وہ اپنے لکڑ ہارے کو اہمیت دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں انسانوں پر نہیں خدا پر بھروسا ہے۔ اگر تمہاری قسمت میں سکھ ہے تو وہ تمہیں قاسم کی ہمراہی میں بھی ملے گا۔ نہیں ہے تو پھر کسی صورت نہیں۔

اب ایک بات سنو۔ تمہارا باپ، اس نے مجھے ساری زندگی ذہنی اور جسمانی اذیت دی ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اس نے میرے علاوہ بھی کسی عورت کی

طرف نہیں دیکھا۔ مجھے بچے سنورے دیکھ کر خوش ہوتا تھا مگر کبھی اول جلول حلیے میں دھتکارا نہیں ہے۔ جو کمایا میرے ہاتھ میں لا کر رکھا۔ تم لوگوں کی ضرورتوں کو سب سے اوپر رکھا ہے۔''

وہ پہلی بار ماں کے منہ سے باپ کی تعریفیں سن رہی تھی، مگر وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ سمجھ میں آ بھی نہیں سکتیں۔ اس نے ابھی صرف درسی کتابیں پڑھی تھیں۔ مردوں کے نام پر رشتوں کا لباس پہنے لوگ دیکھے تھے۔ باپ، بھائی، چچا، دادا۔ اس کی زندگی میں ابھی کوئی مرد نہیں آیا تھا سو وہ ابھی ان باریکیوں سے واقف نہیں تھی۔ کچھ چیزیں مخصوص عمر گزار دینے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔ وہ ماں سے متنفر ہوگئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ باپ کے پوچھنے پر انکار کر دے گی۔ مگر قیوم کے سامنے اس کا سر تفکر ہاں میں ہی ہلا۔

کیا میں زندگی بھر سکون کا سانس نہیں لے پاؤں گی؟ یہ سوچ اسے بے حد خوف زدہ کر دیتی۔ قاسم ریشماں چچی کی منجھلی بیٹی کو پسند کرتا تھا۔ اس کا رجحان بھی اس کی طرف تھا مگر ریشماں ایسا بدلحاظ داماد برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ ماجدہ ایک بات بھول گئی تھیں وہ یہ کہ قیوم جو بھی تھا جیسا بھی تھا صرف گھر کے لوگوں کے ساتھ تھا۔ اس نے کبھی بھی ماجدہ کے والد یا اس کے گھر والوں سے بدتمیزی تو دور اونچی آواز میں بات تک نہیں کی تھی۔ جبکہ قاسم، وہ اس چیز کے احساس سے بھی عاری تھا۔ کچھ اس کی اپنی فطرت اور کچھ تربیت کی کمی۔ ریشماں نے بھی اسے اچھا برا سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور اب وہ سمجھنے کی حدود سے بھی باہر آ چکا تھا۔

ماہرہ رشتے طے ہو جانے کے بعد سے یوں خاموش تھی جیسے زبان ہی کٹ گئی ہو۔ بچے گھر میں شور مچاتے ہنگامہ کرتے، دھوئی سفید چادر پر گندے مٹی سے اٹے پاؤں سمیت چڑھ جاتا اسے کسی بات سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ نہ وہ کسی کو ٹوکتی۔ پہلے کی طرح کئی کئی گھنٹے سو کر نہیں گزارتی تھی۔ ایک جگہ بیٹھتی تو بیٹھی رہ جاتی۔ اس کی کارکردگی میں بھی فرق آرہا تھا۔ مستقبل کی تاریکی اور خوف نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے۔

اس نے قاسم کو کئی بار اپنی آنکھوں سے معمولی باتوں پر بھی اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو مارتے پیٹتے دیکھا تھا۔ کھانا پسند نہ آتا تو چاہے گھر مہمانوں سے بھرا ہی کیوں نہ ہوتا۔ وہ ہنگامہ مچا دیتا۔

نئی زندگی موجودہ زندگی سے بدتر ہوگی اس بات میں اسے کوئی شبہ نہیں تھا۔ اور یہی یقین اسے دن بدن خاموش ہو جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ جسے سب نے ہی محسوس کیا خصوصاً قیوم نے۔ مزاج اپنی جگہ لیکن اسے اپنی اولاد سے بڑی محبت تھی مگر اولاد یہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اپنی روایتی سوچ کو تبدیل نہیں کر سکتا تھا اور سوچ کا تبدیل نہ ہونا، اس عمر میں بھی وہی مزاج رہنا سب کو یہی لگتا کہ اس مرد کو بیوی اور بچوں کی پروا نہیں۔ کسی نے آج تک اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ شدید گرمی ہو یا سردی رمضان ہو یا کوئی اور مقدس مہینہ، وہ گرم ترین روزوں میں بھی مزدوری کرتا۔ اپنا پیٹ تو وہ کسی لنگر کا کھا کر بھی بھر سکتا تھا، لیکن سب نے ہی اپنی مرضی کے خاکے تراش رکھے ہیں۔ وہ اس خاکے پر پورا اترا تو اچھا ہوگا، نہ پورا اترا تو برا۔ ماہرہ کی خاموشی قیوم کو پریشان کر رہی تھی۔ بہت زیادہ پریشان۔

☆☆☆

رات کے سناٹے میں دور کہیں سے جھینگر کی آواز گونج رہی تھی۔ قطرہ قطرہ پگھلتی رات مدثر کے وجود میں اترنے والی اذیت کی شدت کو بڑھا رہی تھی۔ کچھ دن پہلے اسے کام کے سلسلے میں اچانک ہی فیصل آباد جانا پڑ گیا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات اپنے بھائی سے ہوئی۔ وہ شازیہ نے کاروبار میں نقصان ہو جانے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا، اب وہ اکیلا تھا۔ مدثر سے خوب معافیاں مانگیں۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں معاف کر بیٹھا مگر رابطہ نہ رکھا اور واپسی پر ماہرہ کی منگنی کی دھماکا خیز خبر اس کی منتظر تھی۔ اس کی اماں تمام تفصیل اس کے گوش گزار کر رہی تھیں اور وہ پتھر بنا سن رہا تھا۔

''ان کے رواج تو بڑے عجیب ہیں۔ میں تو دیکھ کر حیران رہ گئی۔'' مدثر ان کی طرف خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا مگر انہوں نے غور نہیں کیا۔ اتنے دن کی باتیں جمع تھیں ان کے پاس اور ان کا بیٹا بہترین سامع تھا۔ جب وہ اپنی باتوں سے بھری ٹوکری خالی کرتیں تو ہی مدثر کے تاثرات پر غور کر سکتیں۔

''ارے لڑکے والے آئے یہ ڈھیر ساری مٹھائیاں لے کر صرف چند مہمانوں کے ساتھ۔ کپڑوں سے بھری پیٹی، چوڑیاں چپل، سب کچھ اور ایک خوب صورت سونے کی انگوٹھی۔ میں نے پوچھا آپ لوگ کب جائیں گے منگنی کے لیے تو ماجدہ حیران ہو کر بولی کہ ہم کیوں جائیں؟ کل لڑکا آئے گا سلام کرنے بس ایک جوڑا کپڑوں کا اور ایک چپل کی جوڑی تحفے کے طور پر دینی ہوگی اور دوپہر کی دعوت۔ نہ لڑکیاں لڑکے والوں کی آؤ بھگت کے لیے بھاگتی دوڑتی دکھائی دیں۔ عورتوں نے خود ہی بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی، سب یوں گھل مل کر بیٹھے تھے کہ مہمانوں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ کھانا پیش کرتے وقت ساری جوان لڑکیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تین چار تو لڑکے والوں میں سے بھی تھیں۔ سب کو اچھے طریقے سے کھانا کھلایا۔ گھر کی صفائی کرتے وقت بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس نے کیا کیا۔ ذرا سی دیر میں سارا کام نمٹ گیا۔ مجھے تو صابر کی شادی یاد آ گئی۔ میں اکیلی اور حال ہے جو کسی لڑکی نے اٹھ کر مدد کروائی ہو۔ ان کو تو بجھے سنورنے اور نخروں سے ہی فرصت نہیں تھی، اور یہاں بھی ہر لڑکی تیار شیار تھی مگر کام کے وقت ایسی پھرتی میری آنکھیں حیران رہ گئیں۔ مجھے تو کام والیاں بلوا کر بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔'' ان کو اپنا دکھ یاد آ گیا۔ مدثر خاموش رہا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔

''اماں۔ جب وہ ماہرہ کا رشتہ طے کرنے والی تھیں تب انہوں نے اس بات کا ذکر کیا تھا آپ سے؟''

''ہاں مجھے بتایا تھا۔ بڑی پریشان تھی وہ اور دل سے راضی بھی نہیں۔ ماہرہ خوش ہوتی تو شاید ماجدہ کے دل کا بوجھ بھی کم ہو جاتا۔'' وہ ملول ہو کر بولیں۔

''پریشان کیوں؟'' وہ چونک گیا۔

''دیکھنے میں تو قاسم بڑا وجیہہ ہے لیکن عادت......'' انہوں نے ایک ایک تفصیل اسے بتائی۔ وہ بری طرح بے چین ہو گیا۔

''تو ماہرہ نے انکار کیوں نہیں کیا؟'' اسے اس کی بزدلی پر غصہ آیا۔

''کیا کہہ کر انکار کرتی؟ تم بھی عجیب بات کرتے ہو۔'' وہ برا مان گئیں۔ ''باپ کے سامنے کس کی ہمت ہوتی ہے انکار کی۔ بچی بے چاری تو بالکل گونگی ہی ہوگئی ہے۔ جب دیکھو منہ پر قفل ڈالے بیٹھی رہتی ہے۔ کمزور ہوگئی ہے۔''

''تو ماں باپ کو اس کی حالت نظر نہیں آرہی؟ ایسی بھی کیا بے حسی اور ماجدہ خالہ اس دن تو جھگڑا کرتے بہت بول رہی تھیں شوہر کو خوب کھری کھری سنائیں۔ بیٹی کے معاملے میں گونگی بن گئیں۔'' وہ بگڑ کر بولا۔ ریحانہ چونک گئیں۔

''تمہیں اتنا غصہ کیوں آرہا ہے؟''

''غصے کی بات ہے، اس لیے آرہا ہے۔ ایک پڑھی لکھی سلجھی ہوئی لڑکی کو ایسے ڈنگر کے ساتھ باندھ دینا کہاں کا انصاف ہے؟'' وہ گڑبڑایا مگر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''سلجھی ہوئی تو خیر نہیں ہے۔ بالکل باپ کی کاپی ہے۔ لڑکی ہو کر بھی اس کے مزاج میں اتنا غصہ ہے۔'' ان کا تبصرہ سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔

''آپ کو تو وہ بہت پسند تھی۔'' مدثر کے لیے ان کی یہ باتیں حیرت کا جھٹکا ثابت ہو رہی تھیں۔

''پسند اب بھی ہے، لیکن وہ کوئی فرشتہ تو نہیں ہے۔ انسان ہے۔ گھر کے ماحول نے اسے بھی آدھا پاگل کر رکھا ہے۔ اپنی فرسٹریشن اسے بھی نکالنی ہے۔'' ان کی صاف گوئی اسے بالکل اچھی نہ لگی۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر لیٹ گیا۔

☆☆☆

ریحانہ کو مدثر کے انداز نے چونکا دیا تھا۔ مگر وہ یہ سب سوچنا نہیں چاہتی تھیں۔ بھلا ایک دو بار کے آمنے سامنے میں مدثر کیسے اسے پسند کرسکتا تھا اور وہ بھی اس قدر کہ شادی کا سوچتا۔ انہوں نے ان باتوں کو جھٹک کر نماز ادا کرنے کا سوچا۔

ابھی وہ مصلے پر کھڑی ہوئی ہی تھیں کہ مدثر نے ان کا موبائل اٹھالیا۔ گیلری کھولی جہاں ماہرو کی منگنی کی تصویریں موجود تھیں۔ تیکھی ستواں ناک اور اداس آنکھوں والی ساحرہ کو اس حلیے میں دیکھ کر رہا سہا دل بھی ہاتھوں سے جاتا ہوا محسوس ہوا۔ کتنی دیر گزری اسے کچھ علم نہیں تھا، وہ چپ چاپ نگاہیں جمائے تصویر کو دیکھتے ہوئے نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

ریحانہ نماز پڑھ کر کھانا بنا کر آئیں تو اسے سویا دیکھ کر دکھی ہو گئیں۔ مدثر کا پورا دن مصروفیت میں گزرتا تھا۔ اس کا بچپن بڑے اچھے حالات میں گزرا تھا مگر باپ کی وفات کے بعد اس کے بڑے بھائی صابر نے ساری جائداد پر قبضہ کرلیا اور جب اس نے حصہ مانگا تو یہ کہہ کر انکار کردیا کہ وہ اس کے حصے کی تمام جائداد اس کی مہنگی تعلیم پر خرچ کرچکا ہے۔

مدثر نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح وہ اسے اس کا حصہ دے دیں مگر جب بے ایمانی دماغ پر سوار ہوجائے تو انسان کسی کا بھی بھلا نہیں سوچتا۔ رہی سہی کسر اس کی بیوی شازیہ نے پوری کرلی۔

بھائی نے جائداد چھینی تھی مگر چھت اس کے سر پر تھی۔ شازیہ نے اس پر دست درازی کا جھوٹا الزام لگا کر اسے گھر سے نکلوا دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ ان کی سگی بھابھی اس قدر گھٹیا حرکت کرے گی۔ جس وقت صابر، مدثر کو مار کر گھر سے نکال رہا تھا اس وقت انہوں نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ صابر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں پر بیوی کی محبت کی پٹی چڑھی تھی۔ اس فریبی عورت نے صابر کے چھوٹے دماغ میں بھی لالچ بھر دیا تھا۔ مگر وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ شازیہ نے اس کے بھائی پر جھوٹا الزام لگایا ہے۔ اس لیے ماں کی طرف داری نے اسے پاگل کردیا۔

گھر سے نکالے جانے کے بعد مدثر نے جہاں بھی نوکری کرنا چاہی، شازیہ نے کوئی نہ کوئی مسئلہ کرا کے وہاں سے نکلنے پر مجبور کردیا۔ شازیہ اچھی طرح واقف تھی کہ مدثر بے حد محنتی اور ذہین لڑکا ہے آج نہیں تو کل وہ پھر سے کھڑا ہو کر ان کے لیے مسئلہ بنائے گا۔ یہی سوچ کر اس نے اسے نفسیاتی اعتبار سے اس قدر تھکایا کہ ایک وقت ایسا آیا کہ مدثر نے خودکشی کی کوشش تک کر ڈالی۔

تب ریحانہ نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنا سارا حصہ بیچ کر اسے کاروبار کے لیے پیسے دیے۔ پہلے وہ منع کرتا رہا مگر اب اسے اپنی ذہنی تھکاوٹ اسے ختم کرنا تھی۔ کاروبار میں انویسٹمنٹ کے بعد ان کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں بچے تھے کہ وہ کسی اچھے علاقے میں گھر کرائے پر لے کر رہ سکیں۔

کچھ عرصہ وہ مختلف گھروں میں رہتے رہے۔ مگر مالک مکان کے برے رویے انہیں کوچ کر جانے پر مجبور کردیتے۔ لیکن یہاں آنے کے بعد سے ریحانہ بے حد خوش تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے انہیں ساری تکلیفیں یاد آئیں جو ان کے لاڈلے بیٹے نے اس جائداد کے ہاتھوں اٹھائی تھیں۔

دن رات کی محنت کے بعد اب ان کا اپنا خوب صورت سا گھر تکمیل کے مراحل میں تھا۔ وہ محبت سے اس کی پیشانی چومنے کو جھکیں تو موبائل پر ٹچ ٹون بجی، موبائل کی اسکرین روشن ہوئی اور ماہرو کی ہنستی تصویر ان کی نظروں کے سامنے آگئی۔ اس تصویر پر مدثر کا ننھا سا آنسو چمک رہا تھا۔ انہوں نے دہل کر دل تھام لیا۔

کچھ ہی دیر بعد اسے اپنے بالوں میں ماں کی نرم انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔

''مجھے اندازہ بھی ہوتا کہ تمہیں ماہرو پسند ہے تو میں ہر صورت تمہاری شادی اس سے کرواتی۔'' ان کے ادا کیے گئے جملے نے مدثر کو حیرت کا جھٹکا دیا، وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔

''امی۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''تم جلد از جلد گھر مکمل کروادو۔ میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی۔'' اس نے محض اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن کچھ ہی دن بعد ان کا جانے کا ارادہ تبدیل ہوگیا اور وجہ ماہرو تھی۔

☆☆☆

ایک شام کو قاسم ان کی طرف آگیا۔ ماہرو نے اس کی طرف ایک بار بھی نہ دیکھا۔ غصہ ہوکر بیٹھ گئی۔ ماہرہ کو بھی خاطر تواضع کا کام دیکھنا پڑا۔ قاسم کسی اور کو پسند کرتا تھا مگر اب ماہرو سے اس کا رشتہ بن چکا تھا۔ دل میں خواہش جاگی کہ وہ ماہرو کو عام لڑکیوں کی طرح شرماتے لجاتے دیکھے۔ مگر وہاں خشک سالی دیکھ کر اس کا دل بھی بنجر ہوگیا۔

ہفتے دو ہفتے بعد وہ سسرال چکر لگا لیتا۔ ایک روز وہ شام کو وہاں پہنچا تو دیکھا ماہرو اسکول کے کام میں مصروف تھی۔ اسے سلام کر کے وہ پھر سے اپنا کام کرنے لگی۔

''شادی کے بعد میں تمہیں نوکری نہیں کرنے دوں گا۔'' اس نے بات کرنے کی غرض سے بے تکی بات کردی۔ ماہرو کے کام کرتے ہاتھ رکے۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''شادی کے بعد مجھے نوکری کرنی بھی نہیں۔'' وہ تڑخ کر بولی۔ قاسم نے اسے غور سے دیکھا۔ سامنے جھولتی لمبی سی چوٹی۔ چہرے پر غصہ اور ناراضی۔ اسے لگا وہ اپنا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ اس کی پیشانی پر بھی ہر وقت بل رہتے تھے۔

''تم ہر وقت غصے میں کیوں رہتی ہو؟''

''آپ ہر وقت اپنے گھر والوں پر چلاتے کیوں ہیں؟'' ماہرو نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''کیونکہ وہ مجھے چلانے کی وجہ دیتے ہیں۔ سارے کام ٹھیک سے کریں تو میں غصہ کیوں کروں؟'' وہ سادگی سے بولا۔ ماہرو اس کے فلسفے پر اش اش کر اٹھی۔

''اسی طرح لوگ مجھے غصے میں رہنے کی وجہ دیتے ہیں۔ کوئی مجھے پریشان نہ کرے تو میں غصہ کیوں کروں؟''

''کون پریشان کرتا ہے تمہیں؟'' وہ ایک دم الرٹ ہوگیا۔

ماہرو نے ماتھا پیٹ لیا۔ ''ایک تو اس آدمی کی سوچ۔ اف......''

''مجھے ہر وقت غصے میں رہنے والے، ہاتھ اٹھانے اور گالیاں دینے والے لوگ پسند نہیں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

قاسم لمحے بھر کے لیے چپ رہ گیا۔ ابھی وہ کچھ کہتا کہ ماجدہ آگئیں۔ وہ ہانپ رہی تھیں۔

''تم کب آئے؟'' اسے دیکھ کر وہ خوش گوار سے بولیں۔

''بس کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔'' اس نے اٹھ کر انہیں سلام کیا۔ ''آپ کہاں تھیں؟''

''بس اس نوید کو ڈھونڈنے نکلی تھی۔ موٹر خراب ہوگئی ہے۔ اس کے باپ نے کہا تھا کہ نوید سے کہہ کر مکینک بلوا کر اسے ٹھیک کروادوں۔ لیکن یہ لڑکا پورا دن میرے ہاتھ نہیں لگا۔ ابھی بھی دس گلیاں گھوم آئی کہیں نہیں ملا۔ اب اس کا باپ آیا تو شور کرے گا۔'' ان کے چہرے پر مردنی چھلکی تھی۔

''میں مکینک کو بلا لیتا ہوں۔ کچھ دیر بعد نوید کو بھی لے آؤں گا۔'' اس نے شرافت سے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ نوید کی حرکتوں پر اسے سخت غصہ آتا تھا۔ نوید کی عمر میں قاسم نے ہنر سیکھ کر اپنا کام بھی شروع کردیا تھا صبح سے شام تک کام کرتا۔ پھر سیدھا گھر۔ نہ گلیوں میں گشت کا شوق نہ ہی یاری دوستی بالکل قیوم کی طرح۔ اسے گھر میں رہنا پسند تھا اور گھر کی ہر چیز کو درست حالت میں دیکھنا بھی مگر عورتوں کی طرح ہر معاملے میں بولنا بھی ضروری محسوس کرتا تھا۔ قاسم نے فون کر کے مکینک کو بلوا لیا۔ ماہرو اٹھ کر ریحانہ کی طرف آگئی۔ وہ بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر مسکرائیں۔

''کیسی ہو بیٹا؟ آؤ بیٹھو۔'' ایک طرف ہو کر انہوں نے اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ اس کے

چہرے سے ہی اس کے موڈ کا اندازہ ہو رہا تھا۔
''قاسم آیا ہے؟'' دروازہ بند کرنے کے لیے وہ کھڑی ہوئیں تو اس کی بائیک پر ان کی نظر پڑی جو گلی میں کھڑی کر رکھی تھی۔
''جی۔ جی۔'' کہتے اس کے چہرے کے سارے زاویے بگڑ گئے۔ وہ مسکراہٹ روک نہ پائیں۔
''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا آہستہ آہستہ۔ پریشان مت ہو۔'' انہوں نے اسے تسلی دی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بحث کر کے کیا کرتی۔ تھوڑی دیر بعد جب بائیک چلنے کی آواز آئی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں اب چلتی ہوں۔'' ریحانہ روکتی رہ گئیں۔
اس نے دروازہ کھول کر پلٹ کر جواب دیتے ہوئے پاؤں باہر رکھا ہی تھا کہ مدثر سے ٹکرائی۔ اس اچانک افتاد کے لیے وہ دونوں ہی تیار نہیں تھے۔ زوردار ٹکر ہوئی۔ اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ وہ اس چند لمحے کی قربت پر مسرور کیا ہوتا، گھبرا کر رہ گیا۔ ریحانہ جلدی سے اس کے پاس آئیں اور سر پر ٹھنڈا پانی ڈالنے لگیں۔ خون رک جانے پر اس نے سر اٹھا کر مدثر کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔ اس کی معذرت کرنے کی ہمت بھی اپنی موت آپ مر گئی۔ وہ ٹھک ٹھک کرتی چلی گئی۔ وہ وہیں بیٹھا رہ گیا۔
''یہ قسمت بھی کیا عجیب شے ہے۔'' اس نے منہ بنا کر سوچا۔ ذہن کے پردوں پر اس کی غصے سے بھری بھیگی آنکھیں چپک کر رہ گئیں۔
قیوم رات کو پہنچے تو قاسم ابھی وہیں موجود تھا۔ ماجدہ نے اسے کھانے پر روک لیا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ انہیں نوید کا خیال آیا۔
''نوید کہاں ہے؟''
''صبح سے کچھ اتا پتا نہیں اس کا۔ ابھی جاتا ہوں اسے ڈھونڈنے۔'' قاسم نے کہا۔ قیوم کا دماغ گھوم گیا۔ نوید کی شان میں انہوں نے خوب ہی قصیدے پڑھے۔
کھانا کھا کر قاسم بائیک لے کر نکل گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان دونوں کی آمد ہوئی۔ اندر آتے ہی نوید اس سے بھڑ گیا۔ ایک ہنگامہ تھا جو مچا۔ اس قدر شور کہ مدثر کھانا چھوڑ کر ان کے گھر بھاگا۔ وہ دونوں گتھم گتھا تھے۔ قیوم اور مدثر نے چھڑانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ قاسم نے اسے دبوچ لیا اور منہ پر مکا مارا۔ ماہرہ کے لیے یہ منظر جان لیوا تھا۔ وہ جیسے غصے سے پاگل ہو گئی۔ نوید کے منہ سے نکلنے والے خون نے اسے ہوش و خرد سے بیگانہ کر دیا۔ اس نے ڈنڈا اٹھا کر قاسم کے سر پر مار دیا۔ وہ بلبلا گیا۔ اور ضرب لگانے والی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔ باقی سب بھی ساکت ہو گئے۔ وہ آگے بڑھی۔
''تم ہوتے کون ہو میرے بھائی پر ہاتھ اٹھانے والے۔'' اس نے اس کا گریبان پکڑ کر چلا کر کہا۔ اس قدر غیر متوقع صورت حال تھی کہ قاسم بھی کچھ سمجھ ہی نہیں پایا اور جب ہوش آیا تو اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گرتی لیکن ماجدہ نے سنبھال لیا۔ وہ پھر کر آگے بڑھی۔
''ماہرہ۔'' ماجدہ غصے سے چلائیں اور اسے پکڑ کر کھینچا۔ قاسم کا بس نہ چلتا تھا کہ سامنے کھڑی ماہرہ کو اس دھرتی سے غائب کر دے۔ جبکہ مدثر بھی ششدر تھا۔ قیوم الگ آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔
''سب مارو۔ ہاتھ اٹھاؤ ہم پر۔ انسان نہیں ہیں ہم جانور ہیں۔ میں بھی، میری ماں بھی اور میرا یہ بھائی بھی۔ جب جس کا دل چاہتا ہے آ کر ہمارے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ جس کا دل چاہتا ہے آ کر ہاتھ اٹھانے لگ جاتا ہے۔ پہلے صرف میرا باپ تھا اب تمہیں دوسرا باپ بنا دیا ہے۔ تم بھی آؤ۔ مارو۔ باہر لڑکوں کے ساتھ ہی بیٹھا تھا نا۔ تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیا ہوگا، بدتمیزی کی ہوگی۔ لیکن تم تو خدا ہو۔ میرا باپ بھی خدا ہے۔ سب خدا ہیں بس ہم لوگ رعایا ہیں۔ آؤ تم بھی ہمارے سروں پر۔ آ کر ڈنڈے برساؤ۔ پہلے میرا باپ میری ماں پر ہاتھ اٹھاتا تھا، گالیاں دیتا تھا۔ اب کل کو تم نہ صرف مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے بلکہ میرے بہن بھائیوں پر بھی۔ نہ صرف مجھے گالیاں دو گے بلکہ انہیں بھی۔ یہی قسمت ہے

ساری۔'' چلا چلا کر اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے صور پھونک دیا ہو۔ اس نے نوید کو سہارا دے کر اوپر اٹھایا اور روتے ہوئے اس کا چہرہ صاف کرنے لگی۔ ماجدہ بھی آنسو پونچھتے ہوئے اس کے قریب آ گئیں۔ دونوں نے اسے سہارا دیا اور اندر کمرے میں لے گئیں۔ نادرہ بھی ٹھنڈا پانی لے کر اندر گئی۔ باہر وہ تینوں مرد کھڑے تھے۔ اپنے آپ سے بھی نظریں چراتے ہوئے۔

☆☆☆

رات کے دس بج رہے تھے جب قاسم وہاں پہنچا۔ نوید دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اس کی نظر قاسم پر پڑی مگر وہ نظر انداز کر کے پھر سے دوستوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کے لیے ان میں لحاظ بھی نہ تھا۔ قاسم بائیک ایک طرف کھڑی کر کے ان کے قریب آیا۔ نوید نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا جسے اس نے تھامنا گوارا نہ کیا۔ اسے شدید ہتک محسوس ہوئی۔
''تم سب کیا گھر سے فارغ ہو جو یہاں مجمع لگا کر بیٹھے ہو؟'' اس کا تحکم بھرا انداز نوید کو سلگا گیا۔
''اچھا پھر ملتے ہیں۔'' نوید نے اسے ایک غصے بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے اپنے دوست سے الوداعی کلمات کہے۔
''کون کس سے پھر ملے گا؟ تم آج کے بعد ان لفنگوں سے نہیں ملو گے۔ کان کھول کر سن لو۔'' اس کا لہجہ بے حد سخت تھا، فاروق کو شدید غصہ آیا۔
''آپ اسے لینے آئے ہیں اسے لے کر جائیں۔ ہمارے بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں آپ کو۔'' اس کا بس نہ چلتا تھا کہ سامنے کھڑے اس بجے کٹے بندے کو زوردار چماٹ لگا دے۔
''میں تو کروں گا بات۔ کیا کر لو گے؟'' وہ پھر کر آگے بڑھا۔ نوید ایک دم درمیان میں آ گیا اور اسے پیچھے دھکیلا۔
''گھر چلیں۔'' اس نے فاروق کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ گھر سے محض چند سیکنڈز کے فاصلے پر تھے تب قاسم نے منہ کھولا۔
''ساری غلطی چاچی کی ہے۔ تم لوگوں کی تربیت بھی نہیں کر سکیں۔ کرتی کیا ہیں سارا دن؟'' وہی جملے جو اس کے باپ کے منہ سے ادا ہوتے تھے۔ وہ کھول گیا۔
''قاسم بھائی اپنے کام سے کام رکھیں۔ میری ماں کے بارے میں بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ چلا کر بولا۔
''بکواس؟ اس کا مطلب ہے کہ تمہارا باپ بھی بکواس کرتا ہے؟'' اتنا سننا تھا کہ ابھی اس نے چابی بھی نہیں نکالی تھی وہ اس پر پل پڑا اور پھر یہ سارا تماشا ہوا۔
نوید نے سر جھکائے ساری بات سنائی۔ ماجدہ قیوم کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔ مگر وہ نہ ان سے نظریں ملاتے تھے نہ ہی کچھ کہتے تھے۔ حتیٰ کہ اس قصے کی خبر پورے خاندان میں پھیل گئی۔ ہزار طرح کی باتیں ہوئیں۔ ریشماں آئیں اور شادی کی تاریخ مانگنے لگیں۔ مگر قیوم نے رشتہ توڑ دیا۔ ماہرہ کو یوں لگا جیسے کوئی معجزہ ہو گیا ہو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ سارے خاندان والے دباؤ ڈالنے لگے، غلطی بھی تمہاری رشتہ بھی تم توڑ دو۔ ارے رشتہ تو قاسم کو ختم کرنا چاہیے تھا۔ ریشماں بپھر گئی تھیں مگر قیوم اپنی بات پر ڈٹ گئے۔

☆☆☆

مدثر کے دماغ میں اس کی درد بھری آوازیں گونجتی رہتیں۔ ایک دن اس نے نوید کو پکڑ لیا۔
''آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیوں ماں باپ کو ستا رکھا ہے؟'' اس قصے کے اثر میں کچھ دن وہ سیدھا رہا تھا مگر پھر کچھ دن بعد ہی پرانی روش پر آ گیا۔
''میں گاڑیاں چلانا چاہتا ہوں۔ یہ دیکھیں کتنی تصویریں جمع کر رکھی ہیں۔'' اس نے جھٹ سے موبائل نکال کر اس کے سامنے کیا جس میں گاڑیوں

کے دنیا جہان کے ماڈلز کی تصویریں موجود تھیں اور موبائل فونز کی بھی۔

"تو بیٹا بنا محنت کیے تو یہ سب حاصل نہیں ہوتا۔" اس نے ابھی لیکچر شروع کیا ہی تھا کہ نوید کا منہ بننے لگا۔

"اچھا ایک کام کرتے ہیں؟ میرا گاڑیوں کا شو روم ہے۔ پہلے چھوٹا سا تھا اب بڑا ہو گیا ہے۔ تم وہاں کام کرو گے؟" نوید نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پھر اس کے حلیے کو۔ مدثر ہنس پڑا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا گھر دیکھنے چلو گے؟" اس نے زور و شور سے اثبات میں سر ہلایا۔ نوید کا بس ایک مسئلہ تھا کہ اس کی بات سنی، ان سنی اور مانی جائے۔ نہ بھی مانیں لیکن جواب میں گالیوں سے تواضع نہ ہو۔ ماں کوشش بھی کرتی لیکن پھر بھی وہ سیدھا نہیں ہوتا تھا۔ جو وہ چاہتا تھا ماجدہ اسے نہیں خرید کر دے سکتی تھیں۔ وہ گھر آیا۔

"اماں یہ مدثر بھائی ہیں نا۔ آج میں ان کا گھر دیکھ کر آیا ہوں، فرنیچر رکھوا رہے تھے۔ اتنا حسین، یہ دیکھیں تصویریں۔" ماہرہ بھی اشتیاق میں ایک دم جھکی اس کی بھی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"شکل سے تو نہیں لگتا کہ اتنا حسین گھر اس کا ہوگا۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔

"پہلے مجھے بھی نہیں لگتا تھا لیکن کل میں نے جب اسے غور سے دیکھا تو امیری والی چمک دکھائی دی تھی۔" وہ چڑانے والے انداز میں بولا تو سب ہنسنے لگے۔

"اماں! بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ مجھے اپنے ساتھ شوروم میں کام دیں گے۔ تم ابا سے بات کرو۔"

"تم نے شکل دیکھی ہے اپنی؟ وہ تم جیسے جاہل جنگلی کو شوروم میں نوکری دے گا؟" وہ غصے سے بولیں۔

"اماں اوے بھی سکتا ہے۔ جھاڑو لگانے کے لیے بھی کوئی چاہیے ہوگا کہ نہیں۔" نادرہ نے لقمہ دیا اور پھر دونوں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ نوید کو غصہ آگیا۔

قصہ مختصر کہ مدثر نے قیوم سے بات کر کے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا جہاں وہ اسے روزانہ دو گھنٹے پڑھاتے بھی لگا۔ نوید نے اسے سخت پریشان کیا لیکن ڈرائیونگ سکھانے کا لالچ دے کر وہ اسے پڑھانے میں کامیاب ہونے لگا۔ مدثر کے ساتھ گھر واپس آتا، سارے دن کی محنت کے بعد تھکن سے باہر جا کر دوستوں میں بیٹھنے کا وقت نہیں رہتا تھا اس کے پاس۔ باپ کو اس سے شکایتیں کم ہو گئیں۔ پھر مدثر کے اثر انگیز لیکچرز نے بھی اس کی شخصیت میں کافی تبدیلیاں پیدا کی تھیں، وہ اس کا دوست بن گیا تھا اور نوید کو صرف نئی ساتھیوں کی ہی باتیں سمجھ میں آیا کرتی تھیں۔ نئے گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے ریحانہ نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ جسے انہوں نے قبول کر لیا۔

☆☆☆

قیوم اب گھر میں کوئی جھگڑا نہ کرتے۔ لیکن ایک عجیب سی خاموشی تھی جو پھیلی رہتی ایک سکوت۔ نوید کے رویے میں بھی کافی مثبت تبدیلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دن رات مدثر کو دعائیں دیتیں۔ ریحانہ کی جگہ نئے کرائے دار آچکے تھے۔ ریحانہ نے بہت اصرار سے انہیں نئے گھر کی دعوت دی تھی جسے ماجدہ نے قبول کر لیا۔

شام ہونے والی تھی۔ ریحانہ کے گھر افطاری اور رات کے کھانے کی دعوت تھی۔ ماجدہ نہا کر آئیں، اپنے لمبے بالوں کو سلجھانے لگیں۔۔ قیوم سامنے بیٹھے تھے۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" لیکن ماجدہ نے کوئی رسپانس نہیں دیا اس جملے کے بعد ان دونوں کو ہی چپ لگ گئی۔ انہوں نے بال سمیٹے، آنکھوں میں کاجل بھر کر آویزے لٹکائے، قیوم ایک ٹک اسے دیکھنے لگے۔ وہ پاس سے گزرنے لگیں تو انہوں نے ماجدہ کا ہاتھ تھام لیا۔ ماجدہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ "معاف کر دو مجھے۔"

"کتنی بار معاف کروں؟" وہ تھکن زدہ آواز میں بولیں۔ "اب تو قاسم نے بھی مجھے میری ناکارہ تربیت کا طعنہ دے مارا۔" اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ قیوم کو شدید شرمندگی تھی۔

"آج کے بعد میں کوئی بھی بری بات نہیں کروں گا بس آخری بار معاف کر دو۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ دونوں رونے لگے۔ کچھ دیر بعد دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو انہوں نے آنکھیں صاف کیں۔

"اٹھو کر تیار ہو جاؤ۔ بچیاں بھی تیار ہو گئی ہوں گی۔ پھر نکلتے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولیں۔ قیوم نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہاں پہنچ کر وہ حیران رہ گئی اتنا حسین گھر، بالکل اس کے خوابوں جیسا۔ مگر وہ اچھی طرح دیکھ نہیں پائی اس ڈر سے کہ وہ اسے ندیدی نہ سمجھ لے۔ دعوت میں کافی اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد سب باتیں کرنے لگے تو وہ اٹھ کر لان میں آگئی۔ نو بجے کا وقت تھا۔ اس نے آج سے پہلے رات کے وقت لان کی نرم گھاس پر چلتے ہوئے بڑھا ہی تھا محسوس آج کر رہی تھی۔ اسے اپنے تلوؤں میں گدگدی سی محسوس ہوئی، کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"ہنستی رہا کرو، اچھی لگتی ہو۔" مدثر کی آواز پر وہ پہلے چونکی لیکن اسے ایک دم غصہ بھی آگیا۔

"اے مسٹر! اگر ہم آپ کے گھر دعوت کھانے آہی گئے ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ پھیل جائیں۔" وہ بگڑ کر بولی اور اندر جانے لگی۔

"پلیز ابھی اندر مت جائیں۔ اندر میرے اور آپ کے رشتے کی بات ہو رہی ہے۔" وہ منہ کھولے اسے دیکھنے لگی۔

"اتنی حیران مت ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ جیسی چڑیل لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا بے حد مشکل کام ہے لیکن اس بات کی بھی امید ہے کہ میں آپ کا دل اپنی محبت سے اتنا بھر دوں گا کہ آپ انگارے اگلنا بھول جائیں گی اور صرف پیار کی بولی بولیں گی۔" وہ شرافت سے بولا۔ ماہرہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی۔

"میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔ آج سے نہیں کافی عرصے سے۔ تب سے جب آپ صبح، صبح کسی چمارن کی طرح گلی میں جھاڑو لگایا کرتی تھیں اور نوید کو گالیوں سے نوازتی تھیں۔" اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا، وہ اتنی شاک تھی کہ چڑیل اور چمارن کے الفاظ پر بھی اس نے غور نہیں کیا تھا۔ مدثر اس کے قریب آیا اور سنجیدہ ہو گیا۔

"میں نے اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات کو برداشت کیا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے خودکشی کی کوشش کی لیکن پھر میری ماں نے میری ہمت بندھائی اور آج میں اس مقام پر ہوں۔ وہ بھائی جس نے مجھے گھر سے دھکے دے کر نکالا تھا آج فون کر کے معافیاں مانگتا ہے، میرے معاف کر دینے کے باوجود۔ میں نے حالات اور واقعات سے صرف ایک بات سیکھی ہے وہ یہ کہ حالات کی تلخی کو لہجے اور وجود میں نہیں گھولنا چاہیے اور نہ اپنے اندر کا غصہ کبھی ان پر انڈیلنا چاہیے جو کسی بھی اعتبار سے آپ سے کمزور ہوں۔" وہ سمجھ گئی کہ اس کا اشارہ کس طرف ہے اور بے اختیار ہی سر جھک گیا۔ وہ اس کے غیر متوازن رویے کی طرف کتنی نرمی سے اشارہ کر رہا تھا کہ وہ نہ صرف سمجھ بھی گئی بلکہ شرمندہ بھی ہوئی۔

"میں ایک نئی زندگی شروع کر رہا ہوں اور مجھے اس نئی زندگی میں تمہارا ساتھ درکار ہے۔ صرف تمہارا۔ بولو ساتھ دو گی؟" ماہرہ ہونق بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ مدثر کو حقیقی دنیا میں آنا پڑا۔

"تم تو ماں باپ کے اقرار کے آگے ہی سر جھکاؤ گی نا۔" اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا وہ مسکرا اٹھا۔

"تو اس کا مطلب ہے کہ ہماری شادی پکی۔" ماہرہ کچھ نہ بولی۔ سر جھکا کر رہ گئی۔ وہ مسکرا کر اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہمارے اس نئے آشیانے میں صرف محبت کے گیت گائے جائیں گے، ہے نا؟" اس نے شرماتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا تو مدثر کو لگا چاروں طرف پھول کھل گئے ہوں۔



ایسی ہمت نہ اب عطا کیجیے
جو کہے، جائیے خطا کیجیے

گر نباہیں گے تو، ملا کیجیے
راہ ورنہ یہیں جدا کیجیے

اس کو منزل نہیں کہا کرتے
روز جس کو بدل لیا کیجیے

موسمی سے نہیں محبت یہ
کیجیے گر تو پھر سدا کیجیے

بے وفا لاکھ ہو زمانہ اب
آپ کا کام ہے وفا کیجیے

سر پٹختا ہے لفظ لفظ مرا
اب نہ سمجھے کوئی تو کیا کیجیے

لوگ کرتے ہیں دل لگی ابرک
آپ یوں ہی نہ مر مٹا کیجیے

اتباف ابرک

بے نام سا یہ درد ٹھہر کیوں نہیں جاتا
جو بیت گیا ہے وہ گزر کیوں نہیں جاتا

سب کچھ تو ہے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں نگاہیں
کیا بات ہے میں وقت پہ گھر کیوں نہیں جاتا

وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہاں میں
جو دور ہے وہ دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

میں اپنی ہی الجھی ہوئی راہوں کا تماشا
جاتے ہیں جدھر سب، میں ادھر کیوں نہیں جاتا

وہ خواب جو برسوں سے نہ چہرہ نہ بدن ہے
وہ خواب ہواؤں میں بکھر کیوں نہیں جاتا

ندا فاضلی



وہ جو ایک شخص مجھے طعنہ جاں دیتا ہے
مرنے لگتا ہوں تو مرنے بھی کہاں دیتا ہے

تیری شرطوں پہ ہی کرنا ہے اگر تجھ کو قبول
یہ سہولت تو مجھے سارا جہاں دیتا ہے

تم جسے آگ کا تریاق سمجھ لیتے ہو
ویسے لگ جائے تو پانی بھی دھواں دیتا ہے

جم کے چلتا ہوں زمیں پر جو میں آسانی سے
یہ ہنر مجھ کو مرا بار گراں دیتا ہے

ہاں اگر پیاس کا ڈھنڈورا نہ پیٹا جائے
پھر تو پیاسے کو بھی، آواز کنواں دیتا ہے

اظہر فراغ

گماں

فضا میں عجیب سی ہے سوگواری
گلوں میں رنگ و بو کہاں ہے
اجاڑ جنگل، ٹھٹھرتی چڑیا کا
آشیاں بھی لٹ گیا ہے
کہیں مسافر بچھڑ گئے ہیں
کہیں پہ آہٹ کا گماں ہے
ٹھٹھرتی صبحیں، اداس شامیں
یوں ہی بے وجہ سی اداسیاں ہیں
یوں ہی سرد پھولوں کو بند مٹھی میں مسلتے
لگا دسمبر کا گماں ہے

پونا عشرت مرالی

اُف یہ عورتیں

میرے پاس بیٹھی عورت مشہور لوگوں سے اپنی جان پہچان سے متعلق لمبی لمبی ــــ ہانک رہی تھی۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ ''کیا تم ڈاکٹر عبدالقدیر کو جانتی ہو؟''

اس نے شانِ بے نیازی سے کہا۔ ''یہ بھی تم نے خوب کہی۔ جب میں بیمار ہوتی ہوں تو ان ہی سے تو دوا لاتی ہوں۔''

نیا انتخابی نعرہ

جب کوئی کسی کو الو کہے تو اس پر غصہ کرتا ہے یا اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ الو کو سمجھتا کیا ہے؟

ہمارے گوجرانوالہ کے حاجی گلو، جب الیکشن میں کھڑے ہوئے تو مخالفین نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ''ایک الو سو گلو۔''

حاجی صاحب کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے جا کر انہیں گھیر لیا۔ قبل اس کے کہ وہ ان کی ٹھکائی شروع کرتے، ایک صاحب بولے۔ ''حاجی صاحب! آپ بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں، دراصل ہم تو آپ کی عقل مندی کی تعریف کر رہے ہیں۔ امریکا میں الو عقل و دانش کی علامت ہے۔ وہاں لائبریریوں کے باہر بھی الو کی تصویر لگی ہوتی ہے۔''

حاجی صاحب یہ سن کر بولے۔ ''تو پھر یہ نعرہ لگاؤنا ــــ سو الو، ایک گلو۔''

کرکٹ فوبیا

ایک صاحب کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ لوگ افسوس کرتے آ رہے تھے۔ اس دن انڈیا اور پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ کا فائنل ہو رہا تھا۔ صاحب میچ کے بے حد شیدا تھے میچ بھی دیکھتے جاتے اور تعزیت کرنے والوں کے درمیان بھی آ کر بیٹھ جاتے۔ میچ ختم ہو گیا۔ اور پاکستان ہار گیا۔ اتنے میں ان صاحب کے ایک پرانے دوست تعزیت کے لیے آگے بڑھے۔ ''یار بڑا افسوس ہوا، اللہ کی جو مرضی، بندہ کیا کر سکتا ہے۔''

صاحب جو کہ میچ ہارنے کے سوگ میں تھے۔ بھڑک کر بولے۔ ''سب کی بھگت ہوتی ہے۔ پیسے لگے ہوتے ہیں۔ کمبخت ٹیم ہی ایسی بھیجتے ہیں، تم افسوس کی بات کرتے ہو میرا دل چاہ رہا ہے کہ دیوار پر سر دے ماروں۔''

فریاد

فیلڈنگ کے دوران ایک کھلاڑی بار بار امپائر کے قریب آ کر کھڑا ہو جاتا اور تقریباً ہر گیند پر جو بیٹسمین سے مس ہو جاتی، ایل بی ڈبلیو کی اپیل کرتا۔ مگر اس کی اپیل پر امپائر ٹس سے مس نہ ہوتا۔

اپیلوں کی تعداد جب حد سے زیادہ شدت اختیار کر گئی تو امپائر پلٹ کر کھلاڑی کی طرف متوجہ ہوا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''پچھلے آدھے گھنٹے سے میں تمہاری حرکات دیکھ رہا ہوں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' کھلاڑی نے ذرا سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آخر آپ کھیل کیوں نہیں دیکھتے؟''

کرارا جواب

بیوی سے بیزار شوہر نے اپنی ساس کو ایس ایم ایس بھیجا۔ آپ کی پروڈکٹ میری ریکوائرمنٹ کے مطابق نہیں۔ اس کی پرفارمنس صحیح نہیں ہے۔ میں اسے لوٹا رہا ہوں اور تبدیلی کی ڈیمانڈ کرتا ہوں۔ آپ کی یہ چیز واپس کرنا چاہتا ہوں۔''

اسمارٹ ساس نے ریپلائی کیا۔ ''وارنٹی ختم ہو گئی ہے۔ ری پلیسمنٹ یا ریفنڈ کی کوئی پالیسی نہیں، برائے مہربانی پروڈکٹ کی پرفارمنس کو بہتر کرنے کے لیے روز بالوں سے پکڑ کر دھلائی کریں اور ویسے بھی کمپنی اب نیا سامان بھی نہیں بنا رہی۔ شکریہ۔''

شکایت

ایک جانے پہچانے تاجر نے پوسٹ آفس فون کیا۔ ''کچھ عرصہ سے مجھے نہایت دھمکی آمیز خطوط موصول ہوتے ہیں، کیا آپ یہ سلسلہ بند کرانے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں! کوئی اندازہ ہے کہ خطوط کہاں سے آتے ہیں؟'' پوسٹ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

''جی ــــ ہاں ــــ انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ سے۔'' تاجر نے جواب دیا۔

ایمانداری

ایک کاروباری آدمی تجارت میں ایمانداری کی اہمیت کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا۔ ''کل ہی کی بات ہے کہ مجھے ایک گاہک نے ادائیگی کے لیے سو ڈالر کا نوٹ دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دیکھا تو وہ چپکے ہوئے دو نوٹ تھے۔ بس وہیں ایمانداری کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔''

''میں رات بھر سوچتا رہا کہ اپنے پارٹنر کو یہ بات بتاؤں یا پوری رقم خود ہضم کر جاؤں۔''

ایک سے بڑھ کر ایک

سینما میں فلم شروع ہو چکی تھی، میرے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی دو خواتین مسلسل باتیں کیے جا رہی تھیں، جس کی وجہ سے دوسرے لوگ ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''اس بار ویک اینڈ پر ہم مرزا جی کے گھر گئے تھے۔'' اسی وقت فلم میں ہیروئن نے ہیرو کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا چنانچہ دونوں خواتین گفتگو چھوڑ کر فلم دیکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

منظر ختم ہوا تو اسی خاتون نے بات کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کی غرض سے کہا۔ ''ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟''

''اس بار ویک اینڈ پر مرزا جی کے گھر گئی تھیں۔'' پچھلی سیٹ سے ایک آواز آئی۔

اس کے بعد سب نے سکون سے فلم دیکھی۔

وجہ پریشانی

ایک صاحب اپنے دوست سے ملنے ان کے دفتر گئے۔ ابھی میزبان نے ان کے لیے چائے منگوائی ہی تھی کہ بارش شروع ہو گئی۔ مہمان بڑے مضطرب نظر آنے لگے۔ میزبان کے کچھ پلے نہ پڑا کہ بارش شروع ہونے سے مہمان اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟

انہوں نے وجہ پوچھی تو مہمان نے کہا۔ ''آپ کی بھابی صدر گئی ہوئی ہیں اور بارش شروع ہو گئی ہے۔''

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ بارش سے بچنے کے لیے وہ کسی نہ کسی شاپنگ مال میں چلی جائیں گی۔'' میزبان نے کہا۔

''یہی تو پریشانی کی بات ہے۔'' مہمان نے جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

نقصان

''کیا بات ہے آج سیٹھ سرکار بھائی اتنے اداس اداس کیوں ہیں؟''

''صدمہ ہی ایسا پہنچا ہے، کوئی چھوٹے دل والا ہوتا تو شاید اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ انتقال پر تو صبر آ جاتا ہے، ہمارے سرکار بھائی کو تو پانچ لاکھ روپے کا نقصان ہو گیا ہے؟''

''پانچ لاکھ کا نقصان ــــ کس کاروبار میں؟''

''سیٹھ سرکار بھائی نے جو کپڑے کی مل قائم کی تھی اس کے بارے میں تخمینہ لگایا گیا تھا کہ دس لاکھ روپے کا نفع ہو گا لیکن صرف پانچ لاکھ روپے کا نفع ہوا ہے۔ اب آپ ہی بتائیے۔ ہے نا دل ٹوٹ جانے والی بات؟''

☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبیداللہ بن محصن انصاری خطمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص تم میں سے اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنے گھر یا قوم میں امن سے ہو، جسمانی لحاظ سے تندرست ہو اور ایک دن کی خوراک اس کے پاس موجود ہو تو گویا اس کے لیے دنیا اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ جمع کر دی گئی۔"
(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے یہ حدیث حسن ہے)

فوائد و مسائل:۔
1۔ امن اور صحت کے ساتھ ایک دن کی خوراک اتنی بڑی نعمت ہے گویا اسے ایسی آسودگی حاصل ہو گئی جیسی کسی کو ساری دنیا مل جانے پر حاصل ہو سکتی ہے۔
2۔ اس میں بالواسطہ نصیحت بھی ہے کہ انسان کو سلطنت کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے بلکہ صبر و قناعت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، اسی میں راحت ہے۔

فضلِ ربی،

حضرت ایوبؑ نے کہا۔
"الٰہی! تو نے بہت سی آفتیں مجھ پر نازل کیں۔ ہمیشہ میں تیری رضا پر راضی رہا اور کبھی بے قراری کا اظہار نہیں کیا اور تیری مراد کے مقابل اپنی خواہش ذرہ برابر میں نے اختیار نہیں کی۔"
تب ابر کا ایک ٹکڑا آیا اور اس کے اندر سے ندا آئی۔
"اس ایک آواز میں ہزار ۔ آوازیں ہیں کہ اے ایوب (علیہ السلام) تم یہ صبر کہاں سے لائے تھے؟"
ایوبؑ سمجھ گئے اور سر پر خاک ڈالنے لگے۔
"یا رب العالمین! میرا صبر تیرے ہی فضل سے ہے۔ میں نے جو کچھ کہا اس سے توبہ کرتا ہوں۔"

دیانت داری،

نقل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ایک پتھر سر کے نیچے رکھ کر سو گئے۔ ابلیس آپ کے پاس آیا اور بولا۔
"آپ نے تو دنیا ترک کر دی تھی۔ اب آپ اس سے کیوں باز آ گئے؟"
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "میں نے کیا کیا؟"
اس نے کہا "آپ پتھر سر کے نیچے رکھ کر آرام جو کر رہے ہیں۔"
یہ سنتے ہی حضرت عیسیٰؑ نے اس پتھر کو پھینک دیا اور فرمایا۔
"لے مجھے اتنی دنیاداری سے بھی سروکار نہیں ہے۔"

لفظ لفظ معطر،

٭ عاقل کا سینہ رازوں کا صندوق ہوتا ہے۔
(حضرت علیؓ)
٭ بہت سے مقامات پر خاموشی بہترین مددگار ہے۔ اگرچہ تم بہترین بولنے والے ہی کیوں نہ ہو۔
(امام حسنؑ)
٭ اللہ دنیا اپنے دوست اور دشمن دونوں کو دیتا ہے مگر دین صرف دوستوں کو دیتا ہے۔
(امام محمد باقرؑ)
٭ کثرت دعا، تھوڑی گفتگو، کم سونا، اللہ تعالیٰ

کو بہت پسند ہے۔
(امام جعفر صادقؑ)
فضہ سونیا بخاری، عاصمہ بخاری۔ لاہور

الف اللہ،

اللہ کا نام اعلا طریقے پر لیا جائے یا ادنیٰ طور پر، اپنا اثر ضرور رکھتا ہے۔ دنیا میں بعض اشیا ایسی ہیں کہ ان کا نام لینے سے ہی منہ میں پانی بھر جاتا ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کا نام لیا جائے، اس میں اثر نہ ہو۔ خود خالی نام میں بھی برکت ہے۔
خواہ پوری توجہ سے لیا جائے یا کم توجہ سے۔
(اقتباس۔ شہاب نامہ)

سلام،

سلام کرنے سے تین برائیوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔
اکتاہٹ، گناہ، غربت۔"
حنا سلیم اعوان۔ گاؤں آخون باندی ہری پور

پسندیدہ صدقہ،

اللہ تعالیٰ کو یہ صدقہ بہت پسند ہے کہ جب برادرانہ تعلقات ٹوٹ رہے ہوں تو کوشش کر کے ان میں صلح کرا دی جائے اور ان تعلقات کو ٹوٹنے سے بچا لیا جائے۔
(حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام)

چند باتیں آپ کے لیے،

○ آنکھ والا وہ ہے جو اپنے آپ کو دیکھے۔
(کنفیوشس)
○ خاموشی اظہارِ نفرت کا بہترین طریقہ ہے۔
(برنارڈ شا)
○ اچھی سیرت برائیوں سے بچنے کا نام نہیں بلکہ ذہن میں برائی نہ کرنے کی خواہش پیدا ہونے کا نام ہے۔
(برنارڈ شا)

اللہ سے تجارت،

جب تم دنیا کی مفلسی سے تنگ آ جاؤ اور
کا کوئی راستہ نہ نکلے تو صدقہ دے کر اللہ سے
کر لیا کرو۔
(حضرت علیؓ)
سمیرا ظفر اقبال

کھوٹا کھرا،

شیخ نظام الدین اولیاء نے اپنے ایک م
عثمان خیر آبادی کا ذکر کیا۔ وہ معلم تھا اور قرآن
کا مفسر بھی۔ آپ نے فرمایا۔
"وہ بہت بزرگ آدمی تھا۔ اس نے ایک
بھی تیار کی تھی۔ وہ شلغم اور چقندر کی سبزی پکا کر
اسے فروخت کیا کرتا۔ اگر کوئی شخص اسے کھوٹا
دے جاتا تو وہ دیدہ و دانستہ اسے رکھ لیتا۔ لوگ
اسے کھوٹے کھرے کی تمیز نہیں ہے۔ بہت سے
کھوٹے پیسے لا کر اس سے بدل کر لے جاتے
وہ فوت ہونے لگا تو آسمان کی طرف منہ کر
نے کہا۔
"اے پروردگار عالم! تو اچھی طرح جانتا ہے
لوگ مجھے کھوٹے پیسے دے جایا کرتے تھے۔ م
قبول کرتا اور کبھی نہیں لوٹاتا تھا۔ اگر مجھ سے کو
طاعت ہوئی ہے تو اپنے فضل و کرم سے رد نہ
(آپ بیتیوں کے بعض نمایاں پہلو۔ از پ
علم الدین سالک۔ نقوش آپ بیتی نمبر جلد اول

شیر پر سواری،

طالقان کے علاقے کا رہنے والا ایک آدمی
شیخ ابوالحسن خرقانیؒ کی زیارت کا بے حد شوق
آخر ایک دن شوق زیارت نے اس کو
کر دیا۔ اس نے سامان سفر باندھ لیا
پر صعوبت سفر کے بعد آخر کار منزل مقصود
گیا۔ شہر خرقان میں آ کر اس نے شیخ ابوالحسن
گھر کا پتا دریافت کیا۔ وہاں جا کر نہایت ادب

ساتھ دروازے کی زنجیر ہلائی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک عورت نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "میں حضرت شیخ ابوالحسنؒ کی قدم بوسی کے لیے شہر طالقان سے حاضر ہوا ہوں۔"

اس عورت نے کہا۔ "واہ میاں درویش! معلوم ہوتا ہے تمہارے دھوپ میں اپنی داڑھی سفید کی ہے۔ تیری عقل و دانش پر سلام۔ کیا تجھے اپنے وطن میں کوئی کام دھندا نہ تھا؟"

عقیدت مند یہ ماجرا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے۔ تاہم اس نے ہمت کر کے کہا۔

"حقیقت حال کچھ بھی ہو، یہ تو بتلائیے کہ شیخ صاحب ہیں کہاں؟"

عورت نے جواب دیا۔ "ارے کہاں کا شیخ اور شاہ بن گیا! اس نے تو دھوکے کا جال پھیلا رکھا ہے، اپنے پاؤں واپس چلا جا، ورنہ اس دغاباز کے چکر میں پھنس کر یہ عمر کا ہے گنوانا دنیا کا۔ بھلا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کا بھی طریقہ تھا؟ اس جیسے لوگوں نے تو تقویٰ اور احکام شریعت کو بس پشت ڈال دیا ہے۔ آج تو ایک عمر رسیدہ کی ضرورت ہے جو شخص ان لوگوں کا احتساب کرے۔"

اب تو شیخ کے معتقد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔

"چراغ تلے اندھیرا بی بی! چاند پر تھوکنے والا اپنے ہی منہ پر تھوکتا ہے۔ سورج پر لاکھ پھونکیں مارو وہ کبھی نہیں بجھ سکتا۔"

غرض درویش کی اہلیہ کو ایسی کھری کھری سنائیں کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

وہ آدمی وہاں سے نکل کر لوگوں سے شیخ کا پتا پوچھنے لگا۔ کسی نے بتایا کہ جنگل کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہ شیخ کی تلاش میں جنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں شیطان نے اس کے دل میں وسوسے ڈالنے شروع کر دیے "سمجھ میں نہیں آتا آخر شیخ صاحب نے ایسی بے ہودہ، بدتمیز اور زبان دراز عورت کو اپنے گھر میں کیوں رکھا ہے۔ عجیب معاملہ ہے۔" وہ انہی خیالات کی دنیا میں گم تھا کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو شیر کی پیٹھ پر اس شان سے سوار تھا کہ پیچھے لکڑیوں کا گٹھا لدا ہوا ہے اور ہاتھ میں سیاہ سانپ کا کوڑا ہے۔

عقیدت مند سمجھ گیا کہ یہی حضرت شیخ ابوالحسن خرقانیؒ ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ عرض کرتا۔ شیخ نے دور سے ہی مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"عزیزم! اپنے فریبی نفس کی باتوں میں نہ آ اور ان پر دھیان نہ دے۔ ہمارا اکیلا پن اور جوڑا ہونا نفس کی خواہش کے لیے نہیں ہے۔ اللہ عزوجل کے حکم کی تعمیل کے لیے ہم اس جیسے سینکڑوں بے وقوفوں کا بوجھ برداشت کرتے ہیں۔ یہ جو شیر ہے تو یہ کچھ بھی بدخو ساتھی سے بنائے گئے۔ نیکی کا بار بھی خوشی برداشت کر اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ بلند مقام اپنی بیوی کی بدزبانی پر صبر کرنے کی وجہ سے عطا فرمایا ہے۔"

درس حیات: انسان کو ہر حال میں راضی برضائے الٰہی رہنا چاہیے اور صبر و شکر سے کام لینا چاہیے۔ صبر کرنے سے ہی اعلیٰ مقامات پر عرفان حاصل ہوتے ہیں۔

(حکایات رومی سے انتخاب)

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

تبسم بشیر حسین — ڈسکہ

دل میں درد اور ہونٹوں پر مسکان
ہم بھی دنیا کو کیسے دغا دیتے ہیں
انہیں نہ جانے کیا دشمنی ہے مجھ سے
جو مجھے جینے کی دعا دیتے ہیں

ریحانہ چوہدری — مدوکے

دھوپ میں سایہ بے تنہا کھڑے ہوتے ہیں
بڑے لوگوں کے خسارے بھی بڑے ہوتے ہیں

نمرا کرم — گاؤں گورالی

مختصر ہوتی شب سیاہ اور وہ بھی طویل تر
محن ہجر کے ماروں پہ قیامت ہے دسمبر

ندا، نغمہ — کراچی

یوں بھی گرتے نہیں برگ شجر سے
بچھڑ گیا تھا کوئی ہم سفر دسمبر میں

سحر سہیل — کراچی

نت نئے شہر، نت نئی دنیا
ہم کو آوارگی سے پیار رہا
ان کے آنے کے بعد بھی جالب
دیر تک ان کا انتظار رہا

مقدس زہرہ — جھنگ

شہر یاروں کا عدالت سے تعلق ہے، آج
بے گناہوں کو بھی سزا دی جائے
اور بھر بتائیں گے کبھی کہ حقیقت کیا ہے
اب مناسب ہے فضاؤں کو ہوا دی جائے

ثریا گل — پاکستان

بچھڑتے لمحے بڑی دیر تک وہ رویا تھا
وہ اس سے بڑھ کر میرا اعتراف کیا کرتا
یہاں تو لوگ میں ملتے ہیں تو ابھی گئی
وہ ساری عمر ہی میرا طواف کیا کرتا

فائزہ بھٹی

جن کا ملنا قسمت میں نہیں ہو
ان سے محبت کمال کی ہوتی ہے

فوزیہ ثمر بٹ

مجھے آزردئے تحریر بھی یوں ہی رات بھر
نہ بکھر سکا نہ سمٹ سکا یوں ہی رات بھر
یہ بہت عذاب اور اکیلے ہم شب غم بھی
رہی زندگی بھی سراب اور رہی آنکھ بھی تر

عمیرا اکرم

احوال غم ذات سناتے رہا
اب خود کو تماشا بناتے رہا
ہر بار میں تذلیل اٹھا کر نہیں
ہر بار اسے جا کے مناتے رہا

فوزیہ ثمر بٹ

چلو کائنات بانٹ لیتے ہیں
تم میرے باقی سب کچھ تمہارا

آمنہ گڑیا

وہ ملا کو صدیوں کے بعد بھی میرے لب پہ کوئی
اسے میری چپ نے رلا دیا جسے گفتگو میں

مقدس ریاض

تیری تصویر کو سینے سے لگا کر رو
ہم تصور میں تجھے پاس بٹھا کے
تجھ کو سو بار پکارا شب تنہائی
اور ہر بار تجھے پاس نہ پا کر رو

صدرا ناصر

غور کر اس عزیب کی خوش
کتنے صدموں سے مر گئی اول
جن کو پیمان دوستی دے
تیری آنکھیں مگر گئی اول

خط آپ کے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ قارئین کو نیا سال مبارک۔

ہماری کچھ بہنیں ہمیں خط لکھتی ہیں یا کوئی تحریر بھجواتی ہیں تو اس پر اپنا نام لکھنا بھول جاتی ہیں۔ آپ ہمیں خط لکھیں تو اپنا اور اپنے شہر کا نام ضرور لکھیں۔

اسی طرح افسانہ یا ناولٹ بھجوائیں تو اس پر اپنا نام پتا یا فون نمبر ضرور لکھیں تاکہ شائع ہونے کی صورت میں آپ سے رابطہ کیا جاسکے۔

اس ماہ ہمیں ایک خط موصول ہوا ہے۔ اس خط میں شعاع پر تفصیلی تبصرہ ہے۔ ساتھ ایک افسانہ بھی ہے۔ افسانے کا عنوان ہے "دست رنگی لمحہ" لیکن انہوں نے خط اور افسانے پر کہیں بھی اپنا نام یا فون نمبر پتا نہیں لکھا۔

اب آپ ہی بتائیں کہ ہم آپ کے خط کا کیا جواب دیں افسانہ قابل اشاعت ہو تو اسے کس کے نام سے شائع کریں۔

ان بہن سے درخواست ہے کہ اپنا نام پتا لکھ کر بھجوائیں۔

پچھلے ماہ بہن شازیہ طارق کا خط شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اپنی معذور بچیوں کا ذکر کیا تھا۔ بہن شازیہ طارق اپنا فون نمبر یا ایڈریس ہمیں بھجوادیں یا ہمیں فون کرلیں۔

ماریہ نذیر بھاگٹانوالہ سے رونق محفل ہیں، لکھا ہے

"فورتھ کلاس میں تھی جب شعاع اور خواتین پڑھنا شروع کیا اور اب ایم ایس سی کرچکی ہوں، خود ہی حساب لگالیں۔"

"خالی آسمان" اور "رہ نورد شوق" بہت بہت اعلا اسٹوریز تھیں۔ مدتوں یاد رہنے والی۔ اور ــــ قسط وار ناول "شام کی حویلی" اور "شہرزاد" بہت بہت اچھے ہیں۔ مستقل سلسلے اور خط ایک ہی لفافے میں ڈال کر بھیج سکتے ہیں نا؟

ج: پیاری ماریہ! آپ کتنے عرصے سے ہمارے ساتھ ہیں، ہم نے پورا حساب کتاب کرلیا اور بہت خوش ہوئے۔ اتنی طویل رفاقت نبھانے کے لیے ہم آپ کے ممنون ہیں اور رب کریم کا شکر بھی ادا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسے محبت کرنے والے قارئین عطا کیے۔

آپ اسی طرح خط لکھیں جیسے لکھا ہے۔ اور ایک ہی لفافے میں تمام سلسلوں کے لیے انتخاب بھجوائیں۔ بس کاغذ ہر سلسلے کے لیے علیحدہ استعمال کریں۔ تمام اسٹاف کو آپ نے نام بہ نام سلام لکھا ہے۔ ان سب کی جانب سے وعلیکم السلام۔

زہرا فنان نے کے پی کے مالاکنڈ سے لکھا ہے

"قلم کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ" اس سلسلے کے صفحے کی طرف آئے تو ایک شعر تھا۔

اپنے مسیحا سے اب کوئی امید نہ رکھ ساغر
وہ تنگ دل ہے اور تیرے زخم کی گہرائی بہت

معذرت کے ساتھ، ہم نے اس کو کہیں کچھ یوں پڑھا تھا۔

اب فراز اپنے مسیحا سے بھی امید نہ رکھ
وہ تنگ دل ہے تیرے زخم میں گہرائی بہت

مگر خیر چھوٹی موٹی غلطیاں تو انسان ہونے کی علامت ہوتی ہیں۔ دیکھ کر اچھا لگ رہا ہے کہ نئی رائٹرز شعاع کا حصہ بنتی جارہی ہیں۔ اس طلسماتی دنیا کا باقاعدہ حصہ بننے کی اپنی سی کوشش کی، لہٰذا خط پوسٹ کرنے کا خیال آیا۔ ہم آپ سے دور، کے پی کے ضلع مالاکنڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم اپنا لکھا ہوا ناول شعاع میں بھیجنا چاہتے ہیں۔

ج: پیاری زہرا! آپ نے ہماری غلطی کی تصحیح کی اور ہماری غلطی کو انسانی صفت کہہ کر کشادہ دلی کا ثبوت بھی دیا اس کے لیے شکریہ۔ خط کی اشاعت سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ آپ کا خط فاصلوں کی نذر نہیں ہوا اور ہم تک پہنچ گیا۔ اب آپ پورے اطمینان سے اپنا ناول بھجوا سکتی ہیں۔

محمودہ اکبر لکھتی ہیں

السلام علیکم! "حمد" اور "نعت" حسب معمول بہترین، "نبی کی باتیں" اس میں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ "چلیں کچھ عہد کرتے ہیں" سمیرا حمید نے بہت اچھا لکھا۔ "شاہی دور کا باورچی خانہ" پڑھ کر بہت ہی مزا آیا۔ بہت شکریہ امت الصبور صاحبہ! میں سوچ نہیں سکتی تھی کہ "شعاع" میں ہمیں اس طرح کا بھی کچھ پڑھنے کو ملے گا۔ اصل میں دو ماہ پہلے میری دوست نے شعاع سے میرا تعارف کروایا کہ اس کو بھی پڑھ کر دیکھیں۔ انہوں نے مجھے ڈیڑھ سال کے پرانے شعاع بھی دیے ہیں۔ میں "تاریخ کے جھروکوں" میں سب مضامین پڑھوں گی۔

"شہرزاد"۔ "شام کی حویلی" دونوں ناولز بہت اچھے ہیں۔ نیت اور "کاسہ ذات" بہت اچھے تھے اور انتہائی سبق آموز تھے۔ "پھول منڈی" بہترین رہا۔ جملے، فقرے مشکل سے تھے مگر بات کو بہت اچھوتے اور اچھے رنگ میں بتایا جاتا ہے۔ یہ بہت کمال کا طریقہ بیان ہے۔ اگر خواتین مصباح کی طرح تھوڑا اپنے اندر توجہ دیں تو یقیناً یہ معاشرہ کچھ وقت میں بدل سکتا ہے۔ بہت دعا اور محتاج دعا......

ج: پیاری محمودہ! آپ کی انفرادیت آپ کی موتیوں جیسے خوب صورت لکھائی ہے جس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ آپ نے پہلی بار شعاع میں شرکت کی ہے۔ اتنی خوب صورت لکھائی کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ دعاؤں کے لیے شکریہ، ہماری دعائیں بھی آپ کے لیے۔

ہدیٰ نور کوٹلی آزاد سے لکھتی ہیں

آج ہی رسالہ آیا ہے اور آج ہی بھاگی جائے گا خط پوسٹ کرانے۔ اس لیے جتنا رسالہ پڑھا ہے اس پر تبصرہ حاضر ہے۔ فرزانہ کھرل صاحبہ مجھے بہت زیادہ پسند ہیں اور ان کی کہانیوں میں اکثر بھرا پرا خاندان اور رشتے دکھائے جاتے ہیں۔ مجھے بہت مزہ آتا ہے پڑھتے ہوئے۔ اب آتے ہیں "شہرزاد" کی طرف "درشہوار" جیسی لڑکیاں جو اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں کرتیں۔ وہ بہت غلط کرتی ہیں۔ مجھے حمزہ بہت برا لگا، شہرزاد جتنا پسند تھا، یہ اتنا ہی عجیب ہے۔ شہرزاد کو اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر کوئی آپ کا اعتبار نہیں کرتا تو ایسی محبت کا اچار ڈالنا ہے۔

"شام کی حویلی میں" ایکسیلنٹ منفرد ناول ہے۔ رخسانہ نگار جب بھی لکھتی ہیں بہت اچھا لکھتی ہیں۔ پچھلے ماہ مجھے "جتائے ملال کر" بہت پسند آیا تھا۔ فرزانہ کھرل کے علاوہ مجھے سائرہ رضا، ایمل رضا، نمرہ احمد، افشین نعیم بہت پسند ہیں۔ آپ لوگ فرحت اشتیاق سے بھی لکھوائیں۔

ج: پیاری ہدیٰ الشعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ رسالہ ملنے کی شکایت ہماری بہت سی قارئین کو ہے۔ ہم کوشش کررہے ہیں کہ رسالہ آپ تک جلد پہنچ جائے اور آپ اس محفل میں شرکت کرسکیں۔

محبتوں میں صرف اعتبار اور اعتماد کی بات نہیں ہوتی۔ محبوب پر اعتماد بھی ہوتا ہے۔ اعتبار بھی۔ بس ایک دھڑکا سا دل کو لگا رہتا ہے کہ کہیں ہماری بہت قیمتی اور عزیز ہستی راستہ نہ بدل جائے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں محبت کو چھوڑنا بھی نہیں چاہیے۔

افشین نعیم کا پارہ دل در اس ماہ شامل ہے۔ ان کا مکمل ناول اس کے علاوہ اس ماہ خواتین ڈائجسٹ میں بھی شامل ہے۔

نمرہ احمد کا ناول ابھی خواتین میں چل رہا ہے۔ اس سے فارغ ہوکر وہ شعاع کے لیے بھی لکھیں گی۔

ارحمنہ شاہین حویلیاں ہزارہ سے شریک محفل ہیں۔ لکھا ہے اس دفعہ خط لکھنے کی وجہ "خط آپ کے" بنا۔ دسمبر 2018ء کے خطوط میں شازیہ طارق صاحبہ کا دکھ۔ تین بیٹیاں معذور ہوں جس ماں کی، اس کا دکھ ہر عورت سمجھ سکتی

ہے۔ میری ان سے درخواست ہے کہ وہ اور ان کے شوہر ہر وقت باوضو رہا کریں اور چلتے پھرتے گھریلو کام کاج کرتے ہوئے درود ابراہیمی کا ورد کرتے رہیں اور اپنی بچیوں پر دم کریں۔ روزانہ دو رکعت صلوٰۃ حاجت پڑھ کر بچیوں کی صحت کے لیے دعا کریں۔ خاص طور پر والد کیونکہ جہاں دین اسلام نے ماں کو رتبہ دیا ہے وہاں باپ کے بارے میں بھی ہے کہ باپ کی دعا اور بددعا بھی رد نہیں ہوتی۔ کمرے میں گانوں کے بجائے صبح کے وقت سورۃ رحمٰن یا یٰسین کی تلاوت لگائیں۔ اللہ پاک معجزہ کرنے والی ذات ہے۔ ان شاء اللہ آپ کی بچیاں بالکل نارمل ہو سکتی ہیں۔ شوہر اور بچیوں کو کھانا پانی دیتے وقت سورۃ شفاء (سورۃ فاتحہ کو کہا جاتا ہے) 7 دفعہ کھانے پانی پر پڑھ کر دیں، آپ پھر اثر دیکھیے گا۔

ایک اور بات اقراء طارق، عاصمہ طارق لوگوں نے اپنے خط میں آپ سے بھانجی کا نام پوچھا کہ کیا رکھا جائے؟ آپ نے ان ناموں میں "تحریم" بھی نام تجویز کیا۔ علماء کرام تحریم نام کی مخالفت کرتے ہیں کہ نہ رکھا جائے۔ ہماری فیملی میں دو بچیوں کے تھے جب سے فتویٰ پڑھا تو نام تبدیل کر دیے۔ تحریم کا مطلب ہے "حرام کی گئی" لہٰذا علماء منع کرتے ہیں۔

آخر میں سمیرا حمید کا "چلو عہد کرتے ہیں" زبردست۔ سمیرا کی اس سوچ کی عکاسی ان کی کہانیوں سے ہوتی ہے۔

ج: پیاری ارجمند! آپ نے ہماری تصحیح کی، تحریم نام رکھنے کی مخالفت کی وجہ بھی بتائی، بہت شکریہ۔

بہن شازیہ طارق تک آپ کی بتائی ہوئی دعائیں بھی پہنچا رہے ہیں، یہ قرآنی دعائیں ہیں۔ یہ دعائیں وہ تمام بہنیں پڑھ سکتی ہیں جن کے گھر میں کوئی بیمار ہو۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ سچ ہے کہ مثبت سوچ رکھی جائے تو انسان خود بھی خوش رہتا ہے اور دوسرے بھی اس سے خوش رہتے ہیں زندگی کی تلخیاں بھی کسی حد تک کم محسوس ہوتی ہیں۔

کمالیہ سے نور چوہدری شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اتنی سردی اور ٹھنڈے موسم میں بے چاری ماڈل بالکل سرسوں کا پھول لگ رہی تھی، وہ بھی مرجھایا ہوا۔ ماتھے پہ اتنا بڑا تلک، یار خدا کا خوف کرو۔ پہلی شعاع "رضیہ آنٹی" اپنے مخصوص انداز میں جلوہ افروز تھیں۔ "حمد و نعت" کوثر آنٹی آپ شاعرہ ہیں (لو جی سالوں آج پتا لگا) آپ کی نعت بہت پیاری تھی، حمد بھی...... "نبی کی باتیں" دوسروں کی عیادت اور اس کا ثواب بہت معلومات افزا ہوتی ہیں۔ "رب تجھ سے ناتا جوڑا" ک... ناز اچھا لکھا ہوا تھا...... "دستک دستک" عائزہ خان دانش تیموری کی بیوی ہیں کیا؟؟؟ اے لو! لاشاری سوری، آپ کو نہیں پڑھا۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" کوثر خالد آپ کے بارے میں جاننے کا بہت شوق تھا۔ "عنیزہ" سمیرا فوشین بہت اچھا سبق دیا آپ نے "ممی ڈیڈی کے بھانجے" یہ بھی سوچ رہی...... "عشق کسی کی ذات نہیں" یہ افسانہ انعم نجف نے لکھا یا قرۃ العین نے لیکن مجھے بہت پسند آیا جیت مل جائے تو کیا ہی بات ہے ورنہ اس کا احساس ہی زندگی کی نوید ہے...... "کاسۂ ذات" اب اللہ ہی جانے یہ ادارے والے نام کیوں گڑبڑ کر دیتے ہیں اب پھر وہی بات یا انعم نے لکھا یا قرۃ العین نے لیکن عادل کا کردار بے حد پسند آیا۔ ہنگی ہے شادے (ہاہا) خالہ...... مولسری کے پھول یار آخر عباد پر بھی قسمت کو رحم آ ہی گیا اور بلقیس سعید کی "پھول منڈی" فرزانہ جی (جی) آپ جب بہترین ہی لکھتی ہیں تو پہیلی کے بچے بھی تھا... سنک تھا۔ آپ کی پہیلی ذرا بھی سمجھ نہیں آئی...... "خط آپ کے" فائزہ بھٹی بھتیجی کی مبارک باد قبول کرو۔ ثمرین اشفاق شہزاد کے بارے میں جو آپ کے خیالات ہیں میرے بھی بالکل وہی ہیں۔ مہروش، پری اور دل وش آپ تینوں کے نام بہت پیارے ہیں۔ شازیہ طارق رب العزت سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کی بچیوں کو تندرستی دے۔

"چلو عہد کرتے ہیں" سمیرا حمید میں آپ کی جتنی بڑی فین ہوں نا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔

ج: پیاری نور! خدا کا خوف کریں یار آپ اتنی کم عمر خوب صورت ماڈل کو مرجھایا ہوا پھول کہہ رہی ہیں۔ تلک پھولوں سے بنا تھا تو بڑا تو ہونا ہی تھا۔ سمیرا حمید آپ کی ہی نہیں ہماری بھی پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ کاسۂ ذات قرۃ العین خرم ہاشمی کا ناول تھا، جبکہ افسانہ انعم نجف نے لکھا تھا۔

کراچی سے تسنیم کوثر نے لکھا ہے

دسمبر کا شعاع اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور دلکشی کے ساتھ ہمیشہ کی طرح کتنا میٹھا مزیدار لگا اور خاص طور پر "شعاع کے جھروکوں" میں شاہی دور کا باورچی خانہ نے خوب لطف دیا کیا کہنے اس پلاؤ کے جو منہ میں جا کر گھل جانے لگے۔ دوسری پلاؤ کی قسم کے بارے میں اتنا خوب صورت انداز گردش میں ایسا محسوس ہو جیسے ہیرے موتی بکھرے پڑے ہوں۔ اس کے علاوہ "شہزاد" کی تو کیا بات ہے اس کا تو نام ہی کافی ہے بیانیہ اگر ہمارا مشورہ تو ہے کہ آپ ہادی اور دُرشہوار کو ضرور ایک کر دیجیے۔ اور جناب فرزانہ کھرل نے بھی ہمیشہ کی طرح مشکل انداز میں ایک بہترین کہانی پھول منڈی کے نام سے رقم کی مگر اس کا اینڈ مشکل سے سمجھ میں آیا اور رخسانہ نگار عدنان کا ناول شام کی حویلی میں بھی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ بہت پسند آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ ممی ڈیڈی کے بھانجے راشدہ رفعت نے بہت خوب لکھا پڑھ کر مزا دوبالا ہو گیا۔ انعم نجف رضوی کا کاسۂ ذات بھی زبردست رہا۔ اس دفعہ افسانے بھی بہت باکمال رہے۔

ج: پیاری تسنیم! کاسۂ ذات قرۃ العین خرم ہاشمی کا ناول تھا اور عشق کسی کی ذات نہیں انعم نجف رضوی نے لکھا تھا۔ فہرست میں صحیح نام دیے گئے ہیں۔ ان کی تحریروں پر سہواً غلط نام لگ گئے۔

کتنا میٹھا مزے دار سا شعاع آپ کو پسند آیا۔ شعاع کی یہ تعریف بھی انوکھی ہے۔ شعاع کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ املی کی میٹھی چٹنی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

فرزانہ کھرل بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ہم ان سے کئی بار درخواست کر چکے ہیں، تھوڑا سا سہل انداز میں لکھیں۔ اب آپ کی فرمائش بھی ان تک پہنچا رہے ہیں۔

زاہدہ محمد خان نے شادیوال ضلع گجرات سے لکھا ہے

میں نے آپ سے بولنا تو نہیں تھا لیکن پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر بولنے لگ پڑی ہوں۔ کچھ دسمبر کو پچھلے نام رکشے پہ بیٹھ کر گجرات چلی گئی وہاں شاپ سے شعاع خریدا۔ دکان پر ہی سرورے اور آپ کے خط میں اپنا خط ڈھونڈنے لگی لیکن دسمبر کے شمارے میں دونوں ہی غا... تھے سرورے میں "ز۔م" کی بجائے "ک۔ناز" لکھا... تھا۔ پھر آپ خود سوچ لیں۔ میری اس وقت کیا کیفی... ہوئی ہوگی راستے میں کھلا کسی پہ کیوں دل کا معاملہ دیکھ... تب میرا دل خوش ہو گیا کہ چلو مجھے کسی سلسلے میں شامل تو... قابل توجہ جانا بہت شکریہ۔ اشعار اچھے تھے۔ اب آ... ہیں دسمبر کے شعاع کی طرف ماڈل مہندی کی مناسب... سے پیاری لگ رہی تھی پہلی شعاع میں آپ باتیں بہ... اچھی کرتی ہیں۔ سبحان اللہ حمد بہت اعلیٰ تھی "پیارے نبی... پیاری باتیں" بھی بہت اچھی تھیں۔ سبحان اللہ دستک... ماریہ واسطی سے مل کر اچھا لگا۔ "شہزاد" لاجواب... شام کی حویلی میں ناول میں بھی قسط اچھی ہوتی ہے... اتنی نہیں۔ نئی رائٹرز بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ "پھو... منڈی" میں کہانی اچھی تھی۔ اینڈ بھی اچھا تھا۔ لیکن فرز... گاڑھی ثقیل اردو استعمال کرتی ہیں۔ ہم جیسے پرانے زما... کے پڑھے ہوؤں کو ذرا مشکل پیش آتی ہے۔ کاسۂ ذا... مکمل ناول بہت پسند آیا ہے۔ اس دفعہ یار دلدار کی... بہت محسوس ہوئی۔ مولسری کے پھول ایک سبق آ... افسانہ تھا۔ بددعا تو ہرگز نہیں دینی چاہیے۔ "ہنگی ہے... ہے" بھی مزاحیہ تھا۔ عشق کسی کی ذات نہیں میں آخر... عشق کی جیت بتائی گئی ہے۔ سمجھ نہیں آ رہی۔ کوئی رائٹر... ہے کہ عشق کرنے سے خاندان والوں کی رسوائی ہو... ہے۔ کوئی کہتی ہے۔ عشق بہت پیاری چیز ہے۔ مجھے... سال ہو گئے ہیں نیند کی دوائی کھاتے ہوئے اگر دوائی... کھاؤں تو تین دن کے بعد مجھے بالکل نیند نہیں آتی... قدرتی نیند کو ترس گئی ہوں۔ دراصل جب میں 2003... میں بیمار ہوئی تھی۔ عینک پہننی بھی چھوڑ دی تھی۔ پھر... نے پانچ سالوں کے بعد عینک پہننی شروع کر دی۔ ا... لیے دماغ پر اثر پڑا۔ ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ دماغ خشک ہو... ہے میری جٹھانی کہتی ہے کہ تم پاگل ہو۔ مجھے شعاع پڑ... ہوئے پورے ڈھائی سال ہو گئے ہیں۔ جولائی 2016... کو پہلا شعاع لیا تھا۔ پہلے پہلے چار مہینے میں روٹیاں... پلاسٹک کی بوتلیں بیچ کر شعاع خریدتی تھی اس کے... شوہر نے شعاع کے لیے پیسے دینے شروع کر دیے ہیں

ج: پیاری زاہدہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے ہمیں اتنی محبت سے خط لکھا اور وہ شامل نہ ہو سکا۔ ہماری اتنی پیاری بہن کی دل شکنی ہوئی۔ آپ کے شوہر بہت اچھے ہیں کہ وہ آپ کو ہر ماہ شعاع کے لیے پیسے دیتے ہیں۔ عینک نہ لگانے کا نیند سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ یہ وہم دل سے نکال دیں۔ دماغ خشک ہونے والی بات بھی درست نہیں ہے۔ اکثر لوگوں کو نیند نہ آنے کی شکایت ہوتی ہے۔ یہ کوئی بیماری نہیں۔ نہ ہی نیند نہ آنے کا مطلب پاگل پن ہے۔ آپ جٹھانی کی باتوں پر ہرگز دھیان نہ دیں۔ آج کل نیند نہ آنے کی شکایت ایک عام مسئلہ ہے۔ اور بہت سے لوگ نیند کی دوائیں بھی لیتے ہیں۔ بس احتیاط یہ کرنا چاہیے کہ اور ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر کوئی دوا نہ لیں۔

اقراء الیاس نے مرید کے شیخوپورہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

کوثر خالد کا انداز بیان ایسا ہوتا ہے کہ گویا ہمارے سامنے بیٹھی پورے سیاق وسباق سمیت اپنی روداد سنا رہی ہوں کہ ان کی آواز تک بھی خوب صورت لگے۔ ''ممی ڈیڈی کے بھانجے'' راشدہ رفعت آپ نے تو کمال کر دیا۔ ہماری مسکراہٹ بتدریج بڑھتی رہی۔ ''کاسہ ذات'' قرۃ العین خرم ہاشمی! آپ نے ایک بڑی حقیقت کا پردہ چاک کیا۔ ''پھول منڈی'' فرزانہ کھرل کا آخری جملہ دل کو اداس کر گیا۔ مصباح کا کردار پاورفل تھا۔ رخسانہ عدنان نگار ہمیشہ کی طرح اچھا لکھ رہی ہیں اور افسانے سب کے سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے اور یہ کیا؟ فہرست میں اس افسانے کے ساتھ اُم نجف اور کاسہ ذات کے ساتھ قرۃ العین کا نام لکھا ہے۔

ج: پیاری اقراء! مکمل ناول کاسہ ذات قرۃ العین خرم ہاشمی کا تھا جبکہ افسانہ عشق کسی کی ذات نہیں اُم نجف رضوی نے لکھا۔ سہواً غلط نام لگ گئے۔ اس سہو کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ماہا بشیر حسین نے ڈنگہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

دونوں سلسلہ وار ناولز بالکل بور لگ رہے ہیں (مطلب مجھے پسند نہیں آ رہے) انٹرویوز میں تو بڑے لوگ آئے ہوئے تھے۔ سائرہ رضا صاحبہ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ بہت سخت مزاج لگتی ہیں۔ آخر میں ایک بات کہنی ہے کہ میمونہ خورشید علی کیوں نہیں لکھتی ہیں؟ پلیز ان سے کہیں کہ دوبارہ لکھنا شروع کر دیں۔

ج: پیاری ماہا! سائرہ اور سخت مزاج......؟؟؟

آپ نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ سخت مزاج ہیں۔ وہ جتنی نرم مزاج اور میٹھی طبیعت کی مالک ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔ پہلے بھی منکسر المزاج تھیں۔ اتنی کامیابیوں کے بعد اور حال ہی میں ''دل موم کا دیا'' کی کامیابی کے بعد ان میں مزید انکساری آ گئی ہے۔ آپ کو ان کی تحریروں سے یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی نرم دل اور حساس ہیں۔

یار دل دار ہمارے قارئین کا پسندیدہ سلسلہ ہے اور وہ سارے لوگ دوست صرف تحریر سے نہیں نہایت نرم اور حساس دل کے مالک ہیں۔ اور ہر دوست اپنی جگہ مکمل کردار ہے۔ کہانی میں ہر ماہ ایک نیا واقعہ ہوتا ہے۔ میمونہ خورشید لکھتی ہیں لیکن آج کل وہ چینل کے لیے لکھ رہی ہیں۔

سدرہ احسان نے مدوکے سے لکھا ہے

شادی والے گھر کی مصروفیات کا آپ کو پتا ہی ہے۔ تیرہ دن شادی کا ہوتے ہوتے 18 دسمبر ہو گیا۔ یعنی 17 دسمبر کی مہندی 18 کو ہماری دونوں بہنوں کی بارات آئے گی۔ 19 دسمبر کو بھائی کی جائے گی۔ بھائی کا نکاح کر دیا ہے 25 نومبر کو یہ نیک کام سر انجام پایا تھا۔ اب رخصتی باقی ہے۔

کوثر خالد کیسی ہیں آپ؟ میری پھوپھو بھی کوثر ہیں۔ میں ان کو آپ کے خط اکثر پڑھ کر سناتی ہیں۔ آپ کی ساس ہیں کہ وفات پا گئیں؟ میری پھوپھو کی ساس بھی 106 سال کی عمر میں 18 ستمبر کو وفات پائی۔ اللہ ان کو جنت نصیب کرے۔ 10 سال میری پھوپھو نے ان کی دل وجان سے خدمت کی۔ کچھ بزرگی، اوپر سے وہ گر گئی تھیں، ان کے کولہے متاثر ہوئے۔ جس کی وجہ سے وہ چل پھر نہ سکتی تھیں۔ پھوپھو ان کو ڈائپر لگاتی تھیں۔ ساری بہوئیں پہلے ہی ان سے علیحدہ ہو چکی تھیں۔ چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ان کی۔ جن میں سے میری پھوپھو اور ان کے میاں نے ان بے جی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ پھوپھو کا میکہ اور سسرال دونوں ہمارے گاؤں میں ہی ہیں۔ ہماری اور پھوپھو کی دیوار ایک ہی ہے۔ اب انہوں نے نیا گھر بنایا ہے تو ایک دروازہ ہماری طرف کھلتا ہے۔ پھوپھا جی کی جاب لاہور میں ہے۔ سول انجینئر ہیں۔ تو پھوپھو بچوں اور ساس سمیت لاہور شفٹ ہو گئی تھیں۔ گاؤں میں گھر اور زمین ہے تو آنا جانا لگا رہتا ہے۔ بے جی بہت کرخت اور زبان کی بہت ہی سخت تھیں۔ ان کی زبان کے جوہر دیکھ کر مجھے پھوپھو کی ہمت پر حیرت ہوتی۔ پھوپھو ذات کما کر بھی دل وجان سے ان کی خدمت کرتیں۔ روپے پیسے کی کمی نہیں۔ ہزاروں ملازمائیں رکھ کر دیں۔ اول تو ان کو کوئی پسند نہ آتی۔ پھر ملازمائیں بھی دوسرے دن ہی بھاگ جاتیں۔ زندگی کے آخری ایام تقریباً یہ پورا سال ہی رہیں۔ پھوپھو لاہور لے کر جاتی تو واویلا اونچا رونا شروع کر دیتیں کہ میں نے یہاں نہیں رہنا گاؤں لے کر چلو۔ پھر پھوپھا جی (ہم ان کو ماموں کہتے ہیں) اسی گاڑی میں بٹھا کے ساتھ پھوپھو کو بھی کر کے چلو، گاؤں لے چلو جہاں ماں جی خوش رہیں۔ پھر ساتھ پھوپھو کو بھی گھر بار وہاں بچے چھوڑ کر یہاں ہمارے پاس رہنا پڑتا۔ پھوپھو کی ساس ہماری دادی کی کزن ہیں۔ اس حساب سے وہ پھوپھو کی خالہ بھی لگتی تھیں اور میرے دادا کی بھی کزن تھیں۔ تو جب گاؤں آتے کھانا پینا ہمارے ہی گھر میں ہوتا تھا۔ ہم پکا کر دیتے۔ اور پھوپھو دادی کی خدمت پر مامور تھیں۔

کبھی کبھی پھوپھو کو اتنا تنگ کرتی تھیں کہ پھوپھو ابھی ڈائپر تبدیل کرتیں، وہ دوبارہ فوراً خراب کر دیتی تھیں۔ پھوپھو نے ابھی ہاتھ دھوئے بھی ہوتے اور ان کو پھر چینج کروا کر ساتھ بستر بھی سارا دھو کر بے جی کو روزانہ گرم پانی کر کے نہلانا۔ پھر آدھی رات کو بھی کوئی کھانے کی چیز مانگی، وہ فوراً پکا کر دینا۔ بے جی کی عادت بچوں جیسی تھی۔ مثلاً ابھی چاول پکائے ہیں ان کی منتیں کر لیں کہ کھا لیں تھوڑے سے کھا لیں۔ ایک ہی ضد نہیں کھانے۔ جب وہ تھوڑی دیر میں ختم ہو جائیں پھر مانگیں گی۔ پھر ہمیں آہستہ آہستہ تجربہ ہو گیا تھا۔ جو چیز پکائی ہے ان کے لیے علیحدہ سے رکھ دیتی ہے۔ پھر ان کے کمرے میں دن میں دو تین بار بھی، مچھر مار اسپرے اور فریشنر فلاور کا اسپرے کرتا کہ اسمیل نہ آئے۔

کوثر آنٹی یقین کیجیے ہمارے گاؤں کے بندے بندے کی زبان پر ہماری پھوپھو کے لیے تعریفیں اور دعائیں ہیں۔ پھوپھو جب بھی ساس ماں کی باتوں سے پریشان ہو کر ابو سے دل کا بوجھ ہلکا کرتیں تو میری دادو اور ابو دونوں ہی پھوپھو کو صبر کرنے کا کہتے۔ ساتھ پھوپھو کہتیں میں دعا کرتی ہوں کہ اتنی سخت ساس اللہ میری بھتیجیوں کو نہ دے۔ پھوپھو ابو سے بڑی ہیں۔ یہ والی جن کی بات کر رہی ہوں۔ ان کے چار بچے تھے۔ دو بیٹیاں دو بیٹے۔ بیٹیاں دونوں اپنے گھروں میں یعنی شادی شدہ ہیں۔ ایک چنیوٹ ہوتی ہے اور دوسری فیصل آباد چک جھمرہ میں۔ بڑے بھائی مدثر کی شادی کی تھی۔ ایک بیٹی ہے ان کی۔ تو ان کی ڈیتھ ہو چکی ہے کار ایکسیڈنٹ میں۔ اب اسی بھابھی کا نکاح چھوٹے بھائی مزمل سے کیا ہے۔ اب ماشاء اللہ ان کا بیٹا بھی ہے سات ماہ کا۔ بھائی ابھی پڑھتے ہیں۔ اتنا ہی کافی یا کچھ اور لکھوں پھوپھو کے بارے میں۔ یہ اسپیشل میں نے کوثر خالد آنٹی کے لیے لکھا ہے۔

ج: پیاری سدرہ! آپ نے بہت طویل خط لکھا، ہم نے شادی کے بارے میں جو تفصیل آپ نے لکھی تھی وہ شائع نہیں کی ہے۔ اس کے لیے آپ دوبارہ ہمیں خط لکھنے کی زحمت کریں اور ہمیں علیحدہ شادی کا احوال بھی لکھ بھیجیں۔ آپ کی پھوپھو واقعی بہت عظیم ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی دس سال معذور ساس کی خدمت کی نذر کر دیے۔ درحقیقت ان کا کردار خواتین کے لیے ہی نہیں انسانیت کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔ (مولانا صاحب مشعل راہ خواتین ایسی ہوتی ہیں) نہ کہ وہ آپ مشعل کہتے ہیں۔ خط کا یہ حصہ ہم نے اسی لیے شائع کیا ہے کہ یہ بہت سی ایسی خواتین کی ہمت بندھائے گا جو اسی قسم کے حالات سے گزر رہی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایسی خواتین کی کمی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی پھوپھو کو جزائے خیر دے۔ آمین

سدرہ! آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے کہانیاں لکھنے پر

توجہ دیں۔ کامیاب ہوں گی۔ ان شاءاللہ

کر رہی ہیں، لکھا ہے

خط کو دیکھنے کا اتنا اشتیاق تھا کہ دکان پر ہی دیکھ لیا۔ ہم بی۔ اے کی طالبات ہیں۔ ہم نے کالج کے گراؤنڈ میں بیٹھ کر مذاق میں ہی خط لکھ دیا۔ اب ہم ساری فورتھ ایئرز کو اپنا خط دکھاتے پھر رہے ہیں۔ "شہزادو" واو اپنی دھما کے دار قسط مزہ ہی آ گیا۔ ذوالکفل کا بیٹا 80 پرسنٹ ارتضیٰ 10 پرسنٹ باذل اور 10 پرسنٹ حمزہ ہے۔ دیکھتے ہیں ہمارا انکا تیجہ نکلتا ہے۔ پھول منڈی اچھا رہا۔ شاہین رشید سے ریکوسٹ ہے کہ وہ سہیل احمد عرف (عزیزی) کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

ج: بقیہ، رخیہ اسماریہ ایک بار پھر آپ کا خط شامل ہے۔ اب آپ فورتھ ایئرز کو جا کر دکھائیں اور اپنی پروفیسرز کو بھی۔ آپ کے اندازے کتنے درست ہیں۔ اس کے لیے صرف ایک ماہ انتظار کرنا ہے کیونکہ آئندہ ماہ آخری قسط ہوگی۔

ونڈالہ دیال شاہ گوجرانوالہ سے سنبل ملک اعوان نے محفل کو رونق بخشی ہے، لکھتی ہیں

مستقل تبصرہ نگار آنٹی کوثر خالد کے مزیدار خط بہت اچھے لگتے ہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں شعاع میں ارم احمد کا تعارف شائع کیا ہے۔ "ناتا تجھ سے جوڑا" میں ارم نے بتایا کہ اس کے پاس اس کی ساس کی جمع شدہ رقم صدقات میں دینا چاہتی ہیں۔ ہم بے سہارا خواتین اور بھٹکی ہوئی عورتوں کے لیے چھت فراہم کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ لڑکیاں ہیں جو چھ بہنیں اور آٹھ بہنیں ہیں اور باپ کے بغیر ان کی شادی کے لیے کپڑے۔ برتن، اسلامی، بیڈ شیٹ، ڈنر سیٹ کچھ بھی صدقہ کرنا چاہو تو پلیز قدم بڑھاؤ۔ میرا کام اپیل کرنا ہے۔ باقی جس، جس کا دل کرے اللہ سے تجارت کرنے کو تو خوش آمدید۔

ج: پیاری سنبل! اتنے عرصے کے بعد آپ محفل میں تشریف لائیں، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کے خط ہمیں موصول نہیں ہوئے ورنہ ہم جواب ضرور دیتے۔ ہاں کافی ماہ پہلے آپ کے خط باقاعدگی سے ملتے تھے اور ہم باقاعدگی سے شائع بھی کرتے تھے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ آپ کے خط کو جواب نہ دیا ہو۔ آپ کا فون نمبر ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اگر کسی نے مدد کے لیے کانٹیکٹ کیا تو ہم اسے نمبر دے دیں گے۔

ننکانہ صاحب نور جہانیاں سے شریک محفل ہیں، لکھتا ہے

نئے سال کی آمد آمد ہے۔

اک اور اینٹ گر گئی دیوار حیات سے

نادان کہہ رہا ہے نیا سال مبارک

شبنا بیگم کا میر حاکم علی کے خاندان سے جو بھی تعلق ہے، وہ جلدی سے منظر عام پر لے آئیں۔

اور ہاں --- میں نے اپنے اندر کے ایک اور ٹیلنٹ کو ڈھونڈ نکالا۔ پورے گھر کی اس بے وقوف اور بے عقل لڑکی نے حمد لکھنے کی جرأت کر ڈالی۔ آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔

اگر شائع ہو گئی تو میرے بھائی نے یوں حیران ہونا ہے جیسے کوئی مرغی بیٹر کو پاپ لگانے میں کامیاب ہو گیا ہو۔

ج: پیاری انب! آپ نے جو ٹیلنٹ اپنے اندر ڈھونڈ نکالا ہے، ہمیں بھی آپ کا ٹیلنٹ متاثر کر گیا ہے۔ حمد شامل ہے اور آپ اپنے بھائی کو حیران کر سکیں گی۔

شعاع کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ صائمہ اکرم تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

آپ جانتی ہیں

واصفہ سہیل

ترجیح

فاطمہ بھٹو نے سیاست کے بجائے ناول نگاری کو ترجیح دی ہے۔ اور اس میدان میں ان کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ خواتین میں ان کے ناولز خاص طور پر پسند کیے جا رہے ہیں۔ (انگریزی میں ہونے کے باوجود) ویسے تو مرد حضرات بھی ان کے فینز ہیں۔ لیکن خواتین مداحوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ان کے پہلے ناول کے اہم کردار تین بھائی تھے لیکن فاطمہ بھٹو کے بیان کرنے کا انداز اور ناول کے بہترین منکا لے عورت کے گرد ہی گھومتے تھے۔ جیسے فاطمہ اپنے کرداروں میں خواتین سے ہی بات چیت کر رہی ہوں۔

ان کا دوسرا ناول جس کا بنیادی خیال دو مردوں کے درمیان مراسم کے گرد گھومتا ہے لیکن اس میں اصل جان ایک لڑکی کے کردار نے پیدا کی ہے جو ایک

پرکشش اور آندھی طوفان کی مانند آگے بڑھنے والی شخصیت ہے۔ فاطمہ بھٹو کے نظریات کے مطابق لکھنے والے کو اپنی تحریر میں سوالات اٹھانے کے ساتھ ساتھ اس سے نکلنے اور بچنے کے راستے بھی دکھانے چاہئیں۔

تشدد

ایک زمانہ تھا کہ ڈراموں کی شوٹنگ صرف پی ٹی وی کے مخصوص اسٹوڈیوز میں ہوتی تھیں اس وقت فنکاروں کی چھوٹی سے چھوٹی بات ان کے چاہنے والوں تک پہنچ جاتی تھی۔ لیکن جب سے پرائیویٹ پروڈکشن کے تحت مختلف لوکیشنز پر شوٹنگ ہونے لگی ہے تو فنکاروں کی خبریں بھی بہت حد تک پہنچنا بند ہو گئی ہیں۔

گزشتہ دنوں خبر آئی تھی کہ گھر کا کرایہ نہ ادا کرنے پر کومل عزیز کو مالک مکان نے گھر سے نکال دیا اور ان کے اہل خانہ پہ تشدد بھی کیا۔ تاہم کومل نے

ان خبروں کو جھوٹا قرار دیتے ہوئے کہا کہ ”اگرچہ مکان انہوں نے کرائے پر ہی حاصل کیا تھا تاہم ریئل اسٹیٹ ایجنٹ نے ان کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور وہ ان سے ایڈوانس کے لاکھوں روپے لے کر فرار ہو گیا۔ پھر وہ انہیں وقتاً فوقتاً مینٹیننس سمیت دیگر اخراجات کے لیے پیسے بٹورنے کے لیے بلیک میل کرتا رہا۔ (پر بلیک میل کیوں کرتا رہا؟)

خوشی

عاطف اسلم کو میڈیا پر کم ہی دیکھا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے گانوں اور موسیقی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر چھائے رہتے ہیں تاہم وہ میڈیا کو انٹرویوز وغیرہ کم ہی دیتے نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت بالآخر عاطف اسلم نے خود ہی اپنے ایک انٹرویو میں کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں میڈیا کے سامنے آنا اور اپنی تشہیر کرنا اچھا نہیں لگتا۔ نہ ہی وہ اپنے حوالے سے ہونے والی چہ مگوئیوں پر صفائی دینے کے عادی ہیں۔

عاطف اسلم نے جس وقت میوزیکل بینڈ ”جل“ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا تھا تو میڈیا نے ان کے خلاف بہت کچھ لکھا اور یہاں تک کہ یہ بھی لکھا کہ جل بینڈ ان کی وجہ سے ختم ہوا ہے۔ (تو کیا نہیں ہوا......؟)

عاطف اسلم کے مطابق انہیں سب سے زیادہ خوشی اس وقت ہوئی جب عابدہ پروین نے انہیں بلا کر کہا کہ وہ ان کے ساتھ پرفارم کرنا چاہتی ہیں۔ عاطف اسلم کا کہنا ہے کہ وہ اس خوشی کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے جب عابدہ پروین نے ان کے ساتھ گانا گانے کے لیے کہا۔

خوف

سنا ہے کہ فلم اور ٹی وی کے مشہور اداکار بابر علی بیرون ملک چلے گئے ہیں (اس میں کیا انوکھی بات ہے بھئی اکثر لوگ باہر جاتے ہی رہتے ہیں) پولیس (پولیس......؟) کے مطابق بابر علی نے نامعلوم افراد کی جانب سے دھمکی آمیز کالز موصول ہونے کی تحریری شکایت درج کرائی تھی۔ بابر علی نے نجی ٹی وی چینل کے ایک ڈرامہ سیریل میں کام کیا تھا۔ جس کے بعد انہیں نامعلوم افراد کی طرف سے سوشل میڈیا پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ (کہیں یہ شہرت حاصل کرنے کا طریقہ تو نہیں......؟) بابر علی کا کہنا ہے کہ

ادھورا سچ

جسٹس رستم کیانی کی ادھوری تقریر کی آخری سطریں اس قابل ہیں کہ انہیں دہرایا جائے...... لکھا تھا: ”اگر مجھے اپنے ضمیر کی روشنی میں بات کہنے سے پہلے یہ سوچنا پڑے کہ اس سے میری ذات اور اہل خانہ کو کیا خطرات لاحق ہوں گے تو میں ایسے ملک میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ چونکہ حالات واقعتاً ایسے ہی تھے جسٹس رستم کیانی نے رخت سفر باندھ لیا۔“ (وجاہت مسعود۔ ہم سب)

ریاست کو بچے کم کرنے کے لیے ایجنڈا اپنانے کا حق نہیں ہے۔ ایک بندہ انفرادی طور پر تو اپنے بچوں کی تعداد کے حوالے سے فیصلہ کر سکتا ہے۔ مجھے مولانا طارق جمیل کو آبادی کے حوالے سے سمپوزیم میں دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کو چیلنج کیا ہے۔ (اوریا مقبول جان)

☆ وزیراعظم نے ایک بہت اچھی تقریر کی۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ آج حکومت، فوج، سیاسی رہنما اور باقی سارے ادارے ایک صفحے پر ہیں تو ممکن ہے کہ آپ کو سابق وزیراعظم نواز شریف یاد آئے ہوں۔ وہ بھی ہندوستان سے اچھے تعلقات اور خاص طور پر تجارت کے خواہاں تھے۔ جب ان پر یہ الزام تھا کہ وہ ”مودی کے یار“ ہیں۔

(غازی صلاح الدین۔ راستے اور منزلیں، قربتیں اور فاصلے)





آگ کا عذاب

بھارت کے مشہور شہر لکھنؤ میں ایک نیک دل ہندو رہتا تھا۔ اس کے نیک دل اور شریف ہونے کی ایک نشانی یہ بھی کہ وہ اپنی قوم کے دوسرے لوگوں کی طرح مسلمانوں کا دشمن نہ تھا۔

اس ہندو کا بہت بڑا چھاپہ خانہ تھا، جس میں وہ کتابیں چھاپتا تھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ زیادہ تر کتابیں ایسی چھاپتا تھا جن کا تعلق مسلمانوں اور دین اسلام سے تھا۔

لکھنؤ کا یہ ہندو تاجر اپنی کتابیں پورے ملک میں فروخت کرتا اور خوب نفع کماتا۔ ویسے اس کی کتابیں مسلمان خریدتے تھے۔

مسلمانوں کی دینی کتابیں چھاپنے اور فروخت کرنے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ہندو تاجر کی تجارتی سمجھ بوجھ تھی۔ جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ مسلمان یہ کتابیں لازمی طور پر خریدیں گے تو اس نے ان کی کتابیں چھاپنی شروع کر دیں، لیکن یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے یہ کتابیں صرف کاروبار کے لیے شائع نہ کیں، بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے دل میں ان کتابوں کی عزت تھی۔

یہ بات اس لیے ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ جب یہ کتابیں چھاپی جاتی تھیں تو وہ ان لوگوں کے لباس اور جسم کو پاک رکھنے کا خاص انتظام کرتا تھا جو اس کے چھاپے خانے میں کام کرتے تھے۔ چھپائی وغیرہ کا کام مسلمان کرتے تھے اور ان کے لیے ضروری تھا کہ کام شروع کرنے سے پہلے باقاعدہ وضو کریں۔

اس زمانے میں چھاپے خانے کی مشینیں بالکل سادہ تھیں اور کتابت کا طریقہ بھی بالکل سادہ ہی تھا۔ پہلے ایک خاص کاغذ پر خاص قسم کی روشنائی سے کتابت کی جاتی تھی اور پھر ان کاغذوں کو پتھر کی سلوں پر جما کر ان کا عکس لے لیا جاتا تھا۔

جب کوئی چیز چھپ جاتی تو پتھر کی سلوں کو دھو کر لفظ مٹا دیے جاتے تھے اور ان سلوں پر نئے کاغذ جما کر نئی چیزیں چھاپی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں اس نیک دل ہندو نے یہ انتظام کیا تھا کہ قرآن مجید اور دوسری دینی کتابوں کی چھپائی کی نگرانی کے لیے اونچے درجے کے مسلمان عالم مقرر کیے تھے۔

جب کتابت کا کام مکمل ہو جاتا تو یہ عالم اسے بہت غور سے پڑھتے تھے۔ کوئی غلطی نظر آتی تو اسے ٹھیک کراتے اور جب اطمینان ہو جاتا کہ ہر صفحے کی عبارت بالکل ٹھیک ہے تو یہ لکھ کر اپنے دستخط کر دیتے تھے کہ ”کتابت بالکل ٹھیک ہے، کتاب چھاپ دی جائے۔“ کسی بڑے عالم کے دستخطوں کے بغیر کوئی دینی کتاب نہ چھاپی جاتی تھی۔

اس بہت ضروری اور خاص کام کے لیے جو عالم مقرر کیے گئے تھے، ان میں ایک مولوی سید جعفر علی بھی تھے۔ کچھ دن پہلے ہماری ملاقات ان کے نواسے سے ہوئی تو انہوں نے لکھنؤ کے اس ہندو تاجر کتب کے بارے میں ایک ایسی بات سنائی کہ جسے ہم قرآن مجید، فرقان حمید کا معجزہ اور اس ہندو کی نیک دلی کا انعام کہہ سکتے ہیں۔

انہوں نے بیان کیا کہ ”میں نے اپنے نانا جان سے سنا کہ جب اس ہندو تاجر کا انتقال ہوا تو اس کے مذہب کے مطابق اس کی چتا تیار کی گئی۔

جب اس ہندو تاجر کی چتا تیار ہو گئی اور اس کی لاش کو اس پر رکھ دیا گیا تو اس کا بڑا بیٹا چتا کو آگ لگانے کے لیے آگے بڑھا اور قاعدے کے مطابق آگ لگائی۔ لکڑی بھی اسی طرح فوراً آگ پکڑ لیتی ہے جس طرح تیل۔ چتا دھڑا دھڑ جلنے لگتی ہے اور لکڑیوں کے ساتھ لاش بھی جل کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ لیکن جب اس ہندو کی چتا کو آگ لگائی تو کئی بار کوشش کے باوجود لکڑیوں نے آگ نہ پکڑی۔ لاش جلنے سے بالکل محفوظ رہی۔

یہ ایک نرالا واقعہ تھا جو سب نے دیکھا۔ لوگ حیران تھے کہ لکڑیاں جلتی کیوں نہیں۔ جب سب اپنی سی کوشش کر کے تھک گئے تو پنڈتوں نے فیصلہ کیا کہ لاش کو دریائے گومتی میں بہا دیا جائے چنانچہ ایسے ہی کیا گیا اور اس نیک دل ہندو کی لاش آگ کے عذاب سے بچ گئی۔“

اس وقت جو لوگ وہاں موجود تھے، انہوں نے تو معلوم نہیں کیا سمجھا ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ مرتبہ اور عزت قرآن مجید کی برکت کی وجہ سے ملی تھی۔ اس ہندو کا نام منشی نول کشور (نَوَل کِشور) ہے۔ یعنی خوب صورت لڑکا تھا۔ معلوم نہیں اب اس کا قائم کیا ہوا کتب خانہ موجود ہے یا نہیں اور اس کے وارثوں میں بھی کوئی ایسا ہے یا نہیں جو قرآن مجید اور مسلمانوں کی دینی کتابیں چھاپے اور ان کا ادب کرتا ہو لیکن 1947ء تک ہندوستان میں سب سے بڑا کتب خانہ اور چھاپہ خانہ اسی کا تھا اور اس کا نام بہت عزت سے لیا جاتا تھا۔

ایک عجیب وغریب خلیفہ

فاطمی حکومت کا چھٹا حکمران علی حسین تھا جس نے حاکم بامراللہ کا لقب اختیار کیا۔ جب اس نے 386 ہجری میں خلافت کا عہدہ سنبھالا تو اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ شروع میں اس کی کم عمری کی وجہ سے فاطمی خلافت کو کافی نقصان اٹھانا پڑا مگر جوانی کی عمر تک پہنچنے کے بعد اس نے اپنے وزیر برجوان ترکی کو (جو اس کے اقتدار کے لیے خطرہ بنتا جا رہا تھا) قتل کروا دیا اور حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی جس کے بعد اس نے کچھ احکامات نافذ کیے جن میں سے بعض بہت عجیب وغریب تھے۔ وہ احکامات کچھ یوں تھے۔

(1) خطبہ میں اس کے نام کے ساتھ تعریفی کلمات نہ کہے جائیں۔ اس حکم کی خلاف ورزی پر قتل کی سزا مقرر کی گئی۔

(2) دربار شب میں منعقد کیا جائے اور تمام لوگ کاروبار رات میں کریں۔ اس حکم کی وجہ سے رات گویا دن میں بدل گئی۔

(3) بعض ترکاریوں کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا اور خرید وفروخت یا کھانے پر سزا مقرر کی گئی۔

(4) بعض قسم کی مچھلیاں حرام کی گئیں۔

(5) لوگ اس کے سامنے سجدہ ریز نہ ہوں۔

(6) شراب نوشی کو سختی سے روکا گیا۔ انگور کی ہزاروں بیلیں کاٹ دی گئیں۔ شہد کے ہزاروں مٹکے نہروں کی نذر ہو گئے۔ ایسے مشروبات بھی ممنوع قرار دیے گئے جن میں کچھ نشہ ہو۔

(7) شطرنج کھیلنے پر پابندی اور اس کے تمام مہرے جلا دیے جائیں۔

(8) عورتوں کے گھر سے نکلنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ موچیوں کو ہدایت کی گئی کہ ان کے جوتے نہ بنائیں تاکہ یہ باہر نہ نکلیں۔

(9) رقص وسرود کی محفلوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا۔

(10) ہر جگہ سے تصویریں مٹا دی گئیں۔

ان احکامات پر دس سال تک عمل کیا گیا پھر اس نے اکثر احکامات واپس لے لیے۔ اس کے دور میں اہل کتاب پر بھی دس سال تک سختی ہوئی۔ اس کے تحت احکامات مسلمانوں پر بھی نافذ کیے گئے۔ مثال کے طور پر چند احکامات درج ہیں۔

(1) نماز تراویح پڑھنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔

(2) عیدالاضحی کی نماز ختم کر دی گئی۔

(3) لوگوں کو اسماعیلی مذہب قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔

(4) ماہ رمضان کے روزوں کی ابتدا رویت ہلال سے کرنے کے بجائے حساب سے روزے شروع اور ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔

(5) اذان میں الصلوٰۃ خیر من النوم کے بجائے حی علی خیر العمل کے اعلان کا حکم دیا گیا۔

ان سخت احکام کا نتیجہ عام بغاوت کی صورت میں نکلا اور دو سال بعد ہی حاکم کو قابل اعتراض احکام منسوخ کرنے پڑے۔

حاکم کے عجیب احکامات کے باوجود اس کا دور کارناموں سے بھی خالی نہ تھا۔ تاریخ دان مقریزی کے مطابق "حاکم مال میں سخی اور قتل وغارت میں بڑا خوں ریز تھا۔ اس کی سیرت عجیب ترین سیرت ہے۔"

حاکم اکثر گدھے پر سوار ہو کر جبل مقطم کی طرف گھوما کرتا تھا۔ ایک رات واپس نہ لوٹا۔ تلاش کرنے پر جبل مقطم کے قریب گدھا مردہ حالت میں ملا۔ مزید تلاش کے بعد حلوان کے مشرقی جانب غار تک پہنچے، جہاں سے خنجر کے نشانات والی حاکم کی قمیص ملی جس سے ظاہر ہوا کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ اس طرح 411 ہجری میں اس کا دور حکومت اختتام کو پہنچا۔

(امتیاز پراچہ کی تصنیف "خلافت بنو عباس وفاطمین مصر" سے انتخاب)

☆

بقیہ سروے

سے پہلے مہمان تو وہ ہوں گے۔

نہ تو کوئی بھائی خرچا دیتا ہے نہ والد صاحب بلکہ میرے لیے کوئی رشتہ آ بھی جائے تو میری غیبت ہی کرتے ہیں۔ میرے باپ اور بھائی عیب جوئی کریں گے تو رشتہ کیسے ہوگا؟ میری قسمت کا لکھا میرا نصیب کدھر ہے؟ میری والدہ میرے لیے رشتے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی ہیں۔ پتا نہیں لوگوں کو بھی کیا چاہیے لڑکی میں۔ قد بھی ٹھیک ہے گھر بھی ساڑھے پانچ مرلے کا اپنا ہے۔ گورنمنٹ جاب ہے سال اسکیل ہے ریگولر جاب ہے۔ سیلری بھی ٹھیک ہے اور ایم اے، بی ایڈ ہوں۔ پھر بھی پتا نہیں۔ نہ کوئی اچھے رشتے دار اور نہ ہی کوئی دوست ہمدرد اور ساتھی ہے۔ ایک ماں ہی ماں کا رشتہ ہے جو خالص ہے مگر باپ بھی کچھ نہیں رکھتا ہے۔ بھائی دو علیحدہ تیسرا الزام تراشی کرتا ہے۔ 2018ء سب رشتوں کو لے گیا۔

ہاں شیلٹر ہوم شروع کیا ہے۔ بیواؤں کے لیے جو لڑکیاں محبت کے پیچھے گھر چھوڑ کر خوار ہوتی ہیں ان کے لیے جن کے گھر والے جھگڑ کر گھر سے نکال دیتے ہیں ان کے لیے۔ میرا شیلٹر ہوم گو کہ ابھی تعمیر کے مراحل میں ہے۔ مگر وہ دھوپ سے، زمانے کی گرمی سے بچائے گا، ان شاء اللہ۔ سنبل نے خون کے رشتوں کو کھویا 2018ء میں۔ سنبل نے شیلٹر ہوم کا بیڑا اٹھایا۔ اللہ سے قریب ہوتی ہے سنبل۔

خوشی کی بات، خوشی کی بات 2018ء میں میری ماں کے چیک اپ میں ٹیسٹ کلیئر آئے۔ الحمدللہ۔

انیلا طالب .... گوجرانوالہ

اس سال نے مجھے بہت سی کامیابیاں عطا کیں مثلاً سال کے پہلے مہینے کی اکتیس تاریخ کو ماہنامہ پھول کی طرف سے اول آنے پر پیسوں اور بہترین کتاب کا تحفہ۔ فروری میں قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کے سی ای او جناب پروفیسر قاسم علی شاہ سے بات چیت کا موقع ملا۔ اسی مہینے میں میری تفصیلی بات قلم کی روشنی کی بانی محترمہ رفعت خان کی والدہ سے ہوئی جن سے رفعت آپی کے انتقال کا پتا چلا۔

اگست میں میرا مکمل ناول خشی زادہ چھپا۔ شعاع کی جانب سے معاوضہ دینے کی کال بھی موصول ہوئی۔ آزادی کے اس ماہ میں علامہ اقبال کے نواسے قابل احترام شخص منصور ... اور وہ شیخ پروگرام کے میزبان میر رانجھا قلم کے پروڈیوسر میاں یوسف صلاح الدین کی نرم شائستہ گفتگو سننے کی سعادت ملی۔ البتہ اس سال میری بڑی ممانی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ اللہ انہیں جنت میں جگہ دے۔ بہت خوشیاں بھی ملیں اور کچھ غم بھی دے کر یہ سال چلا گیا۔

کیسا گزرا؟

بطور رائٹر تو یہ سال مجموعی طور پر کامیابیوں کا سال رہا۔ میں نے ناکامیوں کو منہ توڑ جواب دیا اور ہائیکو جیسی مشکل صنف سخن کی آزاد شاعری کی صاحب کتاب ہوئی۔

گئے سال کی کوئی تحریر؟

اس سال میری ڈائری میں ان ایک سو منتخب کتابوں کی فہرست موجود ہے جو میں نے اس سال پڑھیں۔ جن کتابوں نے متاثر کیا ان میں ڈاکٹر ہیوگو کا کبڑا عاشق، میر الوقی کے ناول کا حسن کی دیوی کے نام سے ترجمہ، جھوٹے روپ کے درشن، ایک نئی سندریلا، مشفق الظفر، من کی دنیا، ہمزاد، داؤ کہ اور علیف شفیق کا ناول، داقوری روڈز آف لو شامل ہیں۔ جرمن لوک کہانیاں، جاپانی ترکی سفرنامے بھی پسندیدہ رہے۔

کوئی بات جو یادگار رہی؟

اپنے استاد سے ملنے والی دعائیں یادگار ہیں میرے لیے۔ ایک بار جب میڈیسن لینے گئی تو جس طرح ساتھ ہی صوفے پر بیٹھی خاتون نے میرے رائٹر ہونے پر خوشی کا اظہار کیا وہ کبھی نہیں بھول سکی۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... صائمہ انصار
میک اپ ـــ روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی ـــــ موسیٰ رضا



اکثر خواتین کو سر میں خشکی کی شکایت رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو کبھی کبھی باعث شرمندگی بھی بن جاتا ہے۔ جب کہ خشکی کی وجہ سے ہونے والی خارش آپ کے اعتماد کو متزلزل کرتی ہے۔ خشکی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مارکیٹ میں مختلف برانڈز کی مہنگی پروڈکٹس دستیاب ہیں جن کے بنانے والے سر سے خشکی کا مکمل خاتمہ کرنے کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر ان کا حاصل وصول کچھ نہیں ہوتا بلکہ ان پروڈکٹس میں شامل کیمیکلز بالوں کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں جن کی وجہ سے بال نہ صرف کمزور ہو جاتے ہیں بلکہ بے جان بھی نظر آتے ہیں۔ مہنگی پروڈکٹس سے چھٹکارا حاصل کیجیے اور گھریلو اور سادہ نسخوں سے خشکی کا خاتمہ کیجیے۔

دہی

خشکی کے خاتمے کے لیے دہی بہترین ہے۔ پرانے وقتوں میں خواتین خشکی کے خاتمے کے لیے دہی استعمال کرتی تھیں۔ یہ ٹوٹکا آج بھی اتنا ہی کارگر ہے، جتنا پچھلے زمانے میں تھا۔ دہی کو سر کی جڑوں میں لگانے سے نہ صرف خشکی کا خاتمہ ہوگا بلکہ بالوں کی نشوونما بھی تیز ہوگی۔

نیم کے پتے

قدرت نے نیم میں بیش بہا فوائد چھپا رکھے ہیں۔ نیم نہ صرف بہترین جراثیم کش ہے بلکہ بیکٹیریا ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نیم کا استعمال خشکی کا خاتمہ کرتا ہے جب کہ خشکی کے باعث پیدا ہونے والی خارش بھی ختم کرنے میں معاون ہے۔ ماہرین کہتے ہیں نیم کے چند پتے لے کر انہیں پیس لیں اور اسے بالوں کی جڑوں پر لگائیں اور پھر اپنا سر سادہ پانی سے دھولیں۔ یقیناً یہ خشکی کی شکایت دور کرے گا۔

ٹی ٹری آئل

ٹی ٹری آئل بالوں کی خشکی کے ساتھ ایکنی کے لیے بھی بہت فائدہ مند ہے۔ یہ تیل جلد کو صاف کرتا ہے اور فنگس سے بچاتا ہے۔ ٹی ٹری آئل کو کسی بھی تیل کے ساتھ ملا کر لگائیں، تھوڑی دیر بعد بال دھولیں۔ یہ یقیناً خشکی سے نجات دلاتا ہے۔

خوب صورت دکھنا ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے، جب کہ پرسنالٹی کو شاندار بنانے کے لیے بال ایک اہم جز ہیں اور بالوں کی خوب صورتی برقرار رکھنا ایسا ہے جیسے کسی نازک سے ڈیکوریشن پیس کی حفاظت کرنا۔

اسی طرح بال دھونے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو ان کو دھونے سے بال مضبوط اور خوب صورت ہونے کے بجائے مزید خراب نظر آنے لگتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق تیز گرم پانی سے بالوں کو دھونا انتہائی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر آپ اپنے بالوں کو دھونے کے لیے گرم پانی کا استعمال کرتی ہیں تو ایسا کرنا بالوں کی صحت اور نشوونما کے لیے نہایت مضر ہے۔ زیادہ گرم پانی سے بال دھونے سے سر کی جلد اور بال خشک ہو جاتے ہیں جو بالوں کی خوب صورتی کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی طرح شیمپو لگانے سے قبل بالوں کو پہلے اچھی طرح پانی سے دھولیں۔ خشک بالوں پر کبھی شیمپو نہ لگائیں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ شیمپو سے قبل بال اچھی طرح سے بھیگ جائیں۔ اس عمل سے شیمپو اور کنڈیشنر سے بہترین نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اس کے ساتھ بہت زیادہ شیمپو لگا کر بالوں کو دھونا یا روزانہ شیمپو کا استعمال بھی بالوں کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔ جتنا کم شیمپو کا استعمال کریں گے، آپ کے بال اتنے ہی خوب صورت نظر آئیں گے۔ جب کہ بالوں میں شیمپو کرتے وقت ہلکے ہاتھ سے سر کا دائرے کی شکل میں مساج بھی کریں۔ اس عمل کو اپنے ماتھے سے شروع کر کے گردن تک کرتے رہیں، ایسا کرنے سے نہ صرف آپ کے بال صاف ہوں گے بلکہ آپ کی خون کی گردش کو تیز کرنے میں بھی معاون ثابت ہوگا۔ اس کے ساتھ شیمپو کے بعد بالوں میں کنڈیشنر ضرور لگائیں کیونکہ صرف شیمپو کو استعمال کرنے سے بالوں کی جڑیں خشک ہو جاتی ہیں جو ان کی کمزوری کا باعث بنتی ہیں۔ کنڈیشنر کا استعمال بالوں کو ٹوٹنے سے کافی حد تک محفوظ رکھتا ہے۔

☆